زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۳ | بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول نمبر۲

مارکس اور مذہب اشتراک

مارکس کی تعلیم کے نہایت ضروری مسائل تین کہے جا سکتے ہیں:- (۱) وہ جسے تاریخ کی مادی تشریح کہتے، (۲) اجتماع سرمایہ کا قانون؛ (۳) معاشی طبقوں کی جنگ۔

۱۔ تاریخ کی مادی تشریح: مارکس کا خیال ہے کہ جماعت انسانی کے تقریباً تمام مظاہر کی اصل مادی حالات میں ہے اور یہ حالات اس کے نزدیک نظامہائے معاشی میں متشکل ہوتے ہیں۔ دستور سیاسی، قوانین، مذاہب، فلسفے، یہ سب اس کے خیال میں اپنے موٹے موٹے خط و خال میں اس معاشی اقتدار کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں جو انہیں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ مارکس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر کہا جائے کہ اس کے نزدیک صرف جانے بوجھے معاشی محرک ہی کو اہمیت حاصل ہے، بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ معیشت سیرت اور رائے کی تشکیل کرتی ہے اور اس طرح اکثر ان چیزوں کا سرچشمہ ہے جو شعور انسانی میں اس سے بالکل بے تعلق نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی تعلیم کو بالخصوص دو انقلابوں پر عائد کرتا ہے، ایک گذشتہ اور ایک آنے والا۔ گذشتہ انقلاب منصب داری کے خلاف بورژوا کا انقلاب ہے جس کا اظہار اس کے نزدیک خصوصاً فرانسیسی انقلاب میں ہوا۔ آنے والا انقلاب بورژوا کے خلاف مزدوروں یا بے مایگان کا انقلاب ہے جس سے اشتراکی دولت کا قیام عمل میں آئے گا۔ تاریخ کی ساری رو اس کے نزدیک ایک لازمی چیز ہے بطور

اس نتیجہ کے جو مادی اسباب وجود انسانی پر اثر ڈال کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ اشتراکی انقلاب کی تلقین اتنی نہیں کرتا جتنی اس کی پیش گوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نزدیک یہ سودبخش ہوگا، لیکن اسے زیادہ تر یہ بات ثابت کرنے سے سروکار ہے کہ یہ لازماً واقع ہوگا۔ یہ جو سرمایہ داری کے نظام کی برائیاں واضح کرتا ہے اس میں بھی یہی احساس لزوم نمایاں ہے۔ یہ جن مظالم کا مجرم سرمایہ داروں کو بتاتا ہے اس پر انہیں الزام نہیں دیتا، وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ جبتک زمین اور سرمایہ پر ملکیت شخصی قایم رہے گی سرمایہ دار ایک لزوم کے ماتحت مجبور ہے کہ بے رحمی سے پیش آئے۔ لیکن انکا یہ ظلم ہمیشہ جاری نہ رہے گا، کیونکہ یہ خود وہ قوتیں پیدا کرتا ہے جو آخر میں اسے تہ و بالا کردیں گی۔

۲۔ اجتماع سرمایہ کا قانون :۔ مارکس نے یہ بات بتائی کہ سرمایہ داری کاروبار دن بدن بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے سے آزاد مقابلہ کی جگہ بڑے ٹرسٹوں کو وجود کرتے دیکھ لیا تھا اور پیش گوئی کردی تھی کہ سرمایہ داری کاروبار کی تعداد اسی نسبت سے کم ہوتی جائیگی جس نسبت سے انفرادی کاروبار کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ اس کا گمان تھا کہ اس عمل سے نہ صرف کاروبار کی تعداد بلکہ خود سرمایہ داروں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوگی۔ بلکہ اس کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے اس کے نزدیک ایک کاروبار کا مالک ایک شخص ہو۔ لہذا وہ سمجھتا تھا کہ سرمایہ داروں کی صفوں سے آدمی برابر نکل نکل کر بے مایہ مزدوروں کے گروہ میں شامل ہوتے رہیں گے اور جہانتک تعداد کا تعلق ہے ہوتے ہوتے سرمایہ دار دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے۔ اس نے یہ اصول صرف صنعت ہی پر نہیں بلکہ زراعت پر بھی عائد کیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ زمینداروں کے علاقے روز بروز بڑھتے جائیں گے اور ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جائے گی۔ یہ صورت حالات روز بروز نظام سرمایہ داری کے عیوب اور بے انصافیوں کو زیادہ روشن

طریقہ سے پیش کرے گی اور اس طرح مخالف قوتوں کو دن بدن زیادہ ابھارے گی۔
معاشی طبقوں کی جنگ :۔ مارکس مزدور اور سرمایہ دار کو ایک گہرے تضاد کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ہر آدمی یا تو کلیتہً ایک ہے یا کلیتہً دوسرا اور اگر اب نہیں تو عنقریب ہو جائے گا۔ مزدور سے جس کے پاس کچھ نہیں سرمایہ دار جس کے پاس سب کچھ ہے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اپنے کو جوں جوں پھیلاتا ہے اور اس کی اصلیت جوں جوں صاف ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے بورژوا اور بے مایہ مزدور کی مخالفت زیادہ بین ہوتی جاتی ہے۔ ان دونوں طبقوں کے اغراض چونکہ مخالف ہیں اس لئے یہ باہمی جنگ پر مجبور ہوتے ہیں جس سے اقتدار سرمایہ داری میں اندرونی انتشار کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور رفتہ رفتہ اپنی ذات سے بیجا فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف متحد ہونا سیکھ لیتے ہیں، پہلے تو مقامی حیثیت سے پھر قومی اور آخر کار بین الاقوامی طور پر۔ جب یہ بین الاقوامی طور پر متحد ہونا سیکھ جائیں گے تو انکی فتح لازمی ہے۔ اب یہ حکم نافذ کر دیں گے کہ ساری زمین اور سرمایہ مشترک ملک ہو، بیجا فائدہ اٹھانے کا انسداد ہو جائے گا، مالکان دولت کا ظلم اب ممکن نہ رہے گا، اب جماعت کی تقسیم مختلف طبقوں میں باقی نہ رہے گی، اور سب آدمی آزاد ہو جائیں گے۔

یہ سارے خیالات اشتراکی اعلان ہی میں موجود ہیں جو نہایت حیرت انگیز قوت اور تاثیر کی تصنیف ہے جس میں نہایت جامع اختصار کے ساتھ دنیا کی عظیم الشان قوتیں، انکا معرکۂ جنگ اور اسکا اٹل نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اشتراکیت کے نشوونما میں اس درجہ اہمیت رکھتی ہے اور جن مسائل کو بعد میں "سرمایہ" کے اندر زیادہ تفصیل اور بہت ثقالت کے ساتھ بیان کیا گیا ان کا اسقدر عمدہ بیان اس میں موجود ہے کہ اس کے خاص خاص حصوں کا علم ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو چاہتا ہے کہ اس اثر و تسلط کو سمجھے جو مارکسی اشتراک

نے مزدور طبقہ کے قائدین میں سے ایک بڑی تعداد کے ذہن اور تخیل پر حاصل کر لیا ہے۔

یہ یوں شروع ہوتا ہے: ”یورپ کے سر پر ایک آسیب سوار ہے، اشتراک کا آسیب قدیم یورپ کی تمام قوتیں اس آسیب کو اتارنے کے لئے باہم ایک ائتلاف مقدس میں شامل ہوئی ہیں۔ پوپ اور زار، میٹرنک اور گیزو، فرانسیسی انتہا پسند اور جرمن پولیس کے جاسوس۔ وہ کونسا مخالف فریق ہے جسے اس کے با اقتدار حریفوں نے اشتراکی کہہ کر فضیحت نہ کیا ہو؟ وہ فریق مخالف کہاں ہو جس نے خود اپنے گروہ کے زیادہ انتہا پسند فریقوں کو نیز اپنے قدامت پسند حریفوں کو اشتراکی ہونے کی ملامت نہ کی ہو؟“

معاشی گروہوں کی جنگ کوئی نئی بات نہیں: ”ساری موجود جماعت کی تاریخ طبقات معاشی کی کشمکش کی تاریخ ہے“ اس کشاکش میں معرکہ ”ہر مرتبہ یا ہیئت اجتماعی کی ایک انقلابی ترتیب نو کی صورت میں ختم ہوا یا جنگ آزما طبقوں کی یکساں تباہی میں۔“

”ہمارے عہد نے، جو بورژوا طبقہ کا عہد ہے، اس سماجی جنگ کو سادہ کر دیا ہو۔ ہیئت اجتماعی بہ حیثیت کل روز بروز دو بڑے مقابل لشکروں میں منقسم ہوتی جا رہی ہے، دو بڑے طبقوں میں جو بلا واسطہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں: یعنی بورژوا (سرمایہ دار) اور بے مایہ مزدور۔“ اس کے بعد منصب داری کے زوال کی تاریخ آتی ہے جس کے سلسلہ میں بورژوا کا بہ حیثیت انقلابی قوت کے بیان آتا ہو ”تاریخ میں بورژوا نے نہایت انقلابی حصہ لیا ہو۔“ اس ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے جو مذہبی اور سیاسی خرابیوں کے پردہ میں ہوتا ہو اس نے کھلے بندوں، بے حیائی سے، براہ راست اور وحشیانہ فائدہ اٹھانا شروع

کردیا ہے" اپنی پیداوار کے لئے روزافزوں بازار کی ضرورت بورژوا کو سارے کرۂ ارض پر لئے پھرتی ہے" سو سال سے بھی کم عرصہ کے اقتدار میں بورژوا طبقہ نے اس سے زیادہ وسیع اور عظیم پیدائشی قوتیں پیدا کردیں جتنی تمام سابقہ نسلوں نے مل کر نہ کی تھیں "منصب داری تعلقات اب زنجیریں تھیں،" انکا توڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ توڑ دی گئیں" اور ایسی ہی ایک تحریک ہماری آنکھوں کے سامنے بھی جاری ہے" "جن ہتھیاروں سے بورژوا طبقے نے منصب داری کے قصر کو منہدم کیا تھا وہی اب خود اس کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن بورژوا طبقہ نے یہی نہیں کہ وہ ہتھیار تیار کردئے ہیں جو اس کی موت کا باعث ہوں گے بلکہ اس نے وہ آدمی بھی پیدا کردئے ہیں جو یہ ہتھیار اٹھائیں گے یعنی کارگزار طبقہ؛ بے مایہ مزدور۔

اس کے بعد مزدوروں کی ناداری کے اسباب پیش کئے گئے ہیں "ایک کام کرنے والے (مزدور) کی پیدائش کا صرف تقریباً بالکل ان ذرائع گذر پر محدود ہے جو اسے اپنے زندہ رکھنے اور اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے درکار ہیں۔ لیکن کسی چیز کی قیمت، اور لہذا محنت کی قیمت بھی اس کے صرف پیدائش کے برابر ہوتی ہے۔ لہذا جس نسبت سے کہ کام کی کراہیت بڑھتی ہے مزدوری گھٹتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس نسبت سے کہ مشین کے استعمال اور تقسیم عمل میں اضافہ ہوتا ہے اس نسبت سے مشقت کا بار بھی بڑھتا ہے"

"جدید صنعت نے شفیق استاد کی چھوٹی دوکان کو صنعتی سرمایہ دار کے بڑے کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کارخانوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے مزدوروں کے انبوہ سپاہیوں کی طرح منظم کر دئے گئے ہیں۔ صنعتی لشکر کے سپاہیوں کی حیثیت سے یہ عہدیداروں اور حوالداروں کے ایک درجہ بدرجہ

مرتب نظام کے زیر حکم ہیں - یہ بورژوا طبقہ اور بورژوا ریاست ہی کے غلام نہیں بلکہ ہر دن ہر ساعت مشین کے غلام ہیں اور ان سب سے بڑھکر خود اپنے بورژوا کارخانہ دار کی ذات کے غلام - یہ استبداد جس قدر کھلے الفاظ میں منافع کو اپنا مقصد اور اپنی غایت ظاہر کرتا ہے اسی قدر چھچھورا، قابل نفرت اور تلخ ہوتا جاتا ہے"

اس کے بعد یہ اعلان ان طبقات معاشی کی باہمی جنگ کے بڑھنے کے طریقے بتاتا ہے " مزدور طبقہ نشو و نما کے کئی منازل سے گذرتا ہے - پیدائش کی گھڑی ہی سے بورژوا سے اس کی پیکار شروع ہو جاتی ہے - پہلے پہل تو انفرادی حیثیت سے مزدور مقابلہ کرتے ہیں، پھر ایک کارخانے کے مزدور، پھر ایک صنعت کے کارگذار کسی مقام میں ان انفرادی سرمایہ داروں کے خلاف ہوجاتے ہیں جو براہ راست ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں - یہ بورژوا پیدائش دولت کے حالات کے خلاف حملہ کرنیکے بجائے خود آلات پیدائش کے دشمن بن جاتے ہیں -

اس منزل میں مزدور ابھی سارے ملک میں پھیلے ہوئے اشخاص کا ایک بے ربط مجموعہ ہیں اور باہمی مقابلہ کے باعث منتشر - اگر یہ کہیں زیادہ منضبط جماعتوں میں متحد ہوتے ہیں تو یہ خود انکے شعوری اتحاد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بورژوا طبقہ کے اتحاد کا، جو خود اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے سارے مزدور پیشہ طبقہ کو حرکت میں لانے پر مجبور ہوتا ہے اور ابھی کچھ زمانہ تک انہیں حرکت دینے کی قوت بھی رکھتا ہے "

انفرادی مزدور اور انفرادی سرمایہ دار کا تصادم روز بروز دو معاشی طبقوں کے تصادم کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے - اس پر مزدور بورژوا کے خلاف اپنی جمعیتیں بنانا شروع کرتے ہیں (اتحاد ہائے صنعتی) اجرت کا نرخ اونچا

رکھنے کے لئے یہ باہم ملتے ہیں، اپنی ہنگامی بغاوتوں کے لئے پہلے سے انتظام کرنے کی غرض سے یہ مستقل انجمنیں بناتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مقابلہ بلووں کی شکل اختیار کرتا ہے کبھی کبھی مزدور فتحمند ہوتے ہیں، لیکن محض عارضی طور پر۔ انکے معرکوں کا اصلی پھل انکے فوری نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ مزدوروں کے روز بروز وسعت پذیر اتحاد میں۔ اس اتحاد میں ان ترقی یافتہ ذرائع آمد و رفت سے مدد ملتی ہے جو موجودہ صنعت نے پیدا کر دئے ہیں اور جو مختلف مقامات کے مزدوروں میں باہم تعلق پیدا کرا دیتے ہیں۔ متعدد مقامی معرکوں کو جنکی نوعیت ایک ہی تھی مرکزی حیثیت سے مجتمع کر کے معاشی طبقوں کی ایک قومی جنگ بنانے کے لئے اس تعلق کی ضرورت تھی لیکن معاشی طبقوں کی ہر جنگ سیاسی جنگ ہے۔ اور جس اتحاد کے پیدا کرنے کے لئے قرون وسطےٰ کے شہریوں کو اپنی خراب سڑکوں کے باعث صدیاں درکار تھیں وہ ریلوں کا بھلا ہو موجودہ مزدور طبقہ چند سال میں حاصل کر لیتا ہے۔ مزدوروں کی ایک معاشی طبقے میں اور لہذا ایک سیاسی فریق (پارٹی) کی شکل میں تنظیم برابر اس مقابلہ کی وجہ سے بکھر جاتی ہے جو خود مزدوروں میں باہم موجود ہے۔ لیکن یہ پھر اٹھتی ہے اور پہلے سے مضبوط تر، قوی تر، پائیدہ تر ہو کر بورژوا طبقہ میں جو باہمی مناقشین ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یہ مزدوروں کے بعض مخصوص اغراض کو قانوناً تسلیم کرا لیتی ہے۔"

"بے مایہ مزدور طبقے۔ میں عام طور پر پرانے اجتماعی حالات علامت ہی چکتے ہیں۔ مزدور بے املاک ہوتا ہے، اپنی بیوی بچوں سے اس کے جو تعلقات ہوتے ہیں ان میں اور بورژوا خاندانی تعلقات میں کوئی چیز مشترک باقی نہیں رہتی۔ موجودہ صنعتی محنت نے سرمایہ کی محکومیت، جو انگلستان اور فرانس، امریکہ اور جرمنی سب جگہ یکساں ہے اسے سیرت و خصائل قومی کے ہر اثر

سے عاری کر دیا ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب اس کے لئے بس بورژوا تعصبات ہیں جن کی آڑ میں اتنے ہی بورژوا اغراض پوشیدہ ہیں۔ سارے گذشتہ طبقے جو غالب آئے انہوں نے اپنی حاصل شدہ حیثیت کو اور مضبوط کرنے کے لئے ساری جماعت کو اپنی شرائط تملیک کا پابند بنایا۔ مزدور ہیئت اجتماعی کی پیدائشی قوتوں پر کسی طرح قابض نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے سابقہ طریق تملیک اور لہذا ہر دوسرے سابقہ طریق تملیک کو مٹا دیں ان کا اپنا تو کچھ ہے نہیں جسے یہ بچائیں اور محفوظ کریں ان کا مقصد ہے ملکیت شخصی کی تمام سابقہ حفاظتوں اور ضمانتوں کو تباہ کر دینا۔ تمام سابقہ تاریخی تحریکیں اقلیت کی تحریکیں تھیں یا اقلیت کے اغراض کے لئے تھیں۔ مزدوروں کی تحریک بہت بڑی اکثریت کی شعوری اور خود مختار تحریک ہے اور اسی بڑی اکثریت کے اغراض کے لئے۔ مزدوروں کا طبقہ جو موجودہ جماعت کی سب سے نیچی تہ ہے اس وقت تک نہ حرکت کر سکتا ہے نہ اپنے کو ابھار سکتا ہے جب تک کہ دفتری ہیئت اجتماعی کی ساری اوپر کی تہیں پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں نہ اڑ جائیں "

مارکس کہتا ہے کہ اشتراکی سارے مزدور طبقہ کے ساتھ ہیں۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں " اشتراکیوں پر ایک الزام یہ اور لگایا جاتا ہے کہ یہ ملکوں اور قوموں کے مٹانے کے آرزومند ہیں۔ مزدور کا کوئی ملک نہیں۔ ہم ان سے وہ چیز نہیں چھین سکتے جو وہ رکھتے ہی نہیں "

اشتراکیوں کا سب سے پہلا مقصد مزدوروں کے ہاتھوں سیاسی قوت کا حصول ہے " اشتراکیوں کا نظریہ ایک جملہ میں بند کیا جا سکتا ہے: ملکیت شخصی کا مٹانا "

اس قسم کے الزامات کے جواب میں کہ اشتراک عیسائیت کا مخالف ہے تاریخ

کی مادی تشریح استعمال کی گئی ہے" اشتراک کے خلاف مذہبی، فلسفیانہ یا عموماً عینی نقطہ نظر سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ زیادہ گہری تحقیق کے مستحق نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے کیا کوئی گہرا وجدان درکار ہے کہ انسان کے خیالات آرار، اور تصورات مختصراً انسان کا شعور ہر اس تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہو جو اس کے وجود مادی کی کیفیات، اس کے معاشرتی تعلقات اور اس کی جماعتی زندگی میں پیدا ہو؟"

ریاست کی طرف "اعلان" کا رویہ ہرودہ بالکل آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ "جدید ریاست کی نظامیہ بس تمام بورژوا طبقہ کے معاملات مشترکہ کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی ہے" تاہم مزدور طبقہ کا پہلا قدم ریاست میں حصول اقتدار ہونا چاہیئے۔" ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مزدور طبقہ کے انقلاب میں پہلا قدم یہ ہو کہ مزدوروں کو حکمراں طبقہ بنا دے، جمہوریت کا معرکہ سر کرے۔ مزدور طبقہ اپنے سیاسی اقتدار کو اس غرض کے لئے استعمال کرے گا کہ رفتہ رفتہ بورژوا طبقہ سے سارا سرمایہ چھین لے اور تمام آلات پیدائش دولت کو مرکزی حیثیت سے ریاست کے ہاتھ میں جمع کردے یعنی بطور طبقہ حکمراں منظم مزدوروں کے ہاتھ میں۔ اور پیدائشی قوتوں کے مجموعہ کو جس قدر تیزی سے ممکن ہو بڑھائے۔

اعلان آگے چل کر فوری اصلاحات کا ایک پروگرام پیش کرتا ہو جس سے اول اول تو موجودہ ریاست کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا لیکن یہ کہا گیا ہو کہ جب اشتراکی انقلاب تکمیل کو پہنچ جائے گا تو ریاست کا وجود جس حیثیت سے ہم اسے جانتے ہیں ختم ہو جائے گا۔ جیسے انگلس ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے کہ جب مزدور طبقہ ریاست کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لیگا" تو ساتھ ہی معاشی طبقوں

کے تمام اختلافات اور خصومتوں کا خاتمہ بھی کردیگا چنانچہ ریاست کا وجود بھی بہ حیثیت ریاست کے ختم ہو جائے گا۔" اس طرح اگرچہ واقعتاً مارکس اور اینگلس کی تجاویز کا نتیجہ ریاستی اشتراک ہوتا ہم ان پر ریاست کو عظمت دینے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

"اعلان" ساری دنیا کے مزدوروں کو اشتراک حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ایک اپیل پر ختم ہوتا ہے "اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانے کو حقیر جانتے ہیں۔ یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ انکے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ تمام موجودہ جماعتی حالات کو بہ جبر تباہ کر دیا جائے۔ حکمراں طبقے اشترا کی انقلاب کے ڈر سے کانپیں! مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے اور کچھ کھونے کو نہیں۔ فتح کرنے کو انکے لئے ایک عالم ہے۔ تمام ممالک کے مزدورو متحد ہو جاؤ!"

اس اشتراکی "اعلان" کی اشاعت کے بعد جلد ہی روس کے علاوہ براعظم یورپ کے تمام بڑے ملکوں میں انقلاب برپا ہوا لیکن سوائے شروع شروع میں فرانس کے یہ انقلاب نہ معاشی تھا نہ بین الاقوامی۔ ہر دوسری جگہ اسے قومیت کے خیالات نے ابھارا تھا۔ چنانچہ وقتی طور پر خوف زدہ ہونے کے بعد دنیا کے حکمرانوں نے ان مخالفتوں کو ابھار کر پھر اقتدار حاصل کر لیا جو قومی خیالات میں لازماً موجود ہوتی ہیں۔ اور ایک بہت مختصر سی ظفرمندی کے بعد یہ انقلاب ہر جگہ جنگ اور ردعمل کی شکل میں ختم ہوا۔ اشتراکی "اعلان" کے خیالات شائع ہو گئے قبل اس کے کہ دنیا انکے لئے تیار ہوتی۔ لیکن اس کے مصنفوں نے ہر ملک میں اس اشتراکی تحریک کی ابتدا اپنی آنکھوں سے دیکھ لی جو روز افزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے، حکومتوں پر روز بروز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، جو روسی

انقلاب پر حاوی ہے شاید وہ دن دور نہیں کہ یہ تحریک وہ بین الاقوامی فتح حاصل کرنے کا اہل اپنے کو ثابت کر سکے جس کی طرف اعلان کے آخری جملے دنیا کے فرد و زن کو دعوت دیتے ہیں۔

مارکس کے شاہکار "سرمایہ" نے "اشتراکی اعلان" کے قضیوں میں حجم اور مواد کا اضافہ کیا۔ اس نے "قدر زاید" کا نظریہ پیش کیا جو سرمایہ داری فائدہ بیجا کے واقعی کل پرزوں کی تشریح کا مدعی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور ہم خالص نظریات میں اسے مشکل ہی سے ایک اضافہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم اسے تجریدی الفاظ میں مارکس کی اس نفرت کا ترجمہ سمجھیں جو اسے اس نظام سے تھی جو انسانی زندگیوں سے مادی دولت بناتا ہے۔ اور اسی معنی میں اس کے مداحوں نے اسے سمجھا ہے نہ کہ بے لوث تحلیل علمی کی حیثیت سے۔ نظریہ قدر زاید کی تنقیدی تحقیق میں خالص معاشی نظریہ کی بہت سی دشوار اور مجرد بحثیں آجائیں گی اور اشتراک کی علمی صحت یا عدم صحت پر اسکا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے موجودہ کتاب کی حدود میں اس کا شامل کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب (سرمایہ) کے بہترین حصے وہ ہیں جو معاشی واقعات سے بحث کرتے ہیں اسلئے کہ مارکس انکا نہایت ہمہ گیر علم رکھتا تھا۔ انہیں واقعات سے اسے توقع تھی کہ وہ اپنے چیلوں میں وہ پائدار اور غیر فانی نفرت پھونک سکے گا جو انہیں مرتے دم تک معاشی طبقوں کی جنگ میں سپاہی بنائے رکھے گی۔ اس نے جو واقعات جمع کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو جین کی زندگی بسر کرنیوالے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کے لئے عملاً نامعلوم ہیں۔ یہ بڑے ہیبت خیز واقعات ہیں اور جو معاشی نظام انہیں پیدا کرتا ہے اسکے متعلق تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ نہایت مہیب ہے۔ اس کے انتخاب واقعات کی چند مثالیں بہت سے اشتراکیوں کی تلخی کی تشریح کا کام دیں گی:-

۱۴ر جنوری ۱۸۶۰ء کو ناٹنگم کے مجلس گھر میں مسٹر بروٹن چارلٹن مجسٹریٹ ضلع نے ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے بیان کیا کہ "دیس کی صنعت سے آبادی کے جس حصے کا تعلق ہے اس میں ناداری و مصیبت کا عالم یہ ہے کہ حکومت کے دوسرے حصوں میں کیا ساری دنیا میں ایسی حالت نہ ملیگی . . . . نونو دس دس برس کے بچے اپنے میلے کچیلے بستروں سے صبح ۲، ۳ یا ۴ بجے باہر گھسیٹ لئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ محض گزارہ پر رات کے ۱۰، ۱۱ یا ۱۲ بجے تک کام کریں - انکے ہاتھ پاؤں گھسے جاتے ہیں، انکی ہڈیاں پگھلی جاتی ہیں - انکے چہرے سفید پڑ جاتے ہیں، اور انکی انسانیت اترتے اترتے مطلق پتھر کنکر کے سے جمود کی ایسی سطح پر پہونچ جاتی ہے جس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے"

لندن کے ایک جوری کے سامنے تین آدمی کھڑے ہیں - ایک گارڈ، ایک انجن چلانیوالا، ایک جھنڈی دکھلانے والا - ایک مہیب ریل کے حادثہ نے سیکڑوں مسافروں کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے - ملازموں کی غفلت اس حادثہ کا سبب ہے اور یہ بیک آواز جیوری کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ دس یا بارہ سال پہلے انکا کام روزانہ صرف ۸ گھنٹہ رہتا تھا - پچھلے ۵ یا ۶ برس سے یہ بڑھکر ۱۴، ۱۸ اور ۲۰ گھنٹہ روزانہ تک ہوگیا ہے اور جب چھٹیاں منانے والوں کا زیادہ زور ہوتا ہے اور تفریح کی گاڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو انکا کام بلا وقفہ ۴۰ یا ۵۰ گھنٹہ تک چلتا ہے - یہ معمولی آدمی ہیں جن یا دیو تو نہیں ہیں - ایک نقطہ پر پہنچکر انکی محنت نے جواب دیدیا - انپر جمود طاری ہوگیا - انکا دماغ سوچنے سے معذور ہوگیا اور انکی آنکھیں دیکھنے سے - ان سراپا عزور، انگریز ارکان جوری

نے حکم لگایا کہ انہیں قتل انسانی کے جرم میں عدالت بالا کے سپرد کیا جائے
اور اپنے حکم کے ساتھ ایک نرم "تنبیہ" میں یہ مقدس امید ظاہر کی کہ ریل کے
سرمایہ دار اکابر آئندہ (قوت) محنت کی کافی مقدار خریدنے میں ذرا
زیادہ فراخدل ہونگے اور اپنے ملازموں سے کام لینے میں ذرا زیادہ "اعتدال"
زیادہ "نفس فراموشی" اور زیادہ "کفایت" سے کام لیں گے۔

جون ۱۸۶۳ء کے آخری ہفتہ میں لندن کے تمام روزانہ اخباروں
نے "محض زیادتی کار سے موت" کے "سنسنی خیز" عنوان کے ماتحت
میں ایک عبارت شائع کی۔ اسمیں میری این واکلے نامی ایک ۲۰ سالہ
درزن کی موت کا ذکر تھا جو ایک نہایت معزز لباس سازی کے کارخانے
میں ملازم تھی جس پر ایلیزا کا خوش آئند نام رکھنے والی ایک خاتون متصرف
تھیں۔ یہ لڑکی اوسطاً ½ ۱۶ گھنٹے، اور خاص بکری کے موسم میں بلا وقفہ
۳۰ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اور اس کی رو بہ زوال قوت کو وقتاً فوقتاً شیری
یا پورٹ شراب یا کافی کی فراہمی سے دوبارہ زندہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت
بکری کا موسم زوروں پر تھا۔ نووارد شہزادی ویلز کی آمد کی تقریب میں ناچ
ہونے والے تھے اور اسمیں جو معزز خواتین مدعو تھیں انکے لئے پل مارتے
میں شاندار لباس تیار کرنے تھے۔ میری این واکلے نے اور ۶۰ لڑکیوں
کے ساتھ بلا وقفہ ½ ۲۶ گھنٹے کام کیا۔ ایک کمرہ میں ۳۰ لڑکیاں کام کرتی
تھیں جس میں انکے لئے جتنے مکعب فٹ ہوا درکار تھی اس کی صرف ایک
چوتھائی پہنچ سکتی تھی۔ رات میں یہ دو دو ملکر ایک ایسی کوٹھری میں سوتیں
جہاں دم گھٹتا تھا اور جو کمرہ خواب کو دفتیوں سے تقسیم کرکے بنائی گئی تھیں
اور یہ کارخانہ لندن کے بہترین لباس سازی کے کارخانوں میں سے تھا۔

میری این واکلے جمعہ کو بیمار پڑی، اتوار کو مرگئی، اور ایلیزا خاتون کو بڑا تعجب ہوا کہ ہاتھ میں جو کام لیا تھا اسے ختم کئے بغیر! ڈاکٹر مسٹر کیز نے جو بستر مرگ پر بہت دیر میں بلائے گئے تھے، جوری کے سامنے شہادت دی کہ "میری این واکلے آدمیوں سے بالکل بھرے ہوئے کمرہ میں بہت دیر تک کام کرنے اور ایسی کوٹھری میں سونے کیوجہ سے مرگئی جو بہت تنگ تھی اور جس میں ہوا کے جانے کا انتظام بہت خراب تھا" ڈاکٹر صاحب کو آداب حسنہ کی تعلیم دینے کے لئے جوری نے فیصلہ کیا کہ "متوفیہ مرگی کے عارضہ وغیرہ وغیرہ" آزادی تجارت کے حامی کا بدن اور برائٹ کا پرچہ مارننگ اسٹار چلا اٹھا کہ "ہمارے سفید غلام جو کثرت مشقت سے قبر کا منہ دیکھتے ہیں اکثر خاموشی سے گھلتے رہتے ہیں اور بالآخر مرجاتے ہیں[1]"

ایڈورڈ ششم: اسکی حکومت کے پہلے سال (۱۵۴۷ء) میں ایک قانون نافذ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کام کرنے سے انکار کرے تو یہ اس شخص کا غلام قرار دیدیا جائے جس نے اسپر کام چوری کا الزام لگایا ہے۔ آقا اپنے غلام کو کھانے کے لئے روٹی اور پانی، ہلکی سی یخنی اور ایسا بچا کھچا گوشت دے جو اس کے خیال میں اس کے لئے موزوں ہو۔ آقا کو حق ہے کہ جس کام پر چاہے اسے مجبور کرے چاہے یہ کام کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو۔ اور یہ چابک اور زنجیر کی مدد سے۔ اگر غلام دو ہفتے غائب رہے تو یہ ساری عمر کے لئے غلام ہوجائے گا اور اس کی پیشانی اور پشت پر حرف S داغدیا جائے گا۔ اگر یہ تین مرتبہ بھاگ جائے تو مستحق موت مجرم کی حیثیت سے اسے پھانسی دی جائے۔ آقا اسے بیع کرسکتا ہے۔ ورثہ میں دے سکتا ہے، غلام

---

(۱) جلد اول صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰

کی حیثیت سے کرایہ پر دے سکتا ہو ، بالکل جیسے کسی ذاتی چیز یا مویشی کو اگر غلام اپنے
آقا کے خلاف کچھ کرنیکی کوشش کریں تو بھی انہیں سزار موت دیجائے منصفان
امن کو جب خبر پہنچے تو چاہئے کہ ان بدمعاشوں کو گھیر کر انکا شکار کرے ۔ اگر کوئی
آوارہ گرد کہیں ۳ دن تک بیکار پھرتا پکڑا جائے اسے اس کے مقام ولادت
پر لیجانا چاہئے ، لال دہکتے ہوے لوہے سے اس کے سینہ پر حرف V داغنا
چاہئے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر سڑک کوٹنے یا کسی اور کام پر لگا دینا
چاہئے ۔ اگر یہ آوارہ گرد غلط مقام پیدائش[1] بتائے تو یہ ساری عمر کے لئے اس
مقام کا غلام بنا دیا جائے یعنی اس کے باشندوں اور اس کی جمعیت بلدی
کا ، اور اس کے جسم پر حرف S کا داغ دیدیا جائے ۔ ہر شخص کو اختیار ہو
کہ آوارہ گردوں کے بچوں کو مددگار کی طرح لیجائیں ، نوجوانوں کو ۲۴ سال
کی عمر تک اور لڑکیوں کو ۲۰ سال تک ، اگر یہ بھاگیں تو اس عمر تک اپنے
استادوں کے غلام رہیں ، ان آقاؤں کو اختیار رہے کہ اگر چاہیں تو انہیں
زنجیروں میں جکڑیں کوڑوں سے ماریں ۔ ہر آقا اپنے غلام کے گردن ، بازو
یا پیر میں ایک لوہے کا کڑا ڈالے جس سے اسے آسانی سے پہچانا جاسکے اور
بھاگ نہ پائے اس قانون کا آخری حصہ یہ ہو کہ بعض غریب لوگ ایسے مقامات
یا ایسے اشخاص کے ملازم بنائے جاسکتے ہیں جو انہیں کھانا پینا دینے کو راضی
ہوں اور انکے لئے کام فراہم کریں ۔ حلقہ کے غلاموں کی یہ قسم انگلستان میں
انیسویں صدی میں عرصہ تک " چوکیداروں " کے نام سے قائم رہی "
اسی نوع کے واقعات کا صفحہ بہ صفحہ اور باب بہ باب ، جن میں سے ہر ایک
اس تقدیری نظریہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے جس کے یقینی دلائل سے ثابت کرنے کا

(۱) جلد اول صفحہ ۵۸۷ - ۵۹۰

مارکس مدعی ہے، کیسے ہو سکتا ہو کہ ہر جذبات رکھنے والے مزدور پیشہ پڑھنے والے کو آگ بگولا نہ کردے اور سرمایہ کے ہر مالک کو جس میں شرافت اور انصاف یک قلم مفقود ہی نہ ہو گیا ہو ناقابل برداشت شرم سے پانی پانی نہ کردے۔

کتاب کے تقریباً ختم پر ایک نہایت مختصر سے باب میں جو "اجتماع سرمایہ کا تاریخی رجحان" کے زیر عنوان ہے، مارکس ایک لمحہ کے لئے اس امید کی ذرا سی جھلک آنے دیتا ہے جو موجودہ مصیبت سے پرے کہیں بہت دور ہے۔

"جب تبدیل ہیئت کا یہ عمل قدیم جماعت کو سرتاپا پراگندہ کر چکے گا، جب کام کرنیوالے بے مایہ مزدوروں میں مبدل ہو جائیں گے اور ذرائع محنت سرمایہ میں، جب سرمایہ داری طریقہ پیدائش دولت خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا، تو محنت کا مزید خدمت جماعت میں صرف ہوتا، زمین اور دیگر ذرائع پیدائش کا جماعت کے فوائد کے لئے اور لہذا مشترک ذرائع پیدائش کی حیثیت سے استعمال ہونا، نیز شخصی ملکیت رکھنے والوں کی مزید بے دخلی، یہ سب چیزیں ایک دوسری شکل اختیار کریں گی اب جس کی بے دخلی ہوگی وہ مزدور نہیں جو خود اپنے لئے کام کرتا ہے بلکہ سرمایہ دار ہو گا جو بہت سے مزدوروں سے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ بے دخلی خود سرمایہ داری پیدائش دولت کے مضمر بالذات قوانین سے عمل میں آتی ہے یعنی سرمایہ کے اجتماع مرکزی سے۔ ایک سرمایہ دار ہمیشہ کئی کو مارتا ہے۔ اس مرکزیت یا چند کے ہاتھوں کئی کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ روز افزوں طور پر عمل محنت کی تعاونی شکل نشو و نما پاتی ہے، نیز صنعت میں حکمت کا بالارادہ استعمال زمین کی باقاعدہ کاشت، آلات محنت کی تبدیلی ایسی شکلوں میں جو صرف مشترک حیثیت سے قابل استعمال ہیں۔ سارے ذرائع پیدائش کے استعمال میں اس طرح کفایت کہ انہیں صرف متحدہ اور جماعتی محنت کے ذرائع کے طور پر استعمال کیا جائے، تمام اقوام کا ایک دنیا کے بازار میں ایک دوسرے سے خلط ملط۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اقتدار

سرمایہ داری کی بین الاقوامی نوعیت - جیسے جیسے اکابرین سرمایہ کی تعداد گھٹتی ہے اور یہ اس تبدیلی کے تمام فوائد کو غصب کرکے اپنے اجارہ میں لیتے جاتے ہیں اسکے ساتھ ہی ساتھ فلاکت، ظلم، غلامی، ذلت اور فائدہ بیجا کا انبار بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی بغاوت بھی بڑھتی ہے، ایک طبقہ ہی جس کی تعداد روز بڑھتی جاتی ہے اور جو خود سرمایہ داری اور پیدائش دولت کی ضرورتوں کے اثر سے منضبط، متحد اور منظم ہے۔ سرمایہ کا اجارہ طریقہ پیدائش کے لئے زنجیر بن جاتا ہے، اس طرز پیدائش کے لئے جو اسی سے ابھرا تھا اور جس نے اسی کے ساتھ اور اسی کے ماتحت ترقی پائی تھی۔ ذرائع پیدائش کی مرکزیت اور محنت کا جماعتی استعمال اب ایسے نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اس سرمایہ داری کے خول کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ خول پھٹتا ہے۔ سرمایہ داری ملکیت شخصی کی موت کا گھنٹا بجتا ہے۔ بے دخل کرنے والے بے دخل کئے جاتے ہیں ۔"(۱)

بس صرف اسقدر۔ اس کے علاوہ شروع سے آخر تک مشکل ہی سے کوئی اور لفظ ہے جو اداسی کو دور کرے۔ اور پڑھنے والے کے دماغ پر اسی بیدردانہ دباؤ میں اس قوت کا بڑا حصہ مضمر ہے جو اس کتاب نے حاصل کی ہے۔

مارکس کی تصنیف سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول آیا تاریخی ارتقار کے جو قانون اس نے بتائے ہیں وہ صحیح ہیں؟ دوم، کیا اشتراک پسندیدہ چیز ہے؟ دوسرا سوال پہلے سے بالکل بے تعلق ہے۔ مارکس ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اشتراک کا آنا لازمی ہے لیکن اس کی دلیل دینے سے اسے مشکل ہی سے کچھ سروکار نظر آتا ہے کہ جب یہ آئیگا تو اچھی چیز بھی ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ آئے تو اچھی چیز ہو۔ چاہے مارکس کی تمام وہ دلیلیں غلط ہی ہوں جو اس نے اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ اسکا آنا

---

(۱) جلد اول صفحہ ۷۸۸ - ۷۸۹

لازمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ نے مارکس کے نظریات میں سے بہتوں میں کمزوریاں ظاہر کی ہیں
دنیا کی ترقی اس کی پیش گوئی سے بیشک اتنی کافی مشابہت رکھتی ہے کہ اسے نہایت غیر معمولی
دقت نظر کا آدمی ثابت کر دے، لیکن اتنی مشابہ نہیں کہ سیاسی یا معاشی تاریخ کو اس کی پیشگوئی
کے بالکل مطابق کرنے کے لئے کافی ہو۔ قومیت کا جذبہ، گھٹنے کا کیا ذکر، اور بڑھ گیا ہے۔
اور اس پر وہ عالمگیر رجحانات فتح نہیں پا سکے ہیں جو مارکس نے نہایت ٹھیک طور پر مالیات
میں دیکھے تھے۔ اگرچہ بڑے کاروبار اور بڑے ہوگئے ہیں اور بہت بڑے رقبہ میں اجارہ
کی منزل پر پہنچ چکے ہیں تاہم ان میں حصہ داروں کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ ان افراد کی تعداد
جن کے اغراض نظام سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ہیں، برابر بڑھتی گئی ہے۔ علاوہ بریں
اگرچہ بڑے کارخانے زیادہ بڑے ہوگئے ہیں تاہم ساتھ ساتھ اوسط درجہ کے کارخانے بھی
تعداد میں بڑھتے رہے ہیں اسی اثنا میں مزدور جنہیں مارکس کے خیال کے مطابق محض گذارہ
کی اس سطح پر ہی رہنا چاہئے تھا جس پر وہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان میں
تھے۔ انھوں نے بجائے اس کے دولت کی عام فراوانی سے فائدہ حاصل کیا ہے اگرچہ اس
درجہ نہیں جتنا کہ سرمایہ داروں نے۔ اجرت کا مفروضہ قانون آہنی جہاں تک متمدن ممالک کی
محنت کا تعلق ہے، غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اگر ہمیں آج سرمایہ دارانہ ظلم کی ایسی مثالیں
ڈھونڈنی ہوں جن سے مارکس کی کتاب بھری پڑی ہے تو ہمیں اپنے مواد کے اکثر حصے کے لئے
منطقہ حارہ کیطرف رجوع کرنا ہوگا جہاں ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نیچی نسلوں کے انسان
موجود ہیں۔ پھر یہ کہ آج دنیائے محنت میں ہنرمند مزدور "رئیس" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے
لئے یہ ایک سوال ہے کہ وہ سرمایہ دار کے خلاف بے سیکھے مزدوروں سے یا ان کے
خلاف سرمایہ دار سے ملے۔ اکثر یہ خود ایک چھوٹا موٹا سرمایہ دار ہوتا ہے، اور اگر انفرادی
حیثیت سے یہ خود نہ بھی ہو تو اسکا "اتحاد صنعتی" یا اس کی "انجمن احباب" تو ظن غالب
ہے کہ ہوگی۔ لہذا معاشی طبقوں کی جنگ میں وہ شدت قائم نہیں رہی۔ بجائے اس پہلے

نادار مزدور اور ہمہ دار سرمایہ دار کے۔ مرہمی منطقی تضاد کے اب تو غریب اور امیر کے درمیان مدارج ہیں بیچ کی منزلیں ہیں۔ خود جرمنی میں جو ارتودکس مارکیت کا گھر بن گیا تھا اور جس کی نہایت ترقی یافتہ اور طاقتور اشتراکی جمہوری پارٹی "سرمایہ" کے مسائل کو لفظی حیثیت کے علاوہ اور ہر طرح منزل من اللہ جانتی تھی خود وہاں جنگ سے قبل زمانہ میں تمام طبقوں کے اندر دولت کی بیحد فراوانی نے اشتراکیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور انقلابی رویہ کے بجائے ارتقائی رویہ اختیار کریں۔ ایک جرمن اشتراکی برنشٹائین نے جو عرصہ تک انگلستان میں مقیم تھا ایک "ترمیمی" تحریک کی ابتدا کی اور بالآخر اشتراکی پارٹی کے بڑے حصہ کو اپنا حامی بنالیا۔ ارتودکس مارکیت کے خلاف اس کی نکتہ چینی اس کی کتاب "ارتقائی اشتراک" میں پیش کی گئی ہے۔ اور تمام وسعت مذہب کے حامی مصنفین کیطرح برنشٹائین کا کام بھی زیادہ تر یہ ظاہر کرنا تھا کہ خود بانیان مذہب اپنے مذہب کے مسائل پر اس درجہ سختی سے قائم نہ تھے جتنا کہ انکے متبعین۔ مارکس اور انگلز کی تحریروں میں بہت کچھ چیزیں ہیں جو اس شدید ارتودکسی میں نہیں کھپتیں جو انکے متبعین میں پیدا ہو گئی تھی۔ علاوہ اس نکتہ چینی کے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان متبعین کے خلاف برنشٹائین کی تنقید انقلاب کے مقابلہ میں رفتہ رفتہ ارتقائی اور تدریجی عمل کی حمایت پر مشتمل ہے۔ یہ مذہب حریت کی اس بیجا خصوصیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے جو اشتراکیوں میں بہت عام ہو اور اس بین الاقوامیت کی دھار بھی کند کرتا ہے جو بلاشبہ مارکس کی تعلیم کا جزو ہے۔ یہ کہتا ہے کہ جہاں مزدور شہری بنا تو پھر وطن کا بھی پابند ہو جاتا ہے اور وہ اس قوم پرستی کی حمایت کرتا ہے جس کے متعلق جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ اشتراکی طبقوں میں عام ہے۔ یہ یہاں تک کہتا ہے کہ یورپی قوموں کو ممالک حارہ پر بوجہ اپنی اعلیٰ تہذیب کے حق حکومت حاصل ہو یہ تعلیم انقلابی امنگ کو مدھم کرتی اور اشتراکیوں کو لبرل فرقہ کا ایک بازوئے چپ بنادیتی ہے۔ لیکن جنگ سے قبل مزدوروں کی روز افزوں مرفہ الحالی نے خیالات کی اس نشو و نما

کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ آیا جنگ اس بارے میں حالات بدلیگی اس کا جاننا فی الحال ناممکن ہے۔
برنشٹائین اس عاقلانہ قول پر اپنی تصنیف ختم کرتا ہے : " ہمیں مزدوروں کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ واقعاً ہیں۔ اور یہ نہ تو اس درجہ عالمگیر طور پر نادار ہیں جیسا کہ اشتراکی اعلان میں بیان کیا گیا تھا، نہ تعصبات اور کمزوریوں سے ایسے پاک ہیں جیسا کہ انکے درباری ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں "

برنشٹائین مارکسی ارتودکسی کے اس زوال کا نمائندہ ہے جو اندر سے شروع ہوا ہے۔ سنڈکلیت کا اسپر باہر سے حملہ ہے یعنی ایک ایسے مذہب کے نقطہ نظر سے جو مارکس اور اینگلز سے زیادہ بنیادی اور انقلابی ہونے کا مدعی ہے۔ مارکس کیطرف سنڈکلی رویہ کا پتہ سوریل کی چھوٹی سی کتاب "انتشار مارکسیت" اور اس کی بڑی تصنیف "افکار بابتہ تشدد" جس کا انگریزی ترجمہ بہ اجازت مصنف ٹ۔ا۔ ہیوم نے کیا ہے (مطبوعہ ۱۹۱۵ء ایلن وابون) برنشٹائین نے جہانتک مارکس پر نکتہ چینی کی ہے اسے بالاتفاق نقل کرنے کے بعد سوریل ایک دوسری قسم کی نکتہ چینی شروع کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے (اور یہ سچ بھی ہے) کہ مارکس کی نظری معاشیات مذہب منچسٹر سے بہت قریب ہے۔ اس نے اپنے شباب کے زمانہ کی ارتودکس معاشیات کو بہت سی ایسی باتوں میں تسلیم کرلیا ہے جو اب غلط ثابت ہوچکی ہیں۔ سوریل کے نزدیک مارکس کی تعلیم میں واقعی اصلی چیز طبقات معاشی کی جنگ ہے۔ جو کوئی اسے زندہ رکھے وہ اشتراک کی روح کو ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ زندہ رکھ رہا ہے جو اشتراکی۔ جمہوری ارتودکسی پر حرف بحرف اڑے ہوئے ہیں۔ اس جنگ طبقاتی کی بنیاد پر فرانسیسی سنڈکلیوں نے مارکس پر وہ تنقید پیش کی جو اس تنقید سے جس پر ہم ابھی تک غور کررہے تھے بہت زیادہ گہری ہے۔ ارتقار تاریخی کے متعلق جہانتک امر واقعہ کا تعلق ہے مارکس کے خیالات میں تھوڑی بہت غلطی ہوسکتی تھی تاہم ممکن تھا کہ وہ سیاسی و معاشی نظام جو یہ پیدا کرنا چاہتا تھا اتنا ہی پسندیدہ ہوتا جتنا کہ اس کے متبع

فرض کرتے ہیں۔ لیکن سنڈکلیوں نے محض امر واقعہ کے بابتہ ہی مارکس کے خیالات پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ اس مقصد پر بھی جو اس کے پیش نظر ہے اور ان ذرائع کی عام نوعیت پر جو یہ تجویز کرتا ہے۔ مارکس کے خیالات نے ایسے زمانہ میں صورت اختیار کی تھی کہ ابھی جمہوریت کا وجود نہ تھا۔ اسی سال جب کتاب "سرمایہ" شائع ہوئی ہے انگلستان میں شہری مزدوروں کو پہلی مرتبہ حق رائے ملا اور شمالی جرمنی میں بسمارک نے عام حق انتخاب منظور کیا۔ فطری بات تھی کہ جمہوریت سے جو جو حاصل ہو سکتا ہے اس کے متعلق بڑی بڑی امیدیں باندھی جائیں۔ ارتودکس معاشیئن کیطرح مارکس کا بھی گمان تھا کہ انسان کی رائے کم و بیش ذاتی یا اپنے طبقہ کے معاشی اغراض سے بنتی ہے۔ سیاسی جمہوریت کے طویل عملی تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں احرار و اشتراکی دونوں کے مقابلہ میں دسرائیلی اور بسمارک فطرت انسانی کے بہتر جاننے والے تھے۔ یہ بات روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے کہ ریاست پر ذریعہ حریت کی حیثیت سے اعتبار کیا جائے یا سیاسی فرقوں کو اس بات کے لئے کافی قوی آلہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست کو قوم کی خدمت پر مجبور کر سکیں۔ سوریل کہتا ہے کہ جدید ریاست "ذہنیئن کی ایک جماعت ہے جس کے ہاتھ میں کچھ مراعات ہیں اور ایسے ذرائع (جنھیں سیاسی کہا جاتا ہے) جن سے یہ ذہنیئن کے ان دوسرے گروہوں کے حملوں سے اپنے کو بچا سکے جو ملازمت عامہ کے فوائد حاصل کرنے کے مشتاق ہیں۔ ان ملازمتوں کو حاصل کرنیکے لئے سیاسی فرقے بنتے ہیں اور یہ خود ریاست سے مشابہ ہوتے ہیں "[1]

سنڈکلی آدمیوں کو فرقوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ پیشہ کے لحاظ سے منظم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس یہی طبقات معاشی کی جنگ کا صحیح تصور اور سچا طریقہ ہے چنانچہ یہ پارلیمنٹ اور انتخابات کے ذریعہ ہر سیاسی عمل کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ جس کارروائی کو بیش

---

(۱) "انتشار مارکسیت" صفحہ ۵۴

کرتے ہیں وہ انقلابی سنڈیکیت اور اتحاد صنعتی کا براہ راست اور بلاواسطہ عمل ہے۔ سیاسی عمل کے مقابلہ میں صنعتی (معاشی) عمل کا آوازۂ جنگ فرانسیسی سنڈکلیوں سے بہت دور دور پہنچ گیا ہے۔ یہ امریکہ کی "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کی تحریک میں پایا جاتا ہے، اور برطانیہ کے "صنعتی اتحادیوں" اور گلڈ اشتراکیوں میں۔ اس کے حامی اکثر مارکس سے مختلف مقصد بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ جہاں ریاست ساری طاقت رکھتی ہو فرد کے لئے کبھی کافی آزادی نہیں ہو سکتی چاہے یہ ریاست اشتراکی ریاست ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں سے بعض سرتاسر نراجی ہیں اور ریاست کو مطلقاً معدوم دیکھنا چاہتے ہیں، دوسرے صرف اس کے اختیار میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے مارکس کی جو مخالفت پہلے سے نراجی طرف سے موجود تھی وہ بہت قوی ہو گئی ہے۔ ہم اگلے باب میں اسی مخالفت کی قدیم شکل سے بحث کریں گے۔

بھی پس پشت نہ ڈالنا چاہئے اور نہ مصارف کی کمی کا خیال ان خدمات عالیہ میں حائل ہونا چاہیئے! ..... اُس کو تعلیم کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام ترتیب دینا چاہئے جس کی امداد سے ملک کے ہر فرد کو اپنے نفس کی ان تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے جو قدرت نے اُس کے اندر ودیعت کی ہیں! ساتھ ہی اس کو مخصوص صورتوں میں غیر معمولی امداد و سرپرستی کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے!"

حکومت کے "حقوق و فرائض" کی اس فہرست کو آپ سنتے ہیں! مس میو کو جا کر کوئی خبر کر دے کہ ہندوستانی شوریدہ سر لیڈر ہی نہیں جو حکومت ہند سے تعلیم عامہ کے سارے بار کو برداشت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

عہد حاضر کے ایک سیاست داں کی نظر میں تعلیم ملکی کا جو اہم ترین نصب العین ہے اس کے بعض اطراف کو بے نقاب کرنے کے لئے ہم مسٹر فشر کی بعض دوسری تقریروں سے ایک آدھ اقتباس اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"زمانہ حال کی ہر دلعزیز تعلیم کا نظریہ ہے کہ ملک کے ہر مرد عورت کو فرائض شہریت کی بجا آوری کے لئے تیار کیا جائے۔ ان سب کو زندہ رہنے کا حق ہے، لیکن بعض کو اپنے ملک و ملت کی خاطر "تسلیم جاں" کا فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے! ہر متنفس کو خطرۂ جہالت وضلالت سے بچانے کی ضرورت ہے اور یہ کام حکومت کا فرض اولین ہے! واقعہ یہ ہے کہ یہ شے فرائض حکومت سے بھی اعلیٰ وارفع چیز ہے؛ تعلیم ایک شخص کا تمدنی مطالبہ ہی نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان کے اُس کا ایک پیدائشی حق ہے اور ایک فطری ضرورت ہے! ہر انسانی ہستی کا ایک جائز رجحان ہے، کہ صحیفۂ قدرت میں ہر شے جو قابل معرفت ہے اس کو جانے، ہر قابل استفادہ چیز سے متمتع ہو، ہر صحیح جذبے سے لطف اندوز ہو، اور ہر بشری امید سے اپنی تسکین قلبی اور تشفی روحانی کا مقصد حاصل کرلے!"

اپنی بریڈ فورڈ کی تقریر میں مسٹر فشر نے فرمایا :

" جس وقت میں نے قوم کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا تو میں یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ اور رنجیدہ ہوا - اور میرا یہ خیال ہے کہ بشرط مشاہدہ ہر دوسرا شخص بھی میرے اس احساس میں شریک ہوگا - کہ اب بھی برطانیہ عظمےٰ کے اندر لاکھوں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو انسانی زندگی کے اُن دلفریب عطیوں کو قبول کرنے سے معذور رہیں جو زندگی انکے سامنے پیش کرنے کے لئے تیار ہے! کتنے آدمی ہیں جو کتابوں سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتے ؟ کتنی بڑی تعداد ہے جو مصوری و موسیقی کی لذت بخشی سے ناآشنا ہے ! الغرض بشریت کا کتنا معتدبہ حصہ ایسا ہے جن کے لئے حیات انسانی کی وہ نعمتیں ناقابل فہم ہیں جو ہمارے دل و دماغ کی تربیت سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کے ہم گویا خالق معنوی ہیں! یہ لوگ ایک خشک میکانکی مشقت میں گرفتار رہیں، آہن و فولاد کی مشینوں سے پا بزنجیر ہیں - اُنکی تاریک زندگیاں شاعری کے کسی لمحہ منور سے روشن نہیں ہوتیں، اُنکی مادیات کے زنگ سے آلودہ دل کسی عین کی صیقل سے صاف نہیں ہوتے - دنیا اپنے دامن میں جو عظمتیں اور شوکتیں رکھتی ہے انکا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ان کو اتنی دماغی دلبستگی بھی نصیب نہیں کہ جن آلات اور مشینوں کو وہ حیوانوں اور مویشیوں کی طرح چلاتے ہیں انکے متعلق اُس علمی اصول اور فلسفیانہ کلیہ ہی کو معلوم کریں جو اس انسانی صنعتی کارگاہ کے اندر بطور روح رواں کے کام کر رہا ہے ۔ الغرض اُنکی مادیت میں کوئی روحانیت نہیں، انکی کثافت میں کوئی لطافت نہیں، اُنکی پستی میں کوئی بلندی نہیں، انکی ارضیت میں کوئی سمادیت نہیں، اور ان کو فطرت سادہ نے جو کچھ دیدیا ہے اُس میں اپنے انسانی عمل تخلیق سے کسی طرح کا اضافہ کرنیکی ان میں کوئی طاقت نہیں! میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہمارے لئے اس پر صبر کرنا ممکن ہے کہ زمین پر یہ سب چیزیں ممکن الحصول ہوں اور پھر بشریت کا ایک وسیع حصہ ان سے اس افسوسناک طریقے سے محروم رہے ؟ ! کم از کم ہم کو اپنا موجودہ پروگرام

اس طرح ترتیب دینا چاہئے کہ مستقبل کسی حد تک ہماری ماضی کی مجرمانہ کوتاہیوں کا کفارہ پیش کر سکے، اور ہم اس وقت اس خوشگوار توقع ہی سے اپنے قلوب کو کچھ تسلی دے سکیں کہ زمین کے دور آئندہ میں ایک ایسی دنیا تعمیر ہو سکے گی جو انسان پر اُن "نعمتوں کا اتمام" کرے گی جو پردۂ غیب اور عالم امکان میں اس کے لئے منتظر ہیں!"

دارالعلوم میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"وسیع مفہوم میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم اپنی قوم کو ملنے کے خواہشمند ہیں؟ بس یہی کہ وہ اچھے شہری بن سکیں، اپنے سارے حقوق و فرائض کو پہچانیں، صحیح الجسم ہوں اور صحیح الدماغ، اپنے تمام کاروبار و اعمال زندگی کو انجام دینے کی پوری تربیت و اہلیت رکھتے ہوں، اور اپنے فرصت کے لمحوں کو ذہنی دلچسپی اور تخلیقی لذت اندوزی میں تبدیل کرنیکا فن لطیف جانتے ہوں!"

مسٹر فشر اپنے زمانہ خدمت میں برابر تعلیم عامہ کے غیر معمولی طور پر اہم اور ناگزیر ہونے پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے سال بسال تعلیمی بحث کے لئے زائد از زائد رقوم طلب کیں، اور دوران جنگ کی نازک ترین حربی و سیاسی ضرورتوں کے مقابلے میں بھی تعلیمی مالیہ کی قطع و برید نہونے دی بلکہ اُس کے تدریجی اضافے کو حسب معمول جاری رکھا۔ تمامی صیغوں اور سررشتوں میں کفایت و تخفیف مصارف کے عالمگیر نعرۂ جنگ کے مقابلے میں انہوں نے کیا ہی خوب فرمایا۔

" میں بھی کفایت ہی چاہتا ہوں، اور نیز اضافۂ آمدنی۔ لیکن سمجھ لیجئے کہ کس چیز کا؟ انسانوں کا اور انسانیت کا جو ملک کی قیمتی ترین متاع ہے اور سب سے زیادہ قابل قدر جنس! آج اسی "انسانی سرمایہ" کی حفاظت ہمارے پیش نظر ہے! ماضی میں یہ دولت بے بہا بُری طرح تاراج ہوئی ہے۔ لیکن اب ہم اس کی بے بدل قدر و قیمت سے ناآشنا نہیں رہ سکتے!"

بلند نفس نشر کا تعلیمی نصب العین سنیئے :۔

میں مستقبل میں ایک ایسے معشر انسانی کے ظہور کا متمنی ہوں جس کے ہر فرد کو بلا قید جنس و عمر اور بدون امتیاز تمول و فقر دولت تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا! موجودہ غم آگیں و خجالت آفریں صورت حال یہ ہے کہ دولتمندوں کے ہاتھ میں قلم ہے اور غربا کے ہاتھ میں کُدال! "

مس میو ایک خالص برطانوی مشن پر ہندوستان آئی تھی۔ ہندوستان میں مسئلہ تعلیم پر جو گہر افشانی اس نے کی ہے اُس کے اندر یہ باطل کوشانہ روش بے نقاب نظر آتی ہے! وہ ہندوستان کی اصلاحات کی ثنا و صفت میں قدرۃً بہت رطب اللسان ہے اور اس بات پر اُس نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اصلاح یافتہ کونسلوں میں جبکہ چند دیگر امور کے علاوہ تعلیم عامہ کا شعبہ بھی صیغہ جات منتقلہ میں داخل کر دیا گیا ہے تو اب بھی اگر ملک میں رفتار تعلیم سست اور نشر علوم و معارف کا حلقہ تنگ رہے تو اُس کے لئے اہل ہند کو اپنے ہموطن وزرائے تعلیم ہی کا ممنون احسان ہونا چاہئے! مس میو نے ان الفاظ میں اپنے خبث باطن اور اپنے جہل مرکب دونوں کا ثبوت دیا ہے! اُس کو خبر نہیں کہ صوبجاتی حکومتوں میں طریق کار کیا ہے! وہ ہندوستانی وزرار کی بے بسی کو دیکھنے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی بشرطیکہ وہ بادنیٰ تامل ان سیاسی تماشا گاہوں کی جنگ ہائے زرگری کو دیکھنا چاہتی۔ ہندوستان کے ملت پرست عناصر "اصلاح یافتہ" کونسلوں میں صیغجات منتقلہ و غیر منتقلہ کے درمیان غیر مساویانہ و غیر منصفانہ تقسیم زر پر مسلسل و پر زور احتجاج کرتے رہے ہیں۔ میدان تعلیم کے اندر وزرار کوئی حقیقی اقدام ترقی کرنے سے معذور محض ہیں، اس لئے کہ روپیہ انتظامی کونسلوں کے ممبروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاہ و سفید کے مختار ہیں اور وزرار ہر وقت انکے دست کرم کے محتاج رہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کا وہ عجیب و غریب نظام حکومت جو امپیریل سروس کے موٹے

تازے صیغوں کے لئے بیک جنبش قلم ایک کرور روپیہ کے مزید عطیہ کا اعلان کرسکتا ہے اور جو سالانہ اسی کرور روپیہ کا گنج قارونی فوج پر بہاتا ہے، وہ اس وقت پورا انگلینڈ اور تہیدست ہوتا ہے جبکہ تعمیر قومی کے ان کارہائے نافعہ کے لئے رقوم کے تعین کا موقع آتا ہے جو غریب ہندوستانی وزرار کے سر تھوپے گئے ہیں!

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا!

مسٹر رچی، گورنمنٹ ہند کے کمشنر تعلیم کا پیام امید سنئے:

"مرکزی اور نیز صوبجاتی حکومتوں کی محدود مالیات کو دیکھتے ہوئے ملک کے اندر مستقبل قریب میں کسی عاجلانہ تعلیمی انقلاب پیدا کر لینے کی امید قطعاً خارج از بحث ہے!"

ہم انگلستان کی سی قسمت کہاں سے لائیں جس کے مایہ ناز فرزند فشر نے ملک کے سامنے پیہم اعلانات کئے کہ جنگ کے زمانے میں بھی تعلیم قومی کی راہ میں جو رقم صرف ہوگی وہ ایک "زر محفوظ" اور ایک "تاجرانہ لاگت" ہوگی! جس کے ضائع ہونیکا کوئی خوف نہیں ہے۔ تخفیف اخراجات کے ہمہ گیر شور شغب اور جنگ عظیم کی قیامت آفریں رستخیز کے درمیان وہ پورے سکون خاطر اور خوش انجامی کی کامل امید کے ساتھ کثیر المصارف اور گراں بار تعلیمی بجٹوں کی ترتیب و تیاری میں مشغول تھا! یہ فیاض منش برطانوی عاشق تعلیم شاید خودکشی کر لیتا اگر ہندوستان کی وزارت تعلیم کی کرسی پر متمکن ہوکر وہ مسٹر رچی کی زبان فیض ترجمان سے یہ دانش فروشانہ موعظت سنتا کہ:

"تعلیم عام کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے جس پر یلغار کرکے ہم اس تک جا پہنچیں!"

مسٹر فشر نے تعلیمات کے موضوع پر جو ارشادات فرمائے ہیں وہ اہل ہند کیلئے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان و برطانیہ کے آئینی تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے

وہ ہندوستان کے لئے مخصوص طور پر کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں ہر دوسرے ملک کے کسی اور ماہر تعلیم کے مقابلہ میں سٹرفنٹر کے افکار و تجاویز زیادہ مشعل راہ بن سکتے ہیں نشتر سلطنت کا وہ زبردست تعلیمی مرشد اعظم ہے جس نے اُن تعلیمی حقایق اور اُن تعلیمی کلیوں کو اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا ہے جو ہر خود دار اور ترقی دوست ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہیں۔ آہ! ہم ہندوستانی اپنے وطن کے اندر اپنے کاروان تعلیم کے خود سالار کارواں نہیں ہیں! ہمارے صوبجاتی وزرائے تعلیم کی ہستی ہمارے لئے اور بھی تلخ کامیوں اور حسرت آفرینیوں کا سبب ہے: صیغہ تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے، اور خزانۂ عامرہ کی کلید سرکاری رکن مجلس منتظمہ کی گرفت میں! اس صورت حالات کی ستم ایجادی قابل داد ہے!

از صحن خانہ تا بلب بام، از آنِ من　　　　وز سقف خانہ تا بہ ثریا، از آن تو!

اقوام عالم کے مختلف جدید العہد نظامات تعلیم کے مطالعہ کے بعد مسئلہ تعلیم قومی کے باب میں بعض اہم کلیات کا استخراج کیا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) قوم کا صیغۂ تعلیم اُس کے عسکری سررشتہ مدافعت وطنی کا ہمسر و ہم وقعت ہے آخر الذکر اگر چمن ملت کی بیرونی خاردار چار دیواری ہے تو اول الذکر اُس کے اندرونی گل و ثمر کی بہار ہے! ایک ترقی یافتہ قوم کی اشتہائے عالیہ کی غذا علوم و معارف ہی ہیں! قوم کے بام عروج پر پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ یقینی نردبان ترقی تعلیم ہی ہے!

(۲) قومی تعلیم کا بار گراں پرائیوٹ حوصلہ مندیوں کے دوش پر اٹھانیکی کوشش کرنا ناممکنات کو عملی جامہ پہنانیکی سی ہرزہ کاری ہے! اس میں شک نہیں کہ قومی تعلیم کے جہاز کی ناخدائی قوم کے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، لیکن ملک کا سارا خزانہ اور صیغہ مالیات کی کنجی انکے دوسرے ہاتھ میں ہونے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے!

(۳) یہ خیال کہ حکومت کو صرف ابتدائی تعلیم کی پرائیویٹ سرگرمیوں کی اپنی

مالی امداد سے سرپرستی کرنی چاہئے زمانے کے ساتھ رخصت ہوگیا ہے۔تازہ ترین اور صحیح ترین نظریہ یہ ہو کہ گورنمنٹ کا فرض تعلیم کی اولین منازل کی دستگیری پر ختم نہیں ہوجاتا۔قوم کی اقتصادی و مادی مرفہ حالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی وحرفتی تعلیم پر ہو اوران مہات سے سرکاری خزانہ ہی عہدہ برآ ہوسکتا ہو ایک دوسرا فریضہ حکومت کا اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ یہ جسم قومی کے اندر وسیع دل اور بلند دماغ پیدا کرتی ہے۔ ملک کے اندر ایسے زعمائے قوم جو قومی مشکلات وخطرات کی آزمائشوں میں ملک کے لئے "سالک باخبر" بن سکیں، اعلیٰ تعلیم ہی وجود میں لاسکتی ہو اور ایسے مخصوص افراد اسی شجر طیبہ کے گل و ثمر بنکر قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں۔پس تعلیم کا یہ شعبہ اس اہم ترین قومی ضرورت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

(۴) تعلیم کا یہی مفہوم نہیں ہے کہ قوم کے بچوں کو معمولی نوشت وخواند اور حساب وکتاب کے ابتدائی اصول سے آشنا کرکے چھوڑ دیا جائے۔اس کے مقاصد اس سے بمراحل زیادہ بلند اور وسیع ہیں: اس کے اندر قوم کے ہر نونہال کی جسمانی نشوونما، دماغی تنویر افکار، اخلاقی تہذیب نفس، اور روحانی تزکیۂ قلب سب ہی داخل ہے!

(۵) ملک کے ہر بچے کی ایسی تربیت جو اس کو قوم کا ایک فرزند رشید، ریاست کا ایک مفید شہری، دنیا کا ایک کامیاب آدمی، انسانیت کا ایک قابل فرد، اور عالم کا ایک شاندار انسان بنادے بغیر اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی کہ اس کار عظیم کو حکومت اپنے سارے وسائل مال اور اپنے جملہ ذرائع عزم وہمت کے ساتھ اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے!

ادبیات ایران کی ترقی میں
سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

یہ مقالہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ نے گذشتہ سال یوم تاسیس کے موقع پر شعبہ تاریخ کیطرف سے پیش کیا تھا۔ ہم اسے تین نمبروں میں شائع کریں گے پہلے دو نمبروں میں وہ حصہ جس میں ادب فارسی کی نشو و نما سلطان محمود غزنوی سے پہلے دکھائی گئی ہے اور تیسرے نمبر میں وہ حصہ جس میں سلطان کے ادبی ذوق اور اس کی علم دوستی کا ذکر ہے۔

ایران کی موجودہ زبان دراصل زمانہ مابعد اسلام کی پیداوار ہے اس سے پہلے جو زبان رائج تھی وہ پہلوی یا دری وغیرہ اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ ایران میں جب اسلامی فتوحات کا سیلاب آیا تو قدرتی طور پر عربی زبان بھی تمام ملک پر چھا گئی یہانتک کہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ایران کے تمام دفاتر بھی فارسی سے عربی میں ہو گئے چنانچہ اس زمانہ میں ایرانیوں کی جتنی تصانیف ہیں تقریباً سب عربی میں ہیں اہل عجم نے عربی میں اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ خود عرب انکا مقابلہ نہیں کر سکے ،اسلام کے مایہ ناز مشاہیر امام ابوحنیفہ ،نظام الدین طوسی ،امام بخاری ،امام مسلم ،امام غزالی ،سیبویہ ،جوہری ،بوعلی سینا ،قطب الدین رازی ،قطب الدین شیرازی ،عبدالقاہر وغیرہ سب ایرانی عجمی تھے ،ابن مقفع ایرانی الاصل تھا جس نے عرب میں تربیت پائی اسکی سی علمی و ادبی قابلیت کے لوگ ،خود عرب کی سرزمین میں بھی بمشکل پیدا ہو سکے۔ اُسکی بعض کتابوں ورۃ الیتیمہ۔ کلیلہ ودمنہ وغیرہ کا جواب باوجود سخت کوشش کے عربوں سے بن نہیں پڑا۔

علاوہ بریں ایک بڑا سبب ایران میں عربی زبان کی ترویج کا یہ ہوا کہ ایرانی زبان علمی حیثیت سے تقریباً تہی مایہ تھی[1]، چند مذہبی اور تاریخی کتابیں اس کے علمی و ادبی لٹریچر کی کل کائنات تھیں۔ برخلاف اس کے اسلام نے تھوڑی مدت میں ادب و انشا کے سرمایہ میں اس قدر ترقی اور علم و فن کی شاخ میں وہ تنوع اختراعات اور جدتیں پیدا کر دیں کہ ایک ایران پر کیا منحصر ہے تمام قوموں کو اس کے سامنے اپنا قدیم لٹریچر بے وقعت اور ہیچ نظر آنے لگا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ اقوام کے علوم و فنون کی درخشانی کو بالکل ماند کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مصر اندلس، افریقیہ وغیرہ کی اصلی زبانیں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں اور آخر کار عربی نے انکی جگہ لے لی غرضکہ عربی زبان نے ایرانی دل و دماغ پر بھی کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ اگر دو ایک صدی تک اور یہی حالت رہتی تو دوسرے ممالک کی طرح ایران کی زبان کا حشر بھی نہایت دردناک ہوتا لیکن یہ صورت حال کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔ تیسری صدی ہجری میں بغداد کی خلافت کو زوال شروع ہوا۔ بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے اور نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کا آفتاب اقبال بھی ڈھلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایرانی امرار و سلاطین اور ایرانی علما نے بھی اپنی زبان کی جانب توجہ کی لیکن دو صدیوں سے برابر عربی زبان کا سکہ رائج تھا اس لئے قدیم فارسی میں عربی الفاظ اس کثرت سے گھل مل گئے تھے کہ اصلی زبان بالکل متغیر ہو چکی تھی اور عربی فارسی

---

(۱) فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی زبان میں آیا اُس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ کا پتہ نہیں ملتا۔ یہانتک کہ نہایت کدوکاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا حالانکہ یونانی حکما مثلاً ارسطو افلاطون، بقراط اور جالینوس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے اسکی وجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ مسلمانوں کے زمانہ سے پہلے فارسی کا ذخیرہ اکثر برباد ہو چکا تھا (رسائل شبلی صفحہ ۲۱۸)

کی اس آمیزش سے ایک نئی زبان تیار ہوگئی تھی اور اگرچہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکال دینے کی بہت کچھ کوششیں ہوئیں لیکن ظاہر ہے کہ اسمیں کامیابی کیونکر ممکن تھی، فردوسی اس جدوجہد میں سب سے پیش پیش ہے شاہنامہ میں عربی الفاظ لانے سے اُس نے بہت احتراز کیا ہے پھر بھی اسے اس میں پوری کامیابی نہ ہوسکی۔ اور اب بھی یہی مخلوط زبان جدید تغیرات کے ساتھ ایران میں مروج ہے۔

فارسی شاعری کی ابتداء

ایران میں شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ یہ مسئلہ بہت مختلف فیہ ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ زمانہ قبل اسلام میں شعر شاعری کا وجود ہی نہ تھا بعض کا خیال ہے کہ شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا، بعض ایرانی تذکرہ نویسوں نے یہ بھی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ قدیم شعرا کی شاعری عربوں کے غلبہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس لئے کہ عربوں نے محض مذہبی تعصب کی بناء پر ایران کے کتب خانوں کو جلا ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کا تمام سرمایہ علم و ادب ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا اور قدیم فارسی شاعری بھی اسی آتش تعصب کی نذر ہوئی۔ لیکن اس خیال کی لغویت کو مولنا شبلی رسائل شبلی میں اچھی طرح ثابت کر چکے ہیں(۱) شعر العجم(۲) میں بھی ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا حضرت عمر کے زمانہ سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے حجاج کے زمانہ سے عربی میں ہوگئے۔ لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی ..... اور جب خود فارسی زبان

---

(۱) رسائل شبلی بعنوان "اسلامی کتب خانے" صفحہ ۳۶ - ۳۷ - ۳۸ - و بعنوان "تراجم" صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹

(۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲

سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا"

بہرحال یہ خیال بہت مضحکہ خیز ہے کہ فارسی لٹریچر کی بربادی کا سبب مسلمان تھا یہ محض قومی اور وطنی عصبیت کا نتیجہ اور واہمہ کی خلاقی ہے، شاعری کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایران میں شاعری مذہباً ممنوع تھی، المعجم میں اس کے متعلق ایک روایت بھی پائی جاتی ہے، مگر وہ نہ روایتاً قابل استناد ہے اور نہ درایتاً قابل تسلیم۔

اس مسئلہ پر مولٰنا عبدالرحمٰن صاحب مصنف مراۃ الشعر نے بھی اپنی تحقیقی رائے لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ ناظرین کے سامنے پیش کیجائے آپ "قدیم فارسی اور شعر" پر تبصرے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> . . . . کوئی کہتا ہے کہ فارسی میں شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا میں سمجھتا ہوں یہ عرب فاتحین کی رائیں ہیں اولاً انہیں مغالطہ ہوا سمجھے کہ فارسی شعر میں وزن نہیں ہے اور چونکہ خود اُنکے نزدیک وزن ضروری تھا اس لئے بعض نے کہدیا کہ فارسی میں شعر ہی نہیں اور یہی دوسرا مسلک بن گیا۔ عربی فارسی کتابوں میں کہیں کہیں فارسی شعروں کا ذکر آیا ہے لیکن اس قدر مجمل ہے کہ اُس سے صاف وصریح نتیجہ نکالنا آسان نہیں۔ لیکن میں اس اجمال و قرائن وقیاس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فارسی میں شعر تھا مگر اس میں عربی کی طرح وزن حقیقی اور لازمی نہ تھا، بیشتر وزن غیر حقیقی تھا اور عرب تھے وزن حقیقی کے عادی جب سننے والوں نے سنا تو اپنے شعر کے مقابلہ میں ناموزوں پایا، عاری از وزن کہدیا یہی نقلاً قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے اور یہی تقتضائے عقل بھی ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جس قوم کے جشنہائے عیش وعشرت کی آجتک عالم میں دھوم ہے جس کی کوئی بزم کوئی محفل نغمہ وسرود سے خالی نہ ہوتی تھی جس کی عبادت وپرستش میں بھی زمزمہ وسرود کو دخل نہ تھا، جس کی مٹی ہوئی زبان نے

بھی چامہ و چگامہ اور ترانہ جیسے متعدد الفاظ انواع شعر کے لئے باقی چھوڑے جس کی خوش مذاقی نازک خیالی ہمیشہ مسلم رہی جس کی ذہانت وطباعی کا ارسطو نے اعتراف کیا جس کی طاقت وتہذیب ایران وروم سے ٹکراتی اور ہندوستان کو دباتی رہی جس کے سیاسی وتجارتی تعلقات ان لوگوں سے رہے جن کے ہاں ہومر اور والمیک جیسے شاعر پیدا ہوئے اُس قوم میں از ابتدائے عروج تاانتہائے زوال شاعری نہ پیدا ہوا اور اسلامی فتوحات کے بعد عرب کے صدسالہ اختلاط سے اسی قوم میں شعروشاعری اس طرح پھیلے کہ بن میں آگ لگ جائے۔ اور ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آئیں یہ کیونکر سمجھ میں آجائے۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا کی فیصلہ کن تحریر بہت کچھ غور و توجہ کی مستحق ہے مصنف نے جس مجتہدانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ لائق ستائش ہے لیکن پھر بھی اگر ایک جویائے حق کو تسکین نہ ہو تو غالبًا مولنا بھی اُسے اس بات کا حق دیں گے کہ وہ تحقیق کا قدم اور آگے بڑھائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے قدیم ایرانی تذکرہ نگاروں کی تقلید میں کسی نہ کسی نہج سے سارا الزام عربوں ہی پر رکھا ہے کہ وہ چونکہ وزن غیرحقیقی کے عادی تھے اس لئے انہوں نے فارسی کی بے وزن شاعری دیکھ کر سرے سے ایرانی شاعری ہی سے انکار کردیا۔ لیکن یہ دعویٰ نقلی ثبوت کا بھی محتاج تھا جو افسوس ہے کہ کہیں نظر نہ آیا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی قسم کی غیر موزوں شاعری تھی جسے تسلیم کرنے سے اس طرح انکار کردیا گیا۔ اور پھر اس انکار کا اس قدر ناگوار اثر پڑا کہ وہ شاعری ہی سرے سے ناپید ہوگئی۔ اور آج قدیم شاعری کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں۔ یہ امر ہم پہلے گوش گزار کرچکے ہیں کہ قدیم فارسی لٹریچر کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے موجود نہیں، ہمارے سامنے ایران کی کوئی قدیم ترین تصنیف ہے تو وہ اوستا ہے۔ یہ زرتشت کی تصنیف یا وحی آسمانی ہے جو اُس پر نازل ہوئی

ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اوستا زرتشت کا کلام ہی نہیں اور بعض کے نزدیک صرف ایک باب (گاتا) اصل ہے اور ۲۱ باب الحاقی ہیں لیکن یہ ایک علٰحدہ بحث ہے اور ہمارے موضوع سے خارج اسلئے ہم سردست اس میں پڑنا نہیں چاہتے اور تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ساری کتاب زرتشت کی لکھی ہوئی ہے ہمارا خیال ہے کہ یہی ایک کتاب کسی قوم کی دماغی ترقی، طباعی نازک خیالی اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن آئیے ہم آپ کو بتائیں ایک یورپین مستشرق کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، پروفیسر براؤن "اوستا" پر تبصرہ کے دوران میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"تاریخی حیثیت سے یا زرتشت کے عقائد کا مرقع اور قدیم مذہب کی مقدس یادگار ہونیکے لحاظ سے یہ کیسی ہی کارآمد کتاب ہو مگر نہ تو یہ خوشگوار ہے اور نہ دلکش ہے اپنی نسبت تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرف قرآن کو جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں لطف بڑھتا جاتا ہے اور شوق سے اسکا مطالعہ اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں دوسری طرف اوستا کا مطالعہ بد مزگی اور تنغص پیدا کرتا ہے اور یہ کیفیت مزید مطالعہ کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے کچھ لوگ تحصیل زبان تحقیق مذاہب دریافت آثار قدیمہ کی غرض سے اور بعض لوگ الہامی کتاب سمجھکر بھی اسے پڑھ تو لیا کرینگے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں کہ اس کا ترجمہ خواہ کیسا ہی دلچسپ کیا جائے معمولی طبیعت کے کتب بیں جو کتابیں دلچسپی کے لئے پڑھا کرتے ہیں شروع سے آخر تک پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے"

صرف یہی نہیں بلکہ زرتشت کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد خود زرتشتی عالموں اور موبدوں کے لئے یہ ایک لاینحل معمہ بنکر رہگیا۔ نظام الملک طوسی نے مزدک کی بحث میں لکھا ہے۔

مزدک گفت مرا فرستادہ اند تا دین زرتشت تازہ گردانم کہ خلق معنی ژند و اوستا فراموش کردہ اند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موبدان گفتند در ژند و اوستا سخنان است کہ

ہر سخن دہ معنی دارد و ہر موبدے و دانائے را در و قولے و تعبیرے "

مولانا مسلم عظیم آبادی نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اسکا سبب تاخت اسکندری کے علاوہ ایرانی طرز تحریر کا نقص اور اہل ایران کی علم سے بے نیازی تھا۔ عہد اسکندری سے حکمت یونان کی جو کچھ روشنی ایران میں پہنچنے لگی تھی۔ وہ بھی بہت جلد حکومت ایران کے زوال کے ساتھ زائل ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران مختلف زمانوں میں مختلف تمدنوں کے زیر اثر رہا اسی طرح طرز تحریر بھی بدلتا رہا۔ پہلے آرامی پھر سیخی، اور پھر پہلوی اسی کا نتیجہ تھا زبان میں عجیب خلط ملط ہوگیا، اوستھا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہوا شرحیں لکھی گئیں، مگر پھر بھی اصل مشکل آسان نہ ہوسکی اسی اخلاط کیوجہ سے زبان میں یہ خرابی پیدا ہوگئی، لکھتے کچھ تھے اور پڑھا کچھ اور جاتا تھا، مثلاً زنا کو آن۔ ملکان اور ملکا کو شہنشاہ من کو از لحمہ کو نان بسرہ کو گوشت وغیرہ وغیرہ۔ ابن مقفع کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں پانچ مختلف زبانوں اور سات مختلف رسم الخط کا خلط مبحث تھا ہر طبقہ کے لئے علیحدہ علیحدہ زبانیں مخصوص تھیں۔

ایسی تحریر اور طرز تحریر جس کی اس قدر ناگفتہ بہ حالت ہو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کیونکر کسی لٹریچر کی حامل ہوسکتی تھی، شاعری کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے فاضل مؤلف "مراۃ الشعر" اپنے قیاسی دلائل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں "۔ . . . . جس کی مٹی ہوئی زبان نے بھی جامہ جنگامہ اور ترانہ جیسے الفاظ باقی چھوڑے" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ قدیم ایرانی زبان کے بقایا ہیں۔ غالباً مولانا آزاد کا بھی یہی خیال ہے لیکن مولنا مسلم عظیم آبادی اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انہیں ہمیشہ سے غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا

متمنی اور ساعی رکھا ہے ..... محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا
اُس نے اپنی ایک کتاب "عمل صالح" میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ
خالص پارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جسکا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ کے لئے چکامہ۔ غزل کے لئے چامہ
ردیف " پساوند۔ وزن شعر " دم
نثر " پراگندہ نظم " پیوستہ
تخلص " داغ

ایرانیوں کی خوش مزاجی نازک خیالی اور ذہانت وطباعی سے کسے انکار ہے۔
اس حقیقت کو بھی ہم آشکارا کر چکے ہیں، کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایرانیوں نے
عربی ادب اور علوم وفنون حتیٰ کہ مذہب کی بھی خود عربوں سے زیادہ خدمت کی لیکن اس
سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران خود بھی علوم وفنون کا سرمایہ دار
تھا۔ جناب مسلم عظیم آبادی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں۔

"فارسی روایات کے مطابق سکندر نے جب ایران فتح کیا تو مجوسیوں کی دینی
کتابیں تلف کر دیں، باقی کتب فلسفہ، نجوم، طب، زراعت وغیرہ وغیرہ
ڈھونڈھ ڈھونڈکر اسکندریہ اور یونان اٹھوا لے گیا اس طرح ایران کی جو کچھ متاع
علم تھی مرکز علم کو منتقل ہو گئی پانچ صدیوں کی گھٹاٹوپ تاریکی نے قدرۃً عجم کا
دماغ کند بنا کر اُسے وحشت وجہالت کی پستی میں گرا دیا۔ اور علوم وفنون تو الگ
رہے، مذہب بھی بھلا بیٹھے۔ ساسانی عہد میں بعض الوالعزم بادشاہوں نے
احیاء علوم کی کوشش کی مگر وہ نسبتۃً ایسی حقیر ہے کہ مصر و یونان کے مقابلہ
میں انکا نام نہیں لیا جا سکتا۔ مزمن جہالت کے علاوہ خط کی دقت نے پارسی
علوم کو پنپنے نہیں دیا۔ جس دن مالدار زبان عربی نے اپنے وسیع خزانے

سے انکو لغات دئے۔ اور لغات کے ساتھ آسان خط مہیا کر دیا۔ اُنکے دماغ
کی مہر ٹوٹ گئی۔ اور زبان چل پڑی، خود قرآن شریف ایک عظیم الشان لٹریچر
ہے عربی شاعری کے اعلیٰ نمونے اُنکے سامنے آئے "
ایک مستند فارسی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

چوں آفتاب ملت حنیفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت لطیف طبعان
فرس را با فضلائے عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضائل ایشاں اقتباس
کردند و بر اسالیب لغت عرب وقوف گرفتند۔ و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند
بہ غور آں فرو رفتند و بر حقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند و ہم بر آں منوال
نسائج فضائلے کہ نتائج طبع ایشاں بود یافتن گرفتند۔

(قلعہ دہلی کے)

میوزیم پر ایک عام نظر

پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ۱۸۶۶ء میں دہلی میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال کے کسی کمرہ میں ایک میوزیم قایم ہوا تھا جس کے بانی ایف ایچ کوپر ڈپٹی کمشنر دہلی تھے، مگر اس میوزیم کی بنیاد کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں رکھی گئی۔ نہ تو یہ کوشش تھی کہ دنیا کی تمام چیزیں جو آج عجیب سمجھی جاتی ہیں یا کل سمجھی جائیں گی، مہیا کیجائیں اور نہ چیزوں کو جمع کرتے وقت یہ خیال پیش نظر تھا کہ اس میں وہی چیزیں لائی جائیں جو کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ قدیم بدھ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ جے پور کی مورتیاں، فنون لطیفہ کی نادر اشیاء کے ساتھ ساتھ بچوں کے کھلونے اور اسی قسم کی صدہا چیزیں تھیں جس سے یہ میوزیم معجون مرکب بن گیا تھا، چنانچہ ایک موقعہ پر محکمہ آثار قدیمہ کے ایک فاضل افسر نے جب اس میوزیم کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میوزیم ایک (Rowling) وحشتناک جنگل ہے (Wilderness) موصوف کے یہ الفاظ بے شبہ ہمارے اس مفہوم کی کافی توضیح اور اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، میوزیم کی یہ شکل کچھ تو ان اسباب سے اور نیز اس وجہ سے بھی کہ کوئی ماہر فن منتظم میوزیم کو ایسا میسر نہ آیا کہ وہ اس کی باقاعدہ تشکیل پیش کر سکتا، ۱۹۰۱ء میں محکمہ آثار قدیمہ کیطرف سے موجودہ وائسرائے لارڈ کرزن کی توجہ میوزیم کیطرف مبذول کرائی گئی، مگر اس درخواست کا بجز اس کے کوئی نتیجہ نہ ہوا کہ اس کا کام محکمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں پھر جان مارشل نے (جو محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے) یہ تجویز پیش کی کہ نوبت خانہ یا نقار خانہ میں ایک تاریخی عجائب خانہ ہو جسمیں دہلی قلعہ کی

تاریخ سے متعلق چیزیں رکھی جائیں، لارڈ کرزن نے اس تجویز کو پسند کیا لیکن اس مرتبہ بھی سنہ ۱۹۰۱ء تک کوئی عملی قدم نہ بڑھایا گیا بے توجہی اور بے پروائی کے اس عالم میں یہ پرانا عجائب خانہ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ کوئی نیا عجائب خانہ بھی نہ قایم ہوسکا سنہ ۱۹۰۱ء میں اس پرانے میوزیم کے ٹوٹ جانیکے بعد ارباب نظم ونسق کچھ ہوش میں آئے اور جنرل مارشل کی پرانی تجویز اس سال زیر عمل آنا شروع ہوئی - غیر متعلق چیزیں جو اس جدید میوزیم کے دائرہ مقاصد سے باہر تھیں وہ دوسری جگہوں پر جہاں وہ رکھی جاسکتی تھیں بھیجدی گئیں، بدھ کے قدیم مجسمے اور نیز اسی قسم کے دوسرے بت لکھنؤ اور لاہور کے عجائب خانہ میں جینیوں کے تین بت متھرا میں اور علاوہ انکے اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی ادہر اُدہر منتقل کردی گئیں اور از سر نو سنہ ۱۹۰۱ء میں تاریخی اشیاء کا ایک عجائب خانہ نوبت خانہ (قلعہ میں) میں قایم کیا گیا، اور ابھی دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ قلعہ کی ایک دوسری عمارت ممتاز محل میں یہ عجائب خانہ منتقل کردیا گیا، اس عجائب خانہ میں جیسا کہ بتایا جاچکا ہے زیادہ تر قلعہ دہلی سے متعلق تمام چیزیں بہم پہنچائی گئی ہیں کچھ تو شاہان دہلی کے اسباب اور سامان ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہاتھ آئے کچھ انکے اور انہیں کے متعلقین کے آلات اور ہتھیار، کچھ تاریخی پتھر جن پر کندہ کی ہوئی تحریریں ہیں، کچھ شاہی مہریں ہیں اور کچھ فرامین اور اسناد، تصویریں بھی ہیں زیادہ تر شاہان مغلیہ اور انکے درباریوں کی، قلعے کے اندر اور باہر کی عمارتوں کے نقشے بھی ہیں جن میں سے اکثر شاہی عمارتیں یا ان سے متعلق دوسری عمارتیں ہیں، قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جو کل کی کل شاہی کتب خانہ سے متعلق تھیں اور بہترین خطاطوں کے خوشخطی اور خوشنویسی کے نمونے بھی جن میں سے اکثر کا تعلق قلعے سے ضرور تھا - یہ سب چیزیں نو حصوں میں تقسیم کیجاسکتی ہیں، فرنیچر[۱] اور نیز دیگر سامان، ہتھیار[۲] اور آلات، مہریں[۳] اور کتابت، فرامین[۴] اور اسناد، ڈرائنگ[۵] اور عکسی تصاویر، نقشے[۶]، قلمی تصویریں[۷]، قدیم[۸] مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں، بہترین[۹] خطاطوں کے خوشنویسی کے نمونے،

یوں تو تاریخی حیثیت سے ان میں کی ہر ہر چیز اپنی جگہ پر کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتی ہے، مگر باوجود اس کے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی نوعیت میں زیادہ عجیب یا تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، شاہی اسباب اور سامان کا وہ تاریخی اور قیمتی قالین جو اپنی صنعت و بناوٹ میں بیمثل ہے اور جس کو کبھی دلی کے آخری تاجدار کے زیر دست ہونیکا شرف حاصل تر تھا آج تقریباً اسی حال میں باقی ہے، اور اسی بادشاہ کا وہ زرق و برق لباس بھی جس سے اس زمانہ کے طرز لباس اور پوشش کا پتہ چلتا ہے، زینت محل کے بعض سونے اور موتیوں کے زیورات بھی موجود ہیں اس سکشن کی زیادہ عجیب و غریب چیز جو میوزیم کی زینت ہے وہ اورنگزیب کا فلٹر ہے جس کو وہ اپنے شاہی دورے پر استعمال کرتے تھے جہاں صاف پانی ملنے کا امکان نہ ہوتا وہاں پانی اس فلٹر میں بھر دیا جاتا اور صاف ہوکر اس کے باریک سوراخوں سے باہر گرتا، یہ فلٹر صرف پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنایا گیا ہے، جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

"آب متقطر سنگ صافی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۰ھ"

ہتھیار اور آلات میں زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی علی مردان خاں کی تلوار ہے۔ تلوار پر سنہری نستعلیق حروف اور فارسی زبان میں دو عبارتیں کندہ ہیں، ایک دستہ کے سطح پر اور دوسری پشت پر، پشت پر یہ عبارت کندہ ہے، ایں شمشیر خاص از حضور عباس خلداللہ ملکہٗ و سلطانہٗ بخانہ زاد علی مردان خاں سرفرازی یافت،

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تلوار فارس کے بادشاہ عباس صفوی کیطرف سے (جن کا عہد حکومت ۱۵۸۶ء تا ۱۶۲۹ء تک رہا ہے) علی مردان خاں کو ملی تھی، علی مردان خاں جنکا اصل نام علی مردان بیگ ہے گنج علیخاں کے بیٹے تھے۔ گنج علیخاں شاہ عباس صفوی کے وفادار نوکر تھے انہیں ارجن بابا کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور یہ پہلے کرمان کے پھر قندھار کے حاکم بنائے گئے، باپ کی وفات پر علی مردان خان کو خان بابا ثانی کا خطاب مرحمت ہوا تھا، لیکن اس کے کچھ سال بعد شاہ عباس صفوی کی جگہ پر انکے پوتے گدی پر

متمکن ہوئے۔ علی مردان خاں نے انکی بیجا سختیوں سے ملول ہوکر شاہجہاں کو قندھار کا علاقہ سپرد کردیا اور خود دہلی شاہجہاں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے یہاں انکی بڑی آؤ بھگت ہوتی شاہجہاں کی طرف سے امیرالامرار کا خطاب ملا اور اس حالت میں جبکہ وہ پناہ گزیں تھے یہ تلوار ہندوستان بھیجی گئی، کچھ دن علی مردان خاں کے پاس تھی کہ اس کے بعد یہ تلوار نواب اودھ سعادت علیخاں کے قبضہ میں آئی جنہوں نے اس پر ۱۲۱۹ھ میں یہ عبارت کندہ کرائی۔

یاعلی العلی

وزیرالملک نواب سعادت علیخاں بہادر ۱۲۱۹ھ

شاہجہاں کی بھی ایک تلوار مع نیام اور پیٹی کے موجود ہے جو اپنی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے اس کے دستے پر ۹۹ نام خدا کے سنہرے حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں ایک اور عبارت سنہرے حرفوں میں کندہ ہے جس سے شاہجہاں کی تلوار ہونیکی تصدیق ہوتی ہے۔

عبارت: لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

ہست ایں شمشیر خاص ثانی صاحبقران شاہ غازی بادشاہ بحروبر شاہجہاں ل ۱۷ ص ۱ ان ۲۸ نصرت بخش

نصرت بخش کے متعلق عام خیال ہے کہ یہ اس تلوار کا نام ہے، ایک خنجر ہے جو شاہ طہماسپ شاہ ایران کا ہے یہاں رکھا ہوا ہے اس پر جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفر شاہ کاشانی کا بنایا ہوا ہے۔

عمل مظفر کاشانی

فیضی کا لکھا ہوا ایک کتبہ جس کا پتھر ایک قدیم مسجد سے لایا گیا ہے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسجد جواب بالکل شکستہ حالت میں پڑی ہے دلی دروازہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مغل طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے بانی صدر جہاں شیخ عبدالنبی تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کی اولاد سے تھے اور اکبر کے دربار میں بڑا ممتاز درجہ

رکھتے تھے، یہ کتبہ اسی مسجد کا ہے جس کی لمبائی ۳ فٹ ۶ انچہ اور چوڑائی دو فٹ ½ ۲ انچہ ہے۔ عربی قطعہ فیضی کا کہا ہوا خط نسخ میں کندہ ہے جس سے فیضی کی عربی شعر گوئی کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے اور مسجد کی تاریخی نوعیت کا بھی۔

فی زمان الخلیفہ الاکبر	ابد اللہ ذاتہ انتفاع
قد بنی بقعۃ مقدسۃ	مثلہا لایکون فی الاقطاع
شیخ الاسلام زائر الحرمین	شیخ اہل الحدیث بالاجماع
شیخ عبدالنبی نعمانی	معدن العلم منبع الانفاع
سال تاریخ این بنا فیضی	سال العقل قال خیر بقاع

شاہی فرامین اور اسناد میوزیم کی اہم ترین چیزوں میں سے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے انکا ہر ہر لفظ قابل مطالعہ ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ان مورخین کے لئے جو ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تصویروں میں علاوہ شاہان دہلی کی ان تصویروں کے جو مختلف وقتوں اور مختلف حیثیتوں سے بنائی گئی ہیں ایک ایرانی خاتون کی تصویر قابل دید ہے، یہ تصویر معین مصور کی بنائی ہوئی ہے، مصور نے سادگی اور بھولے پن کا نقشہ تصویر میں نمایاں کیا ہے جس سے یہ تصویر حد درجہ دلکش اور جاذب ہوگئی، ایک اور تصویر جس میں افیونیوں کی ایک صحبت دکھائی گئی ہے حد درجہ مضحک ہے دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آتی ہے، ان لوگوں کی صورت ڈراونی ہے، گردن پتلی پتلی، ہڈیاں اُبھری ہوئی، گال پچکے ہوئے حقہ ہر ایک کے سامنے رکھا ہوا ہے پینک میں اونگھ رہے ہیں اور منہ سے حقہ لگا ہوا ہے بعضوں کے سر اونگھتے اونگھتے زمین تک پہنچ چکے ہیں، اور اسی بیہوشی کی حالت میں بدن کا کچھ حصہ بھی کھل گیا ہے، غالب اور کبیر داس کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الدین اولیا اور دوسرے صوفیائے کرام کی تصویریں اچھی کھینچی گئی ہیں، اکبر ثانی کا ایک جلوس بھی جس سے اکبر کے شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے

بہت خوب دکھایا گیا ہے ایک اور تصویر بہادر شاہ ثانی آخری تاجدار دہلی کی ہے جب کہ وہ بستر مرگ پر ہیں، یہ تصویر بہت موثر ہے۔

قلمی کتابوں میں جو سب کی سب شاہی کتب خانے سے متعلق تھیں خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ایک نسخہ جو باعتبار اپنی قدامت اور عمدہ کتابت کے ایک امتیازی شان رکھتا ہے کوفی اور نسخ خط کے درمیان لکھا گیا ہے شروع کے دو صفحے سنہرے حرفوں میں ہیں حاشیہ رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے، شاہنامہ فردوسی کا ایک قدیم اور مصور نسخہ (دو جلدوں میں) جو شاہی کتب خانہ کی خاص کتاب تھی یہاں موجود ہے۔ ایک اور قلمی نسخہ بختاور خاں کی بیاض ہے اس میں کچھ تو خود انہیں کے کہے ہوئے اشعار اور کچھ مستند شعرائے فارسی کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے یہ کتاب ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء کی لکھی ہوئی ہے، جس کے لکھنے والے مختلف مشہور خطاط ہیں، میوزیم کا ایک اور دلچسپ شعبہ وہ ہے جس میں مشہور اور ممتاز پرانے کاتبوں کی خطاطی کے نمونے ہیں ان خطاطوں کے ناموں کی فہرست جن کی تحریریں میوزیم میں محفوظ رکھی گئی ہیں طویل ہے، لیکن خاص طور پر عبدالرحیم فرمان نویس، میر علی تبریزی، عرب شیرازی، میر علی الکاتب، میر محمد باقر قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم[1] فرماں نویس کے ہاتھ کا ایک فرمان عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا میوزیم میں محفوظ ہے۔ فرمان پر ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ میر[2] علی تبریزی کا بھی ہے، عرب شیرازی کی لکھی ہوئی ایک دعائیہ

---

(۱) عبدالرحیم جہانگیر کے دربار کا خاص فرماں نویس تھا جو آقا عبدالرشید مشہور خطاط کے شاگرد تھے قطعہ اور فرمان میں دوسرے خطاطوں کی نسبت سے انکے خط میں متانت زیادہ ہوتی تھی، ان کو عنبریں قلم کا خطاب ملا تھا

(۲) میر علی تبریزی امیر تیمور کے زمانہ کے مشہور خطاط تھے۔ خط نستعلیق کے متعلق کچھ اصول انہوں نے بنائے جس سے آپکی کافی شہرت ہوئی اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خط نستعلیق کے موجد تھے۔

نظم[1] ہے جو خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہے یہ عبداللہ قطب شاہ آخری حکمران گولکنڈہ کے لئے ۱۰۴۲ھ - ۱۶۳۲ء میں لکھی گئی ہے -

میر علی[2] الکاتب کا بھی خوشنویسی کا ایک نمونہ موجود ہے اور میر محمد[3] باقر کا بھی -

یہ ایک مجمل خاکہ ہے میوزیم کے اس مفصل نقشے کا جو ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں - انشاء اللہ ہم ہر حصے پر الگ الگ نظر ڈالیں گے اور ان تمام تاریخی جواہر پاروں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں گے جو اس خزانے میں محفوظ ہیں -

---

(۱) نظم :-   تا بود بر سپہر گردندہ   در جہاں پادشاہ عبداللہ
ماہ تاباں و مہر تابندہ   دشمن شاد باہ با غم و آہ

(۲) میر علی الکاتب ہرات کے سادات سے ہیں باپ کا نام محمود ہے، یہ میر علی سلطان کے شاگرد ہیں عربی فارسی کے اچھے عالم اور شعر گوئی میں بھی باکمال تھے انہوں نے اپنا تخلص مجنوں رکھا تھا، کچھ دن بخارا میں سکونت اختیار کرنیکے بعد ادہر ادہر مختلف مقامات میں گھومتے رہے، یہ ایک مشہور خطاط تھے انکے زمانے کی جو بہترین تحریریں اب ملتی ہیں عام طور پر انہیں کی طرف منسوب کیجاتی ہیں، چنانچہ غلام محمد ہفت قلمی اپنی کتاب تذکرہ خوشنویساں میں انکے خط کی تعریف میں لکھتے ہیں

.... گلشن خط را رنگ و بوے تازہ و رونق بے اندازہ دادہ، مشام عالم را از ریاض ریاحین خط خود معطر ساخت و در اصول و صفا از ہمہ خوب تر نوشت،

انکی منظوم خطوط سبعہ جس کو کہ سلطان مظفر کے صاحبزادے کے لئے کیا تھا بہت مقبول ہوئی۔

(۳) میر محمد باقر عالمگیر کے خوشنویس ہیں، بادشاہ کو انکا خط بہت پسند تھا جیسا کہ اکثر رقعات میں اسکا تذکرہ کیا ہے، عالمگیر انکو استاد اور والا جاہ کے لقب سے سرفراز فرماتے تھے۔ غلام محمد نے انکے خط کی تعریف اپنے ان الفاظ میں کی ہے۔

خط ایں عزیز بسیار شیریں و دلچسپ و مضبوط بنظر در آمد۔

مذاہب اسلامی کی ابتدا

مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے عقاید کے مختلف تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی حلقوں میں اکثر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما چند خارجی اثرات کے ماتحت ہوا ۔ ممکن ہے بعض لوگ اس رائے کو پسند کریں اس لئے کہ بدعات و فتن کے ظہور اور مختلف فرقوں کی ضلالت اور بے رہ روی کی توجیہ کے لئے یہ ایک عمدہ نظریہ ہے لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کے عاجلانہ مفروضات علمی تحقیقات کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذاہب اسلامی میں بے شمار خارجی عناصر موجود ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ابتدا بھی خارجی اثرات کا نتیجہ ہے ۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمدن اسلامی کا آغاز بھی خارجی اثرات سے ہوا ۔ تمدن اسلامی میں ان اجزا کی کمی نہیں جو کسی نہ کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ ہیں بایں ہمہ کوئی شخص بھی اسلامی تہذیب و تمدن کی جدت و بداعت سے انکار نہیں کر سکتا ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی تحریک میں خارجی عناصر موجود ہوں اور وہ خارجی تہذیبوں کے زیر اثر رہی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سرچشمہ خود اسی کی ذات میں پوشیدہ ہو ۔ بعینہٖ یہی کیفیت مذاہب اسلامی کی ہے ۔ واقعات پر جس قدر غور کیا جائے اُسی قدر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ مذاہب اسلامی کی ابتدا ان داخلی اسباب کی بنا پر ہوئی جو دین اسلامی میں از خود رونما ہو گئے تھے ۔ کچھ ان قدرتی سوالات کی وجہ سے جو انسانی طبائع میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور کچھ اس ربط و ضبط کے باعث جو جماعت اسلامی کے مختلف اور متضاد عناصر میں پیدا ہوا ۔ علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ جب تک خود ملت اسلامیہ کے داخلی شئون اور تعلیمات قرآنی کے اندر اصولی اور عقلی مباحث کا امکان نہ ہوتا محض خارجی اثرات کی بنا پر اسلامی دینیات کا آغاز ہو جاتا ۔ خارجی اثرات نے بعض مذہبی تحریکات پر اپنا نقش چھوڑا ہے اور ایک حد تک ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے لیکن ان کا موجب نہیں ہوئے

پھر جن اثرات کو ہم 'خارجی' قرار دیتے ہیں ان میں سبھی خارجی نہیں۔ اگر بعض مسلم اقوام نے اپنے فطری رجحانات کے مطابق چند دینی مسائل کی ابتدا کی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسائل جماعت اسلامی کے غور وفکر کا نتیجہ نہیں تھے۔ اگر عرب ان افکار سے ناآشنا تھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دینیات اسلامی کا نشو ونما عربوں ہی کے حصے میں نہیں آیا تھا نہ یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی توجہ صرف انہی مسائل پر رہتی جو عربی مذاق کے مطابق تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا علم و حکمت سے خالی نہیں تھی۔ ضرور تھا کہ دنیائے قدیم کا یہ علمی ترکہ مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتا۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ جماعت انسانی کے عقلی اور مذہبی مسائل نے اس زمانے میں کیا صورت اختیار کی۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ قدیم افکار کا کس قدر حصہ خود بخود اسلام میں منتقل ہو گیا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے اسلامی دینیات کے آزادانہ نشو ونما میں کوئی فرق نہیں آتا۔ باعتبار زمانہ اسلام کا ظہور ایک خاص وقت پر ہوا اور اس وقت آب و گل کا جو بھی سرمایہ موجود تھا اُس سے اسلام نے اپنی زبردست قوت تخلیق کی بدولت ایک نیا عالم تعمیر کیا۔ یہی وہ جانفزا تحریک تھی جس سے دنیائے قدیم کے مردہ جسد میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی عنان توجہ علم و عمل کی مختلف ضروریات کی طرف موڑ دی۔ مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں میں اسی ایک جذبے کی کارفرمائی ہے۔ بغیر اس کے نہ مشرق کی مردہ اور تارک عمل اقوام میں زندگی کی کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی نہ یونانی افکار اور ایرانی ادارات میں اس قدر قوت باقی رہ گئی تھی کہ کسی جدید اور زبردست روحانی تحریک کے بغیر ان کو از سر نو زندہ کیا جا سکتا۔ بہرکیف اسلام کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ میں ان علمی اور عملی محرکات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے جو اسلام کی اندرونی قوت کا نتیجہ تھے اور جنہوں نے اسلامی افکار و آراء کے نشو ونما میں مختلف اسباب کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اس اعتبار سے ہم مذاہب اسلامی کے متعلق چند ایسے حقائق کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان کی ابتدا و آغاز کا مسئلہ صاف ہو جائے گا۔

مدینہ منورہ میں ابتدا ہی سے دینیاتی بحثوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

شروع شروع کے یہ سب مسائل فقہی بحثوں سے متعلق تھے لیکن اس زمانے میں بھی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو معراج کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف الرائے پاتے ہیں[۱]۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا وقدر کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے اور ان کا آپ نے جواب بھی دیا[۲]۔ عربوں کے علمی رجحانات کے باوجود ان میں اس قسم کے مباحث کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ لیکن اگر شروع شروع میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا گیا تو محض اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی اثر کی بدولت ان کے دلوں پر مذہب کی حقیقت کچھ اس طرح جاگزیں ہو گئی تھی کہ اگر ان کے ذہن میں اس قسم کا کوئی سوال پیدا بھی ہوتا تھا تو ایمان و اعتقاد کے متعلق کسی موشگافی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ پھر عرب اپنے قومی اور اجتماعی مسائل میں اسطرح منہمک تھے کہ اس وقت نظری امور پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ باوجود اس کے یہ بالکل ممکن تھا کہ خود عرب ان تمام مباحث کی طرف توجہ کرتے جو کسی عقیدے کے تسلیم کر لینے سے از خود پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی نہایت سادہ تھی لیکن وہ اپنے گرد و پیش کے افکار سے بے خبر نہیں تھے۔ تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے[۳]۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم

---

[۱] شبلی: الکلام، حصہ اول صفحہ ۱۴: ۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے معراج میں خدا کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں ہرگز نہیں دیکھا تھا۔

[۲] سید امیر علی: Spirit of Islam بحوالہ احتجاج الطبرسی:۔ امیر المومنین سے ایک روز قضا و قدر کے معنی پوچھے گئے۔ آپ نے فرمایا قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کا اتباع اور گناہ سے اجتناب اور قدر کا مطلب ہے پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت...... نہ یہ کہو کہ انسان مجبور ہے ...... اور نہ یہ کہ قادر ہے، ملاحظہ ہو دسواں باب صفحہ ۴۰۱ تا ۴۰۹۔

[۳] "تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری...... کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے انہوں نے چار و ناچار قسمت کے سامنے سر جھکا رکھا تھا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا تھا۔ تعلیمات اسلامی سے ان کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا ہوا...... اور انہیں اخلاقی ذمہ داریوں (دیکھو صفحہ آئندہ)

ہوتا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل عربوں میں یہ خیال پیدا کیا — اور یہ وہ خیال ہے جس کی جاہل سے جاہل شخص سے لیکر بڑے سے بڑے عالم کو ہمیشہ ضرورت رہیگی — کہ قضائے الٰہی کے اٹل اور غیر متغیر نظام کے ساتھ انسان کی ذاتی نجات اس کے اپنے عمل سے وابستہ ہے۔ اس سے طبائع میں جہد و توکل کے دوگونہ خصائص پیدا ہوئے اور عربوں نے محسوس کیا کہ جس چیز کو وہ اپنی مجبوری کا ایک ناگوار سبب سمجھتے تھے وہی اُن کے لئے امید اور قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا۔ لیکن خیالات کا یہ انقلاب جس تیزی کے ساتھ رونما ہوا تھا اُس کے سبھی متحمل نہیں ہو سکے۔ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض متجسس یا نفاق انگیز طبائع جبر و اختیار کے اس ظاہری تضاد سے کچھ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئیں۔ یہ لوگ حکم الٰہی کے متعلق طرح طرح کے شبہات ظاہر کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بڑی سختی کے ساتھ فہمائش کی کہ قضائے الٰہی سے انکار کرنا کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں لیکن ان حدیثوں میں بھی جن میں وجوب تقدیر کی شدت کے ساتھ حمایت کی گئی ہے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر برابر زور دیا گیا ہے۔ کسی نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا "یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد کا انجام کیا ہوگا؟" آپ نے فرمایا اس کا انحصار ان کے اعمال پر ہے[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں اگرچہ اس امر کو پسند نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ دین کے معاملے میں غیر ضروری غور و فکر سے کام لیں لیکن اس قسم کے سوالات کو بالکل روکا بھی نہیں جاتا تھا لہذا اگر شہرستانی نے دینی مباحث کی ابتدا ان اسباب سے کی ہے جو عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تاریخ مذاہب اسلامی کے اس جلیل القدر مصنف نے لکھا ہے:۔

"امت (اسلامیہ) میں تمام شبہات منافقین کے شبہات سے پیدا ہوئے جب انہوں

(صفحہ گزشتہ) کا احساس ہوا" — Spirit of Islam صفحہ ۴۰۱، دسواں باب بالخصوص ملاحظہ ہو۔

[۱] بخاری ج ۔ کتاب القدر۔

نے رسولؐ کے اوامر و نواہی پر اظہار رضامندی نہیں کیا۔ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی اور ایسی چیزوں کے متعلق سوالات کیے ..... جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ جیسا کہ حدیث ذوالخویصرۃ التمیمی سے ظاہر ہوتا ہے جس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا "اے محمدؐ! عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا اگر میں عدل نہیں کرتا تو پھر کون عدل کریگا۔ اس پر بھی اس لعین نے اپنے سوال پر اصرار کیا اور کہا کیا تو ایسی ہی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے[1]۔ یہ صریح خروج ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جو کوئی سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا خارجی کون ہوگا جس نے سچے رسول پر اعتراض کیا۔ کیا یہ نص صریح کے مقابلے پر اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ آنحضرت نے فرمایا اس شخص سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوئی تعلق نہیں رکھیگی......

یہی کیفیت منافقین کے اُس گروہ کی تھی جس نے (غزوۂ) احد میں کہا تھا "هل لنا من الامر من شیٔ"[2] پھر ان کا یہ کہنا کہ اگر ایسا ہوتا (لو کان لنا من الامر شیٔ[3]) تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے[4]۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو نہ ہم مرتے نہ قتل ہوتے[5]۔ کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے۔ اسی طرح مشرکین کا ایک گروہ کہتا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرتے[6]۔ پھر ایک گروہ کا یہ کہنا کہ کیا ہم اسے کھلائیں جسے اللہ کھلانا نہیں چاہتا[7]۔ کیا یہ صریحاً جبر نہیں ہے؟ مشرکین

---

[1] بخاری: استتابۃ المرتدین والمعاندین، باب قتل الخوارج والملحدین۔

[2] "کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟" قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴

[3] قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴

[4] ما قتلنا ههنا ـ قرآن مجید۔ سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴

[5] لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا ـ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ـ ۱۵۶

[6] لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیٔ ـ قرآن مجید، سورۃ النحل، آیت ـ ۳۵

[7] أنطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ ـ قرآن مجید، سورۃ یٰسین، آیت ۴۷

کا ایک اور گروہ تھا جس نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے تصرفات افعال میں بحث کی حتیٰ کہ قرآن میں یہ کہہ کر ان کا رد کیا گیا کہ ویرسل الصواعق فیصیب بھا من یشاء وھم یجادلون فی اللہ و ھو شدید المحال[۱] اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی آنحضرت صلعم صاحب قوت و شوکت اور صحیح و سالم تھے۔ لیکن منافق...... اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے۔ یوں کبھی کبھی ان کے باطنی نفاق کا اظہار رسول اکرم کے افعال و اعمال پر نکتہ چینی کی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ اسی سے شبہات پیدا ہوئے۔[۲]

ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے ضروری نہیں کہ منافق ہی ہو۔ بہرحال اس عبارت کے بعد علامہ موصوف نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اجتہادی اختلافات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رونما ہوئے یعنی (۱) واقعہ قرطاس، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں دوات و کاغذ طلب کیا تو حضرت عمر نے کہا آپ پر تکلیف کا غلبہ ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے (۲) جیش اسامہ کا معاملہ جو دوران مرض میں مرتب ہوا اور اس امر میں تذبذب تھا کہ رسول اللہ صلعم کو حالت مرض میں چھوڑ کر کوچ کرے یا نہیں۔ (۳) جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوا تو حضرت عمر نے کہا کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے ہیں (۴) اس امر میں بھی اختلاف تھا کہ آپ دفن کہاں کئے جائیں مکہ میں یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں (۵) مہاجرین و انصار نصب امام کے معاملے میں متفق الرائے نہیں تھے (۶) حضرت فاطمہؓ وراثت کی دعویدار تھیں لیکن اس کے جواب میں یہ حدیث پیش کی گئی کہ ہم نبی ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا (۷) آغاز خلافت کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہے ان کا قتل جائز ہے یا نہیں (۸) حضرت عمر کی جانشینی پر بھی اعتراض

---

[۱] وہ بھیجتا ہے بجلیاں اور ان میں سے جسے چاہتا ہے پکڑ لیتا ہے اور وہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ بڑا صاحب قوت ہے۔ قرآن مجید، سورۃ رعد، آیت ۱۳

[۲] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل لابن حزم، جزو اوّل، صفحہ ۱۷-۱۹۔

ہوا لیکن حضرت ابوبکر نے کہا میں نے جو کچھ کیا ہے امت کی بھلائی کے لئے کیا ہے (۹) حضرت عمر کے بعد پھر اختلاف رونما ہوا حتیٰ کہ لوگوں نے حضرت عثمان پر اتفاق کیا لیکن ...... آپ نے حکم ابن امیہ ...... کو واپس بلالیا۔ ...... حضرت ابوذر غفاری کو ربذہ میں جلاوطن کر دیا ...... عبداللہ بن سعد کو پناہ دی ..... اپنی لڑکی کی شادی مردان میں حکم سے کی اور اسے افریقہ کے مال غنیمت کا ایک خمس دیدیا ...... عبداللہ بن عامر کو بصرہ میں عامل بنایا ...... (۱۰) امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں ...... طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہما) نے بیعت کے بعد خروج کیا ...... صفین کا واقعہ پیش آیا ...... خوارج نے جنگ کی ..... عبد اللہ بن سبا اور اس کی جماعت سے بدعت و ضلالت کی ابتدا ہوئی اور رسول اللہ کا یہ کہنا صحیح ہوا کہ علی کے محب غالی اور مبغض دونوں جہنم میں جائیں گے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں اس کے بعد اختلافات کی دو قسمیں ہوگئیں۔ وہ اختلافات جن کا تعلق امامت سے تھا اور اصولی اختلافات۔[۱]

لیکن ان اجتہادی اختلافات میں بھی کہیں کہیں اصولی اختلافات کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر تشریف لے گئے ہیں جہاں سے آپ چالیس روز کے بعد واپس آجائیںگے۔ شیعوں کی ایک جماعت کے عقیدۂ الرجع سے کس قدر مشابہ ہے۔ البتہ ابوالفدا نے حضرت عمر کا نام نہیں لیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جماعت نے آنحضرت صلعم کی موت سے انکار کیا۔ وہ لوگ کہتے تھے آنحضرت صلعم کیونکر فوت ہو سکتے ہیں۔ آپ ہم پر شاہد ہیں آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھالئے گئے ہیں۔[۲] بخاری میں یہ روایت مذکور نہیں لیکن یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو میری بات سنو محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے تو حضرت عمر نے ایسا محسوس کیا گویا انہوں نے اس آیت کو پہلی مرتبہ سنا "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔[۳] یہاں تک کہ وہ غش کھاکر گر پڑے

---

[۱] شہرستانی، صفحہ ۲۷-۲۰۔ [۲] ابوالفدا: المختصر فی اخبار البشر جزو اول صفحہ ۱۵۲۔

[۳] قرآن مجید، سورۃ آل عمران آیت ۱۴۳

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا "خدا تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کریگا"[ا] اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات پر ایک جماعت کے دل میں واقعی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے[۲]۔ بہر کیف ان روایات سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ قدیم خیالات دلوں میں موجود تھے اسی طرح حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا دولت اور ملکیت دولت کے متعلق اختلاف کرنا ایک زبردست معاشی اور اصولی بحث کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے طرح طرح کے سوالات کئے ہیں اور اگرچہ آنحضرت صلعم نے کثرت سوال کو پسند نہیں فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش بھی یہی رہی لیکن طبائع میں ہر قسم کے خیالات جمع ہو رہے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد تو ان کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ اعلام الموقعین میں ابن قیم لکھتے ہیں:۔

> آنحضرت صلعم نے 'اغلوطات' سے منع فرمایا۔ ابوبکر ابن ابی شیبہ کہتے ہیں مجھ سے عیسیٰ ابن یونس نے اوزاعی سے اسناد کے ساتھ ایسی ہی روایت کی ہے۔ چنانچہ اوزاعی کا خیال ہے کہ اغلوطات سے مراد 'صعاب المسائل' ہیں۔ اور ولید بن مسلم نے اوزاعی سے' اوزاعی نے عبداللہ بن سعد بن عبادہ بن قیس الصابحی سے اور عبداللہ .... نے معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کی ہے کہ وہ معاویہ کے پاس مسائل کا ذکر کر رہے تھے کہ معاویہ نے کہا کیا تم جانتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکل مسائل سے منع فرمایا ہے۔ ابوعمر کہتے ہیں .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالات کو ناپسند فرمایا اور آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے قیل وقال اور کثرت سوال کو پسند نہیں کرتا...[۳]

[ا] بخاری: کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ

[۲] حاشیۃ السندی:۔ "بخاری کا یہ کہنا کہ عمر بن الخطاب لوگوں سے باتیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے اور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم فوت نہیں ہوں گے جبتک کہ اللہ منافقین کو ہلاک نہیں کر دیگا" ملاحظہ ہو حاشیہ بخاری، مطبوعہ مصر، جز ثالث صفحہ ۵۶۔ [۳] (دیکھو صفحہ آیندہ)

ان عبارات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ دینی مباحث کی داغ بیل مدینہ منورہ ہی میں پڑ چکی تھی۔ لہذا اگر ہم ان واقعات کی بنا پر یہ خیال قائم کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم ہی کے زمانے میں اختلافات کی بہت کافی گنجائش تھی تو غیر مناسب نہیں ہوگا۔ بہرکیف تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب سیاسی اور اجتماعی تفرقوں کی بنا پر مسلمان شیعی، خارجی اور اموی جماعتوں میں منقسم ہوگئے تو یہ اختلافات بھی خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے اور بنو امیہ کے غلبے کے ساتھ پوری شدت سے منظر عام پر آگئے۔ شیعی اور خارجی جماعت میں سب سے بڑا مسئلہ امامت کا تھا لیکن خوارج نے قضیۂ تحکیم کے ساتھ ایک طرح سے عقائد و اعمال کی باہمی نسبت کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کتاب الٰہی کے سوا کسی اور کو اپنا حکم بنانا گویا کتاب کا انکار کرنا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر عمرو بن عاص اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حکم مانا۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کافر ہوجاتا ہے[۱]۔ پھر ان فرقوں کی تشکیل و تنظیم سے وہ اصولی اور فروعی مباحث نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہوتے گئے جو آگے چلکر متعدد دینی مسائل کا مرکز بننے والے تھے۔ چنانچہ خوارج کے نعرہ ان الحکم الا للہ اور شیعوں کی امامت منصوص کے ساتھ بنو امیہ میں قدیم عربی خیالات کے ساتھ قسمت کا عقیدہ از سر نو جاگزیں ہو رہا تھا۔ امت اسلامیہ میں تفریق پہلے ہی رونما ہو چکی تھی۔ سیاسی اور اجتماعی انقلابات نے مذاہب اسلامی کے نشو و نما کو اور زیادہ آسان کر دیا۔ یہی خیال مولانا شبلیؒ نے علم الکلام میں ظاہر کیا ہے۔ اختلافات عقائد کے مختلف اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے:۔

> اختلاف عقائد کے اگرچہ یہ سب اسباب فراہم تھے لیکن ابتدا پالٹکس یعنی ملکی ضرورت سے ہوئی۔ بنو امیہ کے زمانے میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا۔ طبیعتوں میں شورش پیدا ہوئی

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) ابن قیم الجوزی: اعلام الموقعین، جز اول، صفحہ ۸۰۔

[۱] قرآن مجید، سورۃ مائدہ آیت ۴۴ :۔ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکفرون۔

لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو طرفداران حکومت یہ کہکر اُسے چپ کرا دیتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ہم کو دم نہیں مارنا چاہیئے۔ آمنا بالقدر خیرہٖ و شرہٖ۔ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں جو ظلم و جور کا دور تھا معبد جہنی ایک شخص تھا جس نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور دلیر اور راست گو تھا۔ وہ امام حسن بصری کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے امام صاحب سے عرض کی کہ بنو امیہ کی طرف سے قضاو قدر کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے کہا " یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں " وہ پہلے سے بنو اُمیہ کی زیادتیوں پر طیش میں بھرا ہوا تھا۔ اب علانیہ بغاوت کی اور جان سے مارا گیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس خیال کو ترقی دی۔ وہ حضرت عثمان کا غلام تھا اور محمدؐ بن حنفیہ سے بیک واسطہ تعلیم پائی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو اُس نے ایک نہایت آزادانہ خط لکھا اور بنو امیہ کے مظالم پر توجہ دلائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے بلا بھیجا اور شاہی توشہ خانہ کے نیلام کی خدمت سپرد کی۔ وہ برسر عام نیلام کرتا تھا اور پکار پکار کر کہتا جاتا تھا " یہ وہ مال واسباب ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کیا گیا تھا " اس وقت اسلام کی قدیم سادگی بہت کچھ باقی تھی تاہم توشہ خانہ میں تیس ہزار جرابیں نکلیں۔ غیلان نے کہا " صاحبو! اس ظلم کی کچھ حد ہے کہ عوام فاقے کرتے تھے اور ہمارے فرمانروا تیس تیس ہزار جرابیں توشہ خانہ میں مہیا رکھتے تھے .... ہشام بن عبدالملک .... غیلان کی کارروائیاں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ تخت نشینی کے ساتھ اس کو طلب کیا اور بغاوت انگیزی کے جرم میں اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے .... آخر اسی جرم میں جان سے مارا گیا۔

اسی زمانہ میں جہم بن صفوان پیدا ہوا۔ وہ بھی امر بالمعروف کے اسی جرم پر قتل ہوا۔ لیکن یہ خون خالی نہیں گئے اور امر بالمعروف کا مسئلہ زیادہ پھیلا اور اس قدر زور پکڑا کہ ایک گروہ کثیر ..... بالآخر معتزلہ کے لقب سے پکارا گیا .... ۱۲۵ھ میں جب ولید تخت نشین ہوا تو اس فرقے کا شمار ہزاروں سے تجاوز کر چکا تھا یہاں تک کہ خود خاندان بنی امیہ میں یزید بن الولید نے

یہ مذہب اختیار کیا...... اس کے طرفداروں میں ایک عمرو بن عبید تھا جو مذہب اعتزال کا بہت بڑا امام گزرا ہے۔

ملکی ضرورت نے اگرچہ جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی لیکن جب ایک دفعہ کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی گئی یہانتک کہ بنو امیہ کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ خلق قرآن، تنزیہہ و تشبیہہ صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور...... چند ہی روز میں بیسوں فرقے نکل آئے۔[۱]

واقعات کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس طرح شیعوں کی امامت منصوص کے خلاف خوارج میں امام کی ذات کے متعلق انتہائی جمہوریت کا خیال پیدا ہوا۔ اسی طرح جب بنو امیہ نے اپنی ہر زیادتی کے لئے قضا و قدر کا عذر پیش کرنا شروع کیا تو اہل بیت او شیعیان اہل بیت نے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر زور دیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ مختلف عقائد ان مختلف جماعتوں کیلئے کس قدر موزوں تھے۔ حامیان بنو امیہ کے ساتھ ہی ارض شام میں مرجیہ کا ظہور ہوا جن کی یہ رائے تھی کہ گناہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ یہ دوسرا حربہ تھا جو شیعی اور خارجی جماعتوں کے خلاف اہل شام کو میسر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین کے نزدیک یہ فرقہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا ایک قدرتی نتیجہ تھا[۲]

---

[۱] شبلی: علم الکلام، حصہ اول، صفحہ ۱۹-۱۷

[۲] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل، صفحہ ۱۸۶۔ رجا کے دو معنی ہیں تاخیر اور رجا (امید) لیکن مرجیہ کا اطلاق اول الذکر پر ہوتا ہے اس لئے کہ انہوں نے عمل کو نیت پر مؤخر رکھا۔ البتہ دوسرے معنوں میں یہ مطلب ہوگا کہ مرجیہ وہ ہیں جو کہتے تھے کہ ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی جیسے کفر کے ساتھ اطاعت بیکار ہے۔

"دربار دمشق میں جس سے کسی شیعہ یا خارجی کو اتفاق نہیں ہوسکتا تھا خیالات کا جو عالم تھا ان کیلئے، انکے عقائد کس قدر موزوں تھے...... ان کو ابنائے وقت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا...... دولت امویہ کے ساتھ مرجیہ کا بھی خاتمہ ہوگیا اس لئے کہ اب انکی کوئی ضرورت نہیں تھی" براؤن، تاریخ ادبیات ایران، جلد اول، صفحہ ۲۸۰۔

محدثین نے بھی اس فرقے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا[۱]۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ واقعات تھے جو مسلمانوں کے ذہنی اضطراب سے ملکر طرح طرح کے دینیاتی مباحث کا موجب ہوئے۔ مرجیہ اور قدریہ یا معتزلہ کی بنا نہ مسیحی اثرات کا نتیجہ تھی جیسا کہ فان کریمر نے ظاہر کیا ہے[۲] نہ یہ محض عجمی اقوام کی اسلام دشمنی تھی جسے غلطی سے ابن حزم نے تمام اصولی اختلافات کا باعث قرار دیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔

دین اسلامی میں اکثر فرقے اس لئے پیدا ہوئے کہ وسعت سلطنت اور دوسری اقوام پر غلبہ اور برتری کے اعتبار سے ایرانی تمام اقوام سے افضل تھے۔ وہ اپنے آپ کو احرار اور ابنا کہتے تھے اور دوسروں کو غلام۔ لیکن جب ان کی سلطنت عربوں نے چھین لی جو اہل ایران کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے تو یہ ان کے لئے ایک عظیم الشان مصیبت تھی۔ لہذا انہوں نے دین اسلام میں رخنہ اندازی شروع کی لیکن اللہ تعالےٰ نے حق کا بول بالا کیا[۳]۔

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہر ایرانی محض اس ارادے سے اسلام قبول کرتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کوئی فتنہ برپا کر سکے۔ یہ کہنا کہ کسی ایرانی نے خلوص نیت سے اسلام قبول نہیں کیا ایک ایسا مبالغہ ہے جسے کوئی شخص تسلیم نہیں کریگا۔ علاوہ ازیں اسلام نے جس عظیم الشان مذہبی تحریک کی بنا رکھی تھی اس کا یہ تقاضا تھا کہ متمدن دنیا اپنے معتقدات پر ایک مرتبہ پھر نظر ثانی کرتی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنی مخصوص دشواریوں کو حل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ عقائد اسلامی میں نئے نئے خیالات سرایت کر رہے تھے۔ یہ اسلام ہی کی ہمہ گیر روح تھی جس نے مسلمانوں کی ہر علمی اور عملی تحریک کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح امت اسلامیہ کے داخلی شئوں سے دینی مباحث کا آغاز ہوا۔ مسلمان علما نے نہ عیسائیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ وہ کسی ایرانی

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ کنز العمال جزاول، باب فی ذم القدریہ والمرجیہ۔ شبلی: علم الکلام، جزاول، صفحہ ۲۶۔

[۲] تمدن اسلامی پر ایک نظر Culturgeschichtliche Streifzüge

[۳] ابن حزم، کتاب الفصل فی الملل والاھوا والنحل، جز ثانی، صفحہ ۱۱۵۔

سازش کے زیر اثر تھے۔ دراصل وہ تمام خیالات جو مذاہب اسلامی کی تہ میں کام کرتے رہے اس وقت کے اخلاقی اور ذہنی ماحول میں موجود تھے۔ جب ان کا تصادم تعلیمات قرآنی سے ہوا تو نئے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ ان خیالات کا بہت سا حصہ مذاہب اسلامی میں مل گیا اور ان سے مسلمانوں کے اکثر فرقے متاثر بھی ہوئے لیکن دینیات اسلامی کا نشو و نما ایک آزادانہ تحریک تھی جو ازخود مسلمانوں کے اندر رونما ہوئی۔ جس طرح مدینہ منورہ میں فقہی مذاہب کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے ایک غیر معمولی ذہانت کے ساتھ قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، لغت، نحو، ادب اور تاریخ وغیرہ علوم کی طرف توجہ کی ـــــ یاد رہے کہ ان کا یہ علم کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ نہیں تھا ـــــ اسی طرح دینی مسائل کی ابتدا ہوئی۔ اسلام کے اولین فقہا اور محدثین کے ساتھ ہمیں ان بزرگوں کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے مذہب کے معاملے میں غور و فکر سے کام لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے امام جعفر الصادق (رضی اللہ عنہ) کی بدولت مسلمانوں میں ایک نہایت ہی خوشگوار ذہنی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا[1]۔ امام حسن بصری کو بیک وقت صوفی اور عالم دینیات خیال کیا جاتا ہے۔ بنو امیہ کے عقیدۂ "تقدیر" کے متعلق انکی جو رائے تھی وہ معبد جہنی کے واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے[2]۔ مسلمانوں کی یہی ذہنی سرگرمیاں تھیں جو ان کے سیاسی اور اجتماعی تفرقات اور مختلف مسلم اقوام کے افکار و آرا سے مل کر مذاہب اسلامی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام وہ ارتجاعی اور ملحدانہ تحریکیں جو اسلام کے خلاف پیدا ہوئیں خواہ وہ زرتشتی عقائد کا نتیجہ ہوں یا مانویت اور یونانیت کا، وہ سب کی سب مذاہب اسلامی کی ابتدا سے مؤخر تھیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ان خیالات کی طرف توجہ کریں جن سے بظاہر اس امر کی "تصدیق ہو جاتی ہے" کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما مسیحی اور ایرانی اثرات کے ماتحت شروع ہوا۔

---

[1] ملاحظہ ہو "اسپرٹ آف اسلام" اور ابن خلکان، وفیات الاعیان۔

[2] ملاحظہ ہو ابن خلکان جزو اول۔

انگلستان کا ایک فاضل مستشرق لکھتا ہے :-

اسلامی دینیات کا نشو و نما ...... آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد شروع ہوا جب تک آپ زندہ تھے ..... ظاہر ہے کہ کوئی نظام دینیات قائم نہیں ہو سکتا تھا ..... بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی بدعات کی ابتدا مبہم سی ہے ...... قدیم اہل الاہوا کے متعلق ہمیں کچھ نا تمام سے قصص ملتے ہیں - ..... بایں ہمہ تاریخ کے اس دھندلکے میں دو فرقوں کا پتہ چلتا ہے جن پر اس زمانے کے تاریخی واقعات اور فلسفیانہ ضروریات کا بہت کافی اثر تھا۔ ان میں سے ایک مرجیہ ہے دوسرا قدریہ ...... خوارج اور شیعہ بنو امیہ کو کافر سمجھتے تھے .... لیکن مرجیہ کہتے تھے کہ بنو امیہ مسلمانوں کے فی الواقعہ (de facto) خلفا ہیں اور توحید کے قائل ...... لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں .... معلوم ہوتا ہے اس طرح مرجیہ کی ابتدا ہوئی - گویا سیاسی اعتبار سے وہ خوارج کے تشدد فی الدین کے مخالف تھی۔

قدریہ کا ظہور ذہن انسانی کے ایک عقلی اقتضا کا نتیجہ تھا - افراد و اقوام کو خدا کے حکم مطلق اور انسانی عمل کی آزادی میں جو تضاد نظر آتا ہے اسی سے انکی منکرانہ زندگی کا آغاز ہوا ہے - یہی کیفیت اسلام کی تھی ..... جب تک مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ان کے خیالات پر خدا کے حکم مطلق کا عقیدہ حاوی رہا[1] ..... اسی فرقے کے بانیوں میں سے ایک معبد الجہنی تھا جو سنہ ۸۰ھ میں الحاد کے جرم میں مقتول ہوا (اس کے بعد مصنف نے معبد الجہنی اور امام حسن بصری کی اس گفتگو کا ذکر کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے) ...... تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرقہ بندی کا رجحان پیدا ہوا ...... مرجیہ اور قدریہ کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ان کا کچھ حصہ کٹر اسلام میں مل گیا اور کچھ ایک جدید فرقے میں ...... اس فرقے کا آغاز پھر حسن بصری کی طرف منسوب ہے جن کی ذات معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں تمام

---

[1] کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو انکو اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہوا - نیازی -

مذہبی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کسی نے آپ سے پوچھا .... مرجیہ اور وعیدیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مرجیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو جب بھی وہ مسلمان ہی رہتا ہے لیکن وعیدیہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے .... پیشتر اس کے کہ امام موصوف کچھ جواب دیں عمرو بن عبید یا واصل ابن عطا دونوں میں سے کسی نے کہا کہ اس کی حیثیت دونوں کے بین بین ہوگی۔ ایسا شخص نہ مسلمان ہوگا نہ کافر .... اس کے بعد وہ امام صاحب کے حلقے سے اٹھکر مسجد کے ایک دوسرے حصے میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے خیالات کو باقاعدہ بیان کر سکے ...... اس پر امام صاحب نے اپنے اس شاگرد کے متعلق کہا اعتزل عنا اور اسطرح اس نئے فرقے کا نام معتزلہ ہوا ...... اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں ایک ایسی جماعت موجود تھی جو .... قرآنی عقائد کو عقل سے سلجھا رہی تھی[1]

سطور بالا سے ہمارے پچھلے بیانات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن اس قدر لکھنے کے بعد مسٹر میکڈانلڈ مستشرقین کے اس مفروضہ نظریے سے مجبور ہو کر جو اسلام کے نشو و نما کو مسیحی اثرات کا نتیجہ ٹھہراتے ہیں لیکن جس کی تائید میں وہ کسی تاریخی شہادت کو معقولیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ مرجیہ اور قدریہ کا ظہور مسیحی اثرات کے ماتحت ہوا۔ مسٹر میکڈانلڈ کہتے ہیں:-

> مرجیہ اور قدریہ کے نشو و نما میں ہم دینیات یونانی کیساتھ بازنطینی اور شامی مذاہب کی موشگافیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ شیعہ اور خوارج کی سیاسی بدعات کا ظہور عرب، عراق اور ایران میں ہوا لیکن خالص مذہبی بدعات کی ابتدا سب سے پہلے شام اور بالخصوص دمشق میں ہوئی جو اموی خلفا کا مستقر تھا ...... دولت امویہ نے بہت سی باتوں

D. B. Macdonald — Muslim Theology [1]

فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۰ - ۱۲۱ -

میں عرب قبل اسلام کے خیالات کو اختیار کر لیا تھا..... ان کے زمانہ میں سرجیس ... ایک اموی خلیفہ کا خزانچی تھا۔ سرجیس کے بعد یہ عہدہ اس کے بیٹے یوحنا کو ملا...... جو یونانی کلیسا کا آخری امام ہے۔ اسی کے ہاتھوں یونانی دینیات کی تکمیل ہوئی...... اس کی اور اس کے شاگرد تھیوڈر ابوکلا کی تحریروں میں اسلام پر مناظرانہ رسالے موجود ہیں جنکو اس انداز میں لکھا گیا ہے گویا عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس زمانے کے خصائص کا اظہار ہوتا ہے۔ مرجیہ اور قدریہ اور یونانی کلیسا اور یوحنائے دمشقی کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کی تشریح کی یہی ایک صورت ہے۔[۵]

اب بغیر اس امر پر غور کئے کہ ازمنۂ قدیم کی وہ مسخ شدہ عیسائیت جس میں ہر طرح کے مشرکانہ تخیلات کام کر رہے تھے اور جس کے پیروؤں کی ساری زندگی دن بدن وثنیاتی صورت اختیار کر رہی تھی ذات الٰہی اور خود مذہب کے متعلق ان اعلیٰ اور ارفع تخیلات کا کیونکر موجب ہو سکتی تھی جو اسلام کے ساتھ ظہور میں آئے مسٹر میکڈانلڈ نے حمایت مذہب کے جوش میں یوحنائے دمشقی کی تحریروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے قدیم مذاہب اور بالخصوص عیسائیت کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ تھی سب کو معلوم ہے۔ عیسائیت کے اس خوفناک انحطاط اور اس کی انتہائی پستی کو دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کسی طرح اسلام یا فرقہ ہائے اسلامی متاثر ہو سکتے تھے۔ بایں ہمہ مسٹر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ :-

بحیثیت مجموعی اگرچہ یہ مسئلہ مزید تحقیقات کا محتاج ہے لیکن یونانی دینیات نے اسلام پر جو اثر ڈالا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہ امر کہ دونوں نے ذات و

---

۵ D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اوّل، صفحہ ۳۲-۱۳۱

صفات الٰہی کے مسئلے پر بے حد زور دیا ہے اس بات کا بہت کافی ثبوت ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانان مغرب بالخصوص علمائے اسپین کے خیالات میں جو تشدد پایا جاتا ہے وہ لاطینی اور آگسٹائنی اثرات کا نتیجہ ہے۔[۱]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر میکڈانلڈ نے واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو چیزوں کی ظاہری اور سطحی مشابہت سے بلاوجہ ایک کو اس کی علت اور دوسری کو اس کا نتیجہ قرار دیا حالانکہ دو چیزوں میں مشابہت کا موجود ہونا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری سے ماخوذ ہے۔ تاریخی حقائق علت و معلول کے اس مفروضہ رشتہ کے اور بھی مخالف ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ جبر و قدر اور دوسری بحثوں کا آغاز کیونکر ہوا۔ باعتبار زمانہ یہ سب بحثیں عہد امویہ سے مقدم تھیں۔ فان کریمر نے لکھا ہے کہ عقیدۂ 'قدر' کی بنا ان دو عیسائی علماء نے ڈالی جو دمشق میں رہتے تھے اور شب و روز عربوں سے میل جول رکھتے تھے یعنی یوحنائے دمشقی اور تھیوڈور ابو کارا[۲]۔ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مسلمانوں میں یہ خیالات مشرقی کلیسا سے بہت پہلے رونما ہو چکے تھے اور معبد جہنی یوحنائے دمشقی کا معاصر تھا لیکن دمشق کی کسی مسیحی جماعت سے ربط و ضبط رکھنے کی بجائے امام حسن بصری کے حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا ہم فان کریمر اور مسٹر میکڈانلڈ کے مناہج تحقیق کے ماتحت یہ فرض کر لینے میں کہیں زیادہ حق بجانب ہیں کہ مشرقی کلیسا کے یہ خیالات اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے۔ بہرکیف اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ خوارج اور شیعہ جماعتوں کے ظہور میں کسی مسیحی یا غیر اسلامی اثر کا حصہ نہیں بلکہ یہ آویزش خلافت کے داخلی شئون کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ لہٰذا اگر شیعی اور خارجی فرقوں کے مقابلہ میں مرجیہ اور قدریہ کا

---

[۱] D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۲ - ۱۳۳

[۲] فان کریمر، تمدن اسلامی پر ایک نظر۔

ظہور ارض شام میں ہوا تو اس لئے نہیں کہ یوحنائے دمشقی یا تھیوڈور ابوکارا کا قیام دمشق میں رہتا تھا بلکہ اس لئے کہ ارض شام کا یہ قدیم شہر خلفائے امویہ کا مرکز تھا اور ان کے جور و استبداد اور 'جبری' رجحانات کے خلاف اگر احتجاج ہو سکتا تھا تو یہیں اور یہیں یہ لوگ خوارج کے اُن سخت اور متشددانہ خیالات کے خلاف جو احساس معصیت سے پیدا ہوئے اپنے انجام کو امید و اطمینان کی نظر سے دیکھتے ہوئے 'رجا' پر زور دے سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ خیالات صرف دمشق تک محدود تھے غلطی ہوگی۔ مدینہ منورہ کے بعد اگرچہ دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز دمشق ہوا لیکن ملت اسلامیہ کی ذہنی اور علمی مرکزیت کوفہ اور بالخصوص بصرہ کے حصے میں آئی تھی۔ یہیں مسلمانوں کی متفرق جماعتیں — بالخصوص عرب اور ایرانی — اپنی گزشتہ روایات اور باہمی ربط و ضبط کی بدولت مختلف مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں اور یہیں سے عقیدہ 'قدر' کی رو معبد جہنی کے ساتھ شام میں پہنچی۔ رفتہ رفتہ مذہب اعتزال نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کی اور آگے چلکر جب مسلمان علما کے ایک طبقے نے فلسفہ و حکمت کے مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو 'حکما' کے نام سے موسوم کیا تو عقیدہ اور عقل کے باہمی تضاد کو دور کرنے کے لئے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذاہب غیر سے ربط و ضبط کی وجہ سے مسلمانوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہوں انکا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ مختصر کیفیت ہے مذاہب اسلامی کی ابتدا اور ان کے نشو و نما کی معلوم ہوتا ہے خود مسٹر میکڈانلڈ بھی نادانستہ طور پر ان حقائق کو محسوس کر رہے تھے اس لئے کہ اپنے گزشتہ خیالات کے اظہار کے بعد انہیں فوراً اس امر کو تسلیم کرنا پڑا کہ :-

> "مسلمان عیسائی علما کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ دراصل یہ خیالات باہمی ربط و ضبط اور بحث و مباحثہ میں منتقل ہو رہے تھے۔ یوحنائے دمشقی کے رسالے کی ترتیب ہی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے جس کی عبارت یوں ہے کہ اگر عرب تم سے یہ کہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا........"[۱]

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں :-

یونانی فلسفہ، زرتشتیت، مانویت، حران کی قدیم وثنیت، یہودیت، عیسائیت یہ سب چیزیں فضا میں موجود تھیں اور اپنا اثر ڈال رہی تھیں[1]

بالفاظ دیگر یہ سب خیالات اس وقت کے ذہنی اور مذہبی ماحول میں موجود تھے اور طبائع میں پہلے ہی سے اس امر کی بہت کافی گنجائش تھی کہ اگر کوئی جدید مذہبی تحریک پیدا ہو تو وہ از سر نو ان خیالات کی طرف توجہ کریں۔ لیکن ان خیالات کے ابھرنے کے لئے جو افراد و اقوام کے حافظے میں ایک غیر شعوری صورت اختیار کر چکے تھے کسی شدید محرک کی ضرورت تھی۔ لہذا جون ص

(نوٹ صفحہ گزشتہ) D. B. Macdonald, Muslim Theology فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۳

خوش قسمتی سے میرے پیش نظر کتب خانہ جامعہ کا وہ نسخہ تھا جو زندان بیجاپور میں مولانا محمد علی مرحوم کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے۔ مولانائے محترم نے مسٹر میکڈانلڈ کے اس جملے پر یہ نہایت ہی صحیح خیال ظاہر کیا ہے کہ "یہ خیالات پہلے ہی سے فضا میں موجود تھے..... یوحنائے دمشقی کو غالباً مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی مخالفت منظور تھی جس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک اور نظام "سولاسطیت" مرتب کیا۔ مولانا کی اصل عبارت یہ ہے :-

The ideas were in the air the commonplaces of the times. What John of Damascus did perhaps was to prepare a defence of the proselytising activities of the Mussalmans and Mussalmans in reply built up another system of scholastics.

D. B. Macdonald, Muslim Theology ل فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۴۔

مسلمانوں کی داخلی زندگی میں نئے نئے انقلابات رونما ہوئے اسی لحاظ سے یہ تمام افکار منظر عام پر جلوہ گر ہوتے گئے۔ اس طرح اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذاہب اسلامی کا ظہور اور اُن کی تشکیل و انضباط کسی مسیحی یا ایرانی اثر کا نتیجہ نہیں تھا۔ نہ اس کے اسباب و علل کے لئے ہمیں کسی غیر اسلامی سرچشمے کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب کی بنا ایک آزادانہ تحریک تھی جو از خود رونما ہوئی کچھ اس غور و فکر کی گفتگو سے جس کا آغاز مدینہ منورہ ہی میں ہو گیا تھا اور کچھ عرب اور نومسلم اقوام کے باہمی اختلاط و ارتباط کی وجہ سے جس سے مسلمانوں کے اندر ایک جدید ذہنی تحریک کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب خارجی افکار سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ ایک حد تک یہ افکار ان کے محرکات بھی ثابت ہوئے ہیں لیکن یہ محض اس لئے کہ جس دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا تھا اس میں قدیم افکار اور ادارات موجود تھے۔ جب ان قدیم افکار و ادارات کا تصادم اسلامی تعلیمات سے ہوا تو ان کا ایک حصہ اسلام میں مل گیا اور باقی یا تو ہمیشہ کے لئے محو ہو گئے یا اپنا دھندلا سا نقش مذاہب اسلامی پر چھوڑ گئے۔

———— : ————

عینک فروش

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی مجھے معمولی سواری گاڑی کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی پر تو اختلاج ہونے لگتا ہے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے سُست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کرتے تو دن بھر میں منزل سے زیادہ دور نہ ہٹے گا لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے۔ راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آسکتا ہے مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر یہ بتائے کہ پچھلے مہینے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا، جہاں آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر چاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مُسلم مگر زندگی میں انکا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لئے منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبّے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں

موٹے معلوم ہوتے تھے، دوسری نظر میں اس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو انکی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً انکے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے انکے مٹاپے سے اور انکے یوں بیساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آکر غرانے بھی لینے لگتے تھے تب تو بیساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انہیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دروازے سے باہر پھینکدوں۔

میں بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ انکے لب خشک تھے، چہرے کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد نیم دیسی نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے جنہیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ انکے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی آج موقع پا کر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اسی لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجے میں خالی ڈبہ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کریگا سامنے کی بنچ والے خواہ مخواہ مرد آدمی کا شمار تو اس وقت حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں۔ رہے وہ دونوں حضرات جو میری بنچ پر تھے ان میں سے نوجوان تو بیچارے

حزن وملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی ..... اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اٹھے گویا یہیں اترنا چاہتے ہیں، مگر جب انہوں نے کھڑکی کے پاس جاکر اسٹیشن کا نام پڑھا توکسی قدر مایوسی کے ساتھ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کیطرف مڑکر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انہوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید نزع کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہوگی سودے والوں کو بلایا اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی پوری، کباب، دہی بڑے، گگڑی امرود الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انہیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے اس لئے انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہو لیکن جب انہوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسد انکے صندوق شکم میں جاکر غائب ہوگیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر انہوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا پھر آستین سے منہ پوچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی اور پیر مرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے "آپ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بیحد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہوا س سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں

آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل درمعقولات کا کیا حق ہے اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیرمرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ مگر نوجوان نے ڈوبی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں" اب مجھے یقین ہوگیا کہ یہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دیر تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اسی کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اداس معلوم ہوتے ہیں"

"جی ہاں کچھ ایسی ہی پریشانیاں ہیں"

"آخر معلوم تو ہو وہ کونسی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شائد آپ کی کچھ مدد کر سکوں"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گزار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہوگی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہوگا"

"نہیں ایسا نہیں۔ راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں۔ اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے امین زندگی کی

کشمکش سے محفوظ امن وعافیت سے دن گذار سکتا ہے، جہاں نہ اسے اپنے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے اور نہ انکی نامہربانی، نا ناشکرگذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اُسکی اصلاح کوشش کر کے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی مومیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ دوں، خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کرلوں اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں۔"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں؟"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دُکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دیدی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی۔ جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔ اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان والوں میں ایمان ہے، خلوص ہے درد ہے، قابلیت ہے ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے مجھے امید تھی کہ یہ چیزیں ذراسی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کے لئے ایک الاپ، دیوانوں کے لئے ایک ہو، عقلمندوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانۂ امید ایک

نعرۂ مستانہ چاہئے۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے غلامی کا طوق اتار کر پھینک دیں گے جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعث حیرت اور قابل تقلید ہوگا۔ یہ تھا میرا عقیدہ یہ تھی میری امید"

"مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا، تصور اور واقعے میں اتنی نسبت بھی تو نہ تھی جتنی چیزیں اور اُس کے سائے میں ہوتی ہے۔ ہم اور مجھ جیسے دوسرے تکلیفیں اٹھا کر ڈکھ جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں کچھ سونے والے اٹھے کچھ مسافروں نے آگے قدم بڑھایا۔ ہمارا دل خوش ہوا، ہماری ہمت بڑھ گئی۔ مگر یہ اطمینان عارضی تھا کیونکہ راہ کی دشواریوں نے چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے اور اس پر ستم یہ ہوا کہ کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد۔ ان میں سے بعض اپنے پیروؤں کو لوٹ کر چل دیئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہوگئے اور اس پر جھگڑنے لگے کہ دائیں کو مڑیں یا بائیں کو آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا، یہ پھل بلا مدتوں کی ریاضت کا۔ میرا تو یہ دیکھ کر جی چھوٹ گیا ہاتھ پیر شل ہوگئے زبان بند ہوگئی افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہوگئی مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ہندوستان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا رہے گا۔ غلامی کی ذلت اٹھاتا رہے گا۔ مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیاباں کیطرف جا رہا ہوں تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ذلت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیۂ نفس و تصفیہ قلب کے ذریعے سے معرفت اور نجات حاصل کر دوں"

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طلش کے یاس کا غلبہ ہوگیا ہے میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے، سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں

کی قلعی کھولے۔ بہرحال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے اُن کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجو ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے۔ مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و طمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انھوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا :۔

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبہ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہے کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہو یاس اور امید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبر کیوں؟ آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام۔ آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی"

"جناب انسان کو جس نے عشق دیا ہے اُسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر، تعقل تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مرمٹے۔ اُس کی مستی ہوشیاری کے سہارے چلتی ہے اُس کی دیوانگی دانائی کے پروں پر اڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوق منزل پیدا کرتا ہے، اور ذوق سفر، عقل اُسے راہ سجھاتی ہے، اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں لیکن میری عقل یہ کہتی ہے کہ ملک و قوم کے پنپنے کی کوئی امید نہیں تو اپنی روح کو بچا اور اُس کی بالیدگی کا سامان کر۔"

"الحمدللہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اُسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں ورنہ ہمارے اہلِ حال کے یہاں تو عقل بیچاری راندۂ درگاہ ہے اس لئے کہ وہ عشق کی ضد

سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہوگئی۔
عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی ہنگامہ
زندگی سے مایوسی اور گوشہ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردعمل کا
نتیجہ ہے۔ پہلے اس یاس کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدانخواستہ
نظام عالم اور قانون زندگی سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہے، اپنے ملک کے انسانوں سے۔
آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص اور ایثار، پامردی اور استقلال کا
پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی قوم ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں
یہ وسوسہ نہیں کہ رحمت ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر اُن سے روگردانی
کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے
کہ آپ اُس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری
قسم کی مایوسی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم کی طرف سے ناامیدی جو آپ کے سر پر
منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگر سچی ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار
مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی
ہے۔ اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا
اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان بلکہ ایشیا
کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں
ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ خواب
غفلت سے چونک اٹھے ہیں۔ انکی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش
کر رہا ہے۔ انہوں نے راہ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے، ٹھوکریں کھاتے ہیں مگر
پھر سنبھل جاتے ہیں تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوے نہیں کر سکتا کہ اُسے انجام کا یقینی علم ہے بڑے سے بڑا دانشمند

علامات پر حکم لگاتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اٹھی ہے یہ اب رکنے والی نہیں۔ یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے بہت نشیب و فراز دیکھیں گے مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ زندگی کا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ دستور ہے خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامیابی کو رو رہے ہیں وہ ایک بڑے سلسلے کی کڑی تھی اس کا لوہا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتوڑے کی چوٹ کھانے دیجئے کہ وہ فولاد بن جائے پھر کڑی میں کڑی پڑتی جائے گی سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپکی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہوتا ہے جیسے تیز بخار مدت کے بعد اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی اور امید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اُسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرانوردی کی ایک مدت معین کرلوں اور اُسے پورا کرکے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہئے لیکن لوہا اگر زنگ آلودہ ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں۔ آپ کا بخار اگر اترا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈھتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس

کی وجہ یہ ہو کہ اس کے نیچے امید کی تہ ابھرنے کو مستعد تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی۔ میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیماردار تھا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیہ نفس کے ہفتخواں کو طے کرلیں گے یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے سکون کا انعام اُسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ وہی زندگی کی آگ دور کرسکتی ہے جو اُسے فولاد بناتی ہے۔ اسکے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے، جو خام کار ابتدا میں تنہائی اختیار کرتے ہیں اُن کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات وجذبات کی مستی کو نشۂ معرفت، غرور نفسانی کو تمکین روحانی خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں۔ ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیشک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ راہنما بھی ہیں ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہوسکتا ہے مگر راہنما بھی ہوسکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہو۔ یہی دنیا ہے۔ کمزور دل اس دُگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط دل اسی میں یکسوئی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنیوالا ہے اسی پر مجھے اترنا ہے۔ وہ دیکھئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور "اپنی زبان میں" سمجھا بھی دیا۔ سُنئے۔

کاٹتے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں — غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تکیں جوانی میں بڑھاپے سی سوا — رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی — پر بھلا تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو — ہیں اُسے پانی دئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے انکو گو ہو عالم نکتہ چیں — رہتے ہیں تبیں دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار — دن بسر کرتے ہیں دیوانو نہیں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپنے اپنا قصد بدلا یا نہیں کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دیدیا تو پوچھنے کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ آئیے مصافحہ کر لیجئے۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر پیر مرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اُتر کر چل دیئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھا۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ اب کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بدحواسی میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبے بیٹھے ہیں اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے اپنے لحن شدادی میں چائے والے کو پکار رہے ہیں۔

نمودِ سحر

از مولوی سید ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

اے نمودِ صبح اے رنگینیٔ دورِ حیات — تیری لطف انگیزیوں میں غرق ہے یہ کائنات

تو نے آ کر بھر دیا پھولوں میں حسنِ تازگی — تو نے ہر غنچے میں اک روحِ تبسم پھونک دی

تو نے ہر ذرے کو رشکِ مہرِ تاباں کر دیا — یعنی حُسنِ شاہدِ فطرت کو عریاں کر دیا

منتشر ہے سارے عالم میں ہوائے مشکبار — صرف گلشن ہی نہیں آئینہ ہے ہر کوہسار

اے نمودِ صبح تجھ سے ہے بہارِ کائنات — حُسنِ فطرت کو ہے تیری وجہ سے حاصل ثبات

وہ ستاروں کا تبسم اور وہ حسنِ انتشار — وہ نسیمِ صبح کا تھم تھم کے چلنا بار بار

وہ طیورِ صبح خواں کی زمزمہ پردازیاں — سبزۂ خوابیدہ کی وہ بار بار انگڑائیاں

چاندنی میں جھومنا سبزے کا وہ مستانہ وار — کیف پرور کس قدر ہیں یہ ادا ہائے بہار

وہ ہوائے سرد، وہ جنگل، وہ رنگینی تری — کوہساروں کی ہوا ہے برف میں ڈوبی ہوئی

ڈوبتے تاروں کا چشموں میں وہ دلکش انعکاس — گویا مخمل پر ستارے جڑ دئے ہیں پاس پاس

آسماں کو صبح کی سُرخی نے رنگیں کر دیا — یا مطلا ہو گئی ہے دہر کی ساری فضا

وہ ترنم ریز نغمے وہ وفورِ بے خودی — اور وہ طاری ہر اک دل پر سرورِ بیخودی

اک ترانہ بن گئی ہے باغ کی ساری فضا
طائروں کی نغمہ پیرائی ہے کیسی دلربا

شذرات

محمد عنایت اللہ صاحب کا چندہ بابت ممبری اردو اکادمی وصول ہوا ہے۔ مگر اُن کا پتہ دفتر سے گم ہوگیا ہے۔ وہ براہ مہربانی اپنے پتے سے دفتر کو جلد اطلاع دیں تاکہ رسالہ جامعہ اُنکے نام جاری کردیا جائے اور جو کتاب تیار ہونیوالی ہے وہ تیاری کے بعد بھیجی جائے۔

یہ جولائی کا نمبر ستمبر کے پہلے ہفتہ میں قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ اگست کا نمبر بھی انشاء اللہ ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں چھپ جائے گا۔

اردو اکادمی نے منجملہ اور کاموں کے ایک یہ کام بھی اپنے ذمے لیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے جو کتابیں اسلامی علوم اور اسلامی تمدن کے متعلق لکھی ہیں ان میں سے منتخب کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں شائع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتاب "عربوں کا تمدن" شائع ہوچکی ہے اور دوسری "سیرۃ نبوی اور مستشرقین" عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ اُردو میں شائع کرنا مفید نہیں کیونکہ انکو پڑھ کر ہندوستان کے مسلمان مذہب اسلام اور تاریخ اسلام کو یورپ والوں کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس مصلحت کی بنا پر اردو اکادمی نے یہ کام شروع کیا ہے اُسکی تشریح کردیجائے تاکہ اکادمی کے ارکان کو اس مسئلے پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آج کل مستشرقین کا عام رویہ اسلامی تمدن کیطرف سے

کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یوروپ میں اسلام پر کتابیں لکھنے والے کلیسا کے آلۂ کار تھے اُنکا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اسلام کو بدنام کریں چاہے اس میں ہزار دل بے بنیاد افسانے گھڑنا پڑیں اور سچائی کا خون ہو جائے۔ مگر اب رنگ بدل گیا ہے۔ اب مستشرقین کے گروہ پر کلیسا کا مطلق اثر نہیں بلکہ مذہب کا بھی کم ہے۔ اب اُنکا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ حتی الامکان مسلمانوں کے قدیم اور جدید تمدن کی سچی تصویر پیش کریں۔ ان کی تصنیف و تالیف کی محرک ہمیشہ سچی علمی تحقیق کی لگن نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے واقف ہونے کا موقع دیں تاکہ اسے مسلمانوں سے معاملت کرنے میں، ان پر سیاسی غلبہ پانے اور ان سے تجارتی فوائد بٹورنے میں آسانی ہو۔ بہرحال خواہ ان کا مقصد تحقیق علمی ہو یا افادی دونوں صورتوں میں وہ بڑی محنت اور کاوش سے سچے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر یہ لوگ بھی انسان ہیں اور دور دراز ملکوں، غیر زبانوں اور اجنبی قوموں سے پوری واقفیت حاصل کرنا انکے لئے مشکل ہے اس لئے یہ اپنی تصانیف میں غلطیاں بھی کرتے ہیں خصوصاً مذہب اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں کیونکہ عام طور پر ان میں خود اپنے مذہب کی روح بھی نہیں ہوتی بلکہ سرے سے مذہبیت کے متعلق انکے تصورات بہت ناقص ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ عموماً بہت قابل ہوتے ہیں اور برسوں عرق ریزی کر کے کتابیں لکھتے ہیں اس لئے ان کتابوں سے وہ طالبان علم جو ان غلطیوں سے دھوکا نہ کھائیں۔ بڑے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

اردو اکادمی چاہتی ہے کہ اُردو داں طبقے کے ہاتھوں میں اُنکی کتابوں کے ترجمے پہنچا ہے۔ انگریزی داں طبقہ اُنکی کتابیں مدت سے پڑھتا ہے لیکن چونکہ اس کے اکثر افراد

اسلامی علوم کے اصل ماخذوں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں اسلئے ان کتابوں پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آتے ہیں۔ مگر اردو داں طبقہ میں وہ علماء بھی موجود ہیں جو اسلامیات پر عبور رکھتے ہیں اور ان کتابوں کو تنقید کے معیار پر پرکھ کر انکے حسن و قبح سے پڑھنے والوں کو آگاہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ ان سے مفید معلومات حاصل کریں اور انکے غلط نتائج سے قطع نظر کرلیں۔

اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جو کھلی ہوئی خامیاں ان کتابوں میں ہوں انکی ترجمہ کرنے والے خود تصحیح کردیں لیکن پورا حق تنقید ادا کرنا ماہرین فن کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی تنقیدوں کو شائع کرنے کے لئے رسالہ جامعہ حاضر ہے اور ان میں سے وہ اعتراضات اور ایرادات جو وقیع اور اہم ہوں کتابوں کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کئے جاسکتے ہیں بلکہ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ کرکے مصنفوں کو یا ان کتابوں کے شائع کرنیوالوں کو بھیجے جاسکتے ہیں۔

مگر عربوں کے تمدن پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں ان میں سوائے رسالہ معارف کی تنقید کے اور کسی سے اکادمی کو کوئی مدد نہیں ملی اس میں بعض ایرادات قابل تسلیم تھے اور انکے لئے اکادمی تنقید نگار کی شکرگزار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انداز تحریر میں ناگوار مناظرے کا رنگ (مناظرہ صرف مصنف سے نہیں بلکہ مترجم سے بھی) آگیا تھا اور مترجم نے اس کا جو جواب رسالہ جامعہ میں شائع کیا اس میں بھی یہ رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب اکادمی کی طرف سے نہ تھا جامعہ میں یہ اسی حیثیت سے شائع ہوا جیسے کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا۔ جناب مدیر معارف اسے معارف میں شائع کرنا چاہتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا پیام جب پہنچا تو یہ مضمون چھپ چکا تھا۔ "وہ سچ" میں بھی اس مضمون پر ایک نوٹ لکھا گیا ہے

اور آئندہ نمبروں میں کتاب پر مفصل تنقید لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ جناب مدیر سچ کے نزدیک معارف کی تنقید ضرورت سے زیادہ نرم ہے کیونکہ اس میں "ہذیان سرائی" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اور "تحقیق" کو واوین کے اندر نہیں لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مدیر "جامعہ ملیہ" کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اسمیں نہ تو عالمانہ تنقید کا رنگ ہوتا ہے نہ دوستانہ نصیحت کا، نہ مرشدانہ ہدایت کا بلکہ مخالفانہ طنز کا، حالانکہ یہ اصلاح کا کوئی مفید طریقہ نہیں نصیحت کا اثر جب ہوتا ہے کہ وہ خلوص سے کیجائے اور چاہے تلخ ہو مگر ترش نہ ہو۔ طنزیہ کلمے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ضد پیدا کرتے ہیں۔ جناب مدیر سچ بیکار دوسروں کو اس امتحان میں ڈالتے ہیں جس میں وہ خود کبھی پورے نہیں اترے۔

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲

از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

مذہب

تاریخ

ادب

افسانہ

ڈراما

اجتماعیات

سیاسیات

حصہ نظم

اقتباسات

تنقید و تبصرہ

(رسائل و اخبارات)

(کتب)

مضمون نگاران "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲ از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

آثر مرحوم شاگرد حضرت خواجہ میر درد رح

آثر ردولوی

آزاد سبحانی (مولنا)

اسرائیل احمد خانصاحب (مولوی)

اسلم صاحب جیراجپوری (مولنا)

اسلم خانصاحب بی اے (کیمبرج) (ملک)

بدرالدین جینی صاحب متعلم جامعہ

برٹرینڈ رسل

جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ)

حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ)

درد کاکوروی صاحب (حضرت)

ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

زبید احمد صاحب (از لندن)

سجاد ظہیر صاحب بی اے (از آکسفورڈ)

سید سلیمان صاحب ندوی

سلیم الزمان صدیقی صاحب پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)

شاپور کرماتی صاحب (حضرت)

صفی صاحب لکھنوی (حضرت)

عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر سید)

عبدالعلیم احراری صاحب بی اے (آنرز)

فرحت اللہ بیگ صاحب (مرزا)

فریڈرش ہائینکے

محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) (پروفیسر)

محوی صاحب (مولنا)

مُیلڈا سیراؤ

نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)

یوسف حسین خانصاحب بی اے (از پیرس)

رجسٹرڈ
نمبر ۱۵۸۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۳
بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۹ء
نمبر ۲
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۲	بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب ۲

باکونین اور نراج

عام ذہن میں نراجی ایک شخص ہے جو بم پھینکتا ہے اور دوسرے خوفناک جرم کرتا ہے خواہ اس وجہ سے کہ وہ کم و بیش پاگل ہے یا انتہا پسند سیاسی خیالات کو اپنے مجرمانہ رجحانات کے لئے پردہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ خیال ظاہر ہے کہ ہر طرح ناقص ہے۔ بعض نراجی بم پھینکنے میں یقین رکھتے ہیں، بہت سے نہیں رکھتے۔ پھر یہ کہ دوسرے عقائد کے لوگ بھی مناسب حالات میں بم پھینکنے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً جن آدمیوں نے سراجیوو میں وہ بم پھینکا تھا جس سے موجودہ جنگ شروع ہوئی وہ نراجی نہ تھے، قوم پرست تھے۔ اور اگر اس نہایت چھوٹے حصہ سے قطع نظر کیجائے جنہوں نے ٹالسٹائے کا عدم مقاومت کا رویہ اختیار کر لیا ہے، تو وہ نراجی جو بم پھینکنے کے موافق ہیں دوسرے لوگوں سے اس بارے میں کوئی اہم اصولی اختلاف نہیں رکھتے۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی گویا معاشی طبقوں کی جنگ پر یقین رکھتے ہیں، اور اگر یہ بم استعمال کرتے ہیں تو اسی طرح جیسے حکومتیں اغراض جنگ کے لئے بم استعمال کرتی ہیں۔ لیکن ہر ایک بم کے مقابلہ میں جو ایک نراجی تیار کرتا ہے، حکومتیں لاکھوں تیار کرتی ہیں اور ہر ایک آدمی کے مقابلہ میں جس نے نراجی تشدد کے ہاتھوں جان دی ہے ریاست کے تشدد سے لاکھوں مارے جاتے ہیں۔ لہذا ہم تشدد کا یہ سوال جو عام تخیل میں اس قدر اثر رکھتا ہے اپنے ذہن سے بالکل دور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ نراجی خیال والوں کے لئے یہ نہ تو لازمی ہے نہ انکے ساتھ مخصوص۔

نراج ، جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے ، ایک نظریہ ہے جو ہر قسم کی جبریہ حکومت کے مخالف ہے ، اگر ریاست جبر و تشدد کا مجسمہ ہے جو سماج پر حکومت کرتا ہے تو یہ ریاست کا مخالف ہے جس حکومت کو نراج برداشت کر سکتا ہے وہ آزاد حکومت ہونی چاہئے ، نہ صرف اس معنی میں کہ یہ اکثریت کی حکومت ہو بلکہ اس معنی میں کہ سب اس پر راضی ہوں - نراجی پولیس اور قانون فوجداری کے خلاف ہیں اس لئے کہ انکے ذریعہ سے جماعت کے ایک حصہ کی مرضی دوسروں پر عائد کیجاتی ہے ، انکے خیال میں جمہوری حکومت اس وقت تک حکومت کی دوسری شکلوں پر کچھ زیادہ قابل ترجیح نہیں جبتک کہ اقلیت کو جبر واقعی یا امکانی کے ذریعہ اکثریت کی مرضی پر مجبور کیا جاتا ہے - نراجی مذہب میں حریت خیر اعظم ہے اور اس حریت کی تلاش کا سیدھا راستہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرد پر جماعت کا جو بھی جبریہ قابو و اختیار ہے اسے یک قلم اٹھا دیا جائے -

اس معنی میں نراج کوئی نیا مسئلہ نہیں - ایک چینی فلسفی چوانگ تسو نے جو ۳۰۰ سال قبل مسیح تھا نہایت قابل تعریف طریقہ سے اسے پیش کیا ہے :

"گھوڑوں کے سم ہوتے ہیں کہ انہیں پالے اور برف پر لیجائیں ، بال ہوتے ہیں کہ انہیں ہوا اور سردی سے بچائیں - یہ گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور میدان میں اپنے سموں پر اڑ جاتے ہیں - یہ ہے گھوڑوں کی حقیقی فطرت ، عالیشان عمارتیں ان کے لئے بیکار ہیں -

ایک دن پو لو یہ کہتا ہو نمودار ہوا : "میں گھوڑوں کا انتظام کرنا جانتا ہوں" ، چنانچہ اس نے انہیں داغ دیئے ، انکے بال کاٹے ، سم تراشے ، اور لگامیں چڑھائیں ، سر سے باندھا ، پچھاڑیاں کیں ، اور انہیں اصطبلوں میں رکھا - نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دس میں سے دو تین مر گئے پھر اس نے انہیں بھوکا پیاسا رکھا ، قدم چلایا اور دلکی ، مالش کرائی اور کھریرا کرایا ، آگے پھندنے دار لگام کی مصیبت ، پیچھے گرہ دار چابک کا خوف ، حتی کہ آدھے سے

زیادہ ختم ہوگئے

کمہار کہتا ہے: میں جو چاہوں مٹی کے ساتھ کرسکتا ہوں۔ اگر گول بنانا چاہوں تو پرکار استعمال کرتا ہوں، چوکور بنانا ہو تو مربع"

بڑھئی کہتا ہے: "میں جو چاہوں لکڑی کے ساتھ کرسکتا ہوں، اگر اسے خمیدہ بنانا ہو تو قوس استعمال کرتا ہوں، اگر سیدھا تو مسطر"

لیکن ہم آخر یہ سمجھ کس بنا پر سکتے ہیں کہ مٹی اور لکڑی کی فطرت اس پرکار و مربع قوس و مسطر کے استعمال کی مقتضی ہے۔ تاہم ہر زمانہ میں پولو کی تعریف ہوئی ہے، گھوڑوں کے انتظام میں اسکی ہنرمندی کی اور مٹی اور لکڑی کے معاملے میں کمہاروں اور بڑھیوں کی ہنرمندی کی جو لوگ سلطنت پر حکومت کرتے ہیں ان سے بھی یہی غلطی سرزد ہوتی ہے۔

اچھا، میں سلطنت پر حکمرانی کو بالکل مختلف نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔

لوگوں میں بعض فطری جبلتیں ہوتی ہیں۔ کپڑا بننا اور اپنے کو ملبوس کرنا، زمین جوتنا، اور اپنا پیٹ بھرنا۔ یہ ساری انسانیت کے لئے مشترک ہیں اور سب اس پر متفق ہیں ایسی جبلتوں کو "آسمان سے بھیجا ہوا" کہتے ہیں۔

لہذا جس زمانہ میں فطری جبلتیں غالب تھیں تو آدمی آہستہ چلتا تھا اور اس کی نگاہ استوار تھی۔ اس زمانہ میں پہاڑوں پر سڑکیں نہ جاتی تھیں، نہ کشتیاں تھیں نہ پانی پر پل۔ سب چیزیں اپنے اپنے مخصوص دائرے کے لئے پیدا کیجاتی تھیں۔ پرند اور چرند کی پود بڑھتی تھی، پیڑ بوٹے پھلتے پھولتے تھے۔ اول الذکر کو ہاتھ سے تھام سکتے تھے، کوئی چاہتا تھا تو اوپر چڑھ کر کوے کے گھونسلے میں جھانک آتا کیونکہ اس زمانے میں انسان چرند اور پرند کے ساتھ رہتا تھا، ساری مخلوق ایک تھی۔ بھلے اور برے آدمی کی تفریق نہ تھی۔ سب چونکہ یکساں بے علم تھے لہذا انکی نیکی راہ نہیں بھٹک سکتی تھی۔ سب چونکہ بری خواہشوں سے یکساں آزاد تھے لہذا ایک فطری وحدت و یگانگت کے عالم میں تھے

جو وجودِ انسانی کا کمال ہے۔

لیکن جب عقلاء پیدا ہوئے جنہوں نے خیرات کی رکاوٹ راہ میں ڈالی اور پڑوسی کے حقوق کی بیڑیاں ڈالیں تو شبہ نے دنیا میں راہ پائی اور جب انہوں نے موسیقی کے متعلق بلبلاہٹ اور رسوم کی بابتہ داستان کلکل شروع کی تو سلطنت کے اندر انتشار پیدا ہو گیا۔(۱)

جس معنی میں ہیں اس سے سروکار ہے اس میں موجودہ نراج زمین اور سرمایہ کی مشترک ملکیت کے عقیدہ سے وابستہ ہے اور اس طرح نہایت اہم اعتبار سے اشتراک سے قریب ہے۔ اس مذہب کو صحیح طور پر نراجی اشتراک کہتے ہیں لیکن اس میں چونکہ عملاً سارا جدید مسئلہ نراج شامل ہے لہذا ہم فی الحال انفرادی نراج کیطرف سے قطع نظر کرکے اپنی تمامتر توجہ اس کی اشتراکی شکل پر مبذول کر سکتے ہیں۔ اشتراک (خالص) اور نراجی اشتراک دونوں اس ادراک سے پیدا ہوئے ہیں کہ شخصی سرمایہ بعض افراد کی دوسروں پر ظلم کا باعث ہے۔ ارتودکس اشتراک یقین کرتا ہے کہ اگر ریاست تنہا سرمایہ دار ہو جائے تو فرد آزاد ہو جائیگا برخلاف اس کے نراج کو اندیشہ ہے کہ ایسی حالت میں شاید ریاست کو شخصی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ رجحانات ورثہ میں ملیں گے۔ لہذا یہ ایک ایسے ذریعہ کا متلاشی ہے جس سے ملکیت مشترک اور ریاست کے اختیار میں زیادہ سے زیادہ تخفیف باہم ملجائیں بلکہ آخر میں جاکر ریاست مطلقاً معدوم ہی ہو جائے۔ یہ اشتراکی تحریک کے اندر ہی اس کے انتہائی پہلوئے چپ کی حیثیت سے پیدا ہوا۔

بعینہ اسی معنی میں جس میں مارکس کو جدید اشتراکیت کا بانی کہا جاسکتا ہے، باکونین کو اشتراکی نراج کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مارکس کیطرح باکونین نے مسائل کا کوئی مختتم اور منظم مجموعہ نہیں تیار کیا۔ اس سے بہت قریب پہنچتے ہیں اس کے تبع کرو پاٹکن کی تحریروں

---

(۱) "ایک چینی صوفی کی افکار"

سمجھ میں آئے گی۔ جدید نراج کی توضیح کے لئے ہم باکونین کی زندگی[1] اور مارکس سے اس کی مخالفت کی تاریخ سے ابتدا کریں گے اور اس کے بعد نراجی نظریہ کا ایک مختصر سا بیان پیش کریں گے جیسا کہ یہ جزواً خود اس کی اور زیادہ تر کروپوٹکن کی تصانیف میں ملتا ہے۔

میشیل باکونین ایک روسی امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہے جو اپنی خدمت سے سبکدوش ہوکر سرکار تویر میں اپنے دیہی تعلقہ میں آبسا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں باکونین پیٹرسبرگ کے توپخانہ کے مدرسہ میں شامل ہوا اور ۱۸ سال کی عمر میں یہ ایک رجمٹ میں افسر کی حیثیت سے بھیجا گیا جو سرکار رنسک (Minsk) میں تعینات تھی۔ سنہ ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت ابھی ابھی دبائی جا چکی تھی۔ "بہوت دخوف زدہ پولینڈ کے منظر نے"، بقول گیلوم "نوجوان افسر کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا اور اس میں استبداد کیطرف سے نفرت پیدا کرنے میں مدد دی" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی آزمائش کے بعد اس نے اپنا فوجی پیشہ ترک کر دیا۔ اس نے ۱۸۳۴ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دیا اور ماسکو جاکر چھ سال فلسفہ کی تعلیم میں صرف کئے۔ اس دور کے سب طلبہ فلسفہ کی طرح یہ بھی ہیگل کا متبع ہوگیا اور ۱۸۴۰ء میں اس امید کے ساتھ کہ آگے چل کر پروفیسر ہو جائے گا یہ برلن میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے آیا لیکن اس زمانے کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تیز تبدیلی ہوئی۔ اسے اب ہیگل کا یہ قول تسلیم کرنا ناممکن معلوم ہونے لگا کہ جو کچھ ہے مطابق عقل ہے۔ یہ ۱۸۴۲ء میں ڈریسڈن منتقل ہوگیا جہاں اسے Deutsche Jahrbücher کے ناشر آرنلد روگے سے واسطہ رہا۔ اس زمانہ میں یہ انقلابی بن چکا تھا اور اگلے ہی سال اس نے اپنے آپ کو سیکسنی حکومت کے عتاب کا مورد بنالیا۔ چنانچہ سویزرلینڈ جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں جرمن اشتراکیوں کے ایک گروہ سے یکجائی کا موقع ملا، لیکن سوئس

---

(۱) نراجی نقطہ نظر سے باکونین کے حالات زندگی اس کے مجموعہ تصانیف (شائع کردہ گیلوم۔ پیرس) کی دوسری جلد میں ملیں گے۔

پولیس تنبیہہ کر ہی چکی تھی اور روسی حکومت نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، لہٰذا یہ پیرس چلا گیا اور یہاں ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۷ء تک رہا۔ اس کے خیالات و آراء کی تشکیل میں پیرس کے یہ سال بہت اہم تھے۔ یہاں اس کی پرودھان سے واقفیت ہوئی جس نے اس پر کافی اثر ڈالا، نیز جارج سینڈ اور بہت سے اور مشہور لوگوں سے۔ پیرس ہی میں اس کی واقفیت مارکس اور انگلز سے پیدا ہوئی جن سے اسے ساری عمر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ بہت عرصہ بعد ۱۸۷۱ء میں اس نے اپنے اور مارکس کے اس زمانہ کے تعلقات کو یوں بیان کیا:۔

مارکس مجھ سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا، اور آج بھی اگرچہ وہ خیالات کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہے مگر علمیت کے اعتبار سے میرا اس سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا میں اس وقت معاشیات کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے ابتک مابعد الطبیعی تحریروں سے رہائی نہ حاصل کی تھی، اور میرا اشتراک بس فطری و جبلی تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے کم عمر تھا، تاہم اسی زمانہ میں دہریہ تھا، نہایت واقف کار مادہ پرست، اور سوچا سمجھا اشتراکی۔ ٹھیک اسی زمانہ میں اس نے اپنے موجودہ نظام کی اول بنیادیں ترتیب دی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر ملا کرتے تھے، کیونکہ میں اس کی علمیت اور فرد دردی کے باب میں اس کی دلی اور گہری دلچسپی کے باعث (جس میں ہمیشہ ذاتی خود بینی کی بھی آمیزش ہوتی تھی) اس کی بڑی عزت کرتا اور اس کی گفتگو کا دل سے اشتیاق رکھتا تھا کیونکہ یہ گفتگو ہمیشہ سبق آموز اور دانشمندانہ ہوتی تھی، بشرطیکہ اس کی تہ میں کوئی حقیر نفرت نہ ہو جیسا افسوس ہے کہ اکثر ہوتا تھا۔ لیکن ہم دونوں میں صاف بے تکلفی کبھی نہ تھی۔ ہمارے طبائع اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وہ مجھے جذباتی خیالی کہتا تھا اور ٹھیک کہتا تھا، میں اسے خود بیں متفنی اور مکار کہتا اور میں بھی ٹھیک کہتا تھا،،

باکونین ارباب اختیار کی دشمنی کا مورد بنے بغیر کبھی ایک جگہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکا

ایک تقریر کے سبب سے جو اس نے ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت کی تعریف میں کی روسی سفارت کی درخواست پر نومبر ۱۸۴۷ء میں اس کا فرانس سے اخراج ہوا۔ اور روسی سفارت نے اسے عام ہمدردی سے محروم رکھنے کے لئے یہ بے بنیاد خبر پھیلا دی کہ یہ روسی حکومت کا کارندہ ہے لیکن چونکہ اسکا رویہ قابل اعتراض ہے اس لئے ہمیں اسکی ضرورت نہیں رہی، فرانسیسی حکومت نے جان بوجھکر خاموشی اختیار کی اور اس طرح اس قصہ کو اور اکسایا اور یہ الزام کم و بیش زندگی بھر اس کے سر رہا۔

فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوا تو بروسلز گیا۔ یہاں مارکس سے واقفیت کی تجدید ہوئی۔ اسکے ایک خط سے جو اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں وہ شدید نفرت موجود تھی جس کے لئے بعد کو اتنے وجوہ پیدا ہوگئے "یہ جرمن کاریگر بورن اشٹیڈٹ مارکس اور انگلز اور خصوصاً مارکس یہاں اپنی معمولی شرارت کر رہے ہیں۔ خود بینی کینہ، غیبت سے معمور نظری حیثیت سے بر خود غلط، عمل کے اعتبار سے چھچھورے، اعلی زندگی اور سادگی افکار میں کورے، انشا پردازی اور مناظرے کے کاریگر اور اس کے ساتھ قابل نفرت کبر و نخوت میں مدہوش نوابزادے۔ بورژوا ہے، لفظ بورژوا ایک لفظ ہے جسے اتنا دہراتے ہیں کہ جی متلانے لگے لیکن سب کے سب سر سے پیر تک پکے دیہاتی بورژوا۔ مختصر یہ کہ جھوٹ اور حماقت، حماقت اور جھوٹ۔ اس صحبت میں آزادی سے پوری سانس بھرنا بھی ممکن نہیں۔ میں ان سے الگ تھلگ رہتا ہوں اور نہایت قطعی طور پر اعلان کر چکا ہوں کہ میں انکے اشتراکی اتحاد کاریگران میں کبھی شامل نہ ہوں گا اور اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔"

۱۸۴۸ء کے انقلاب کیوجہ سے یہ پیرس واپس گیا   اور وہاں سے جرمنی آیا ایک معاملہ میں مارکس سے اسکا جھگڑا ہوا، جس کے متعلق بعد کو اس نے خود اقرار کیا کہ اس میں مارکس حق پر تھا۔ پراگ میں یہ سلافی کانگریس کا رکن بنا اور ایک سلافی بغاوت

ابھارنے کی بیکار کوشش کرتا رہا۔ ۱۸۴۸ء کے اواخر میں اس نے "سلافیوں کے نام اپیل" لکھی جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ دوسرے انقلابیوں سے ملکر تین ظالم سلطنتوں کو تباہ کردیں یعنی روس، اسٹریا اور پروشیا۔ مارکس نے اخبار میں اس کی مخالفت کی اور کہا کہ باہمی خود مختاری کی تحریک عبث ہے کیونکہ سلافیوں کا کوئی مستقبل نہیں کم سے کم ان علاقوں میں جہاں وہ جرمنی اور آسٹریا کے محکوم ہیں۔ باکونین نے اس معاملہ میں مارکس پر جرمنی وطن پرستی کا الزام لگایا اور مارکس نے اس پر اتحاد سلافی کی حمایت کا اور اسمیں شبہ نہیں کہ دونوں الزام بجا تھے۔ لیکن اس تصفیہ سے پہلے ایک زیادہ سخت جھگڑا ان دونوں میں ہو چکا تھا۔ مارکس کے اخبار نے بیان کیا تھا کہ جارج سینڈ کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باکونین روسی حکومت کا کارندہ ہے اور منجملہ ان لوگوں کے ہے جو حال کی پولی گرفتاریوں کے ذمہ دار ہیں۔ باکونین نے ظاہر ہے کہ الزام کو جھٹلایا اور جارج سینڈ نے اس اخبار کی ادارت کو لکھکر اس بیان کی کلی تردید کی۔ یہ تردیدیں مارکس نے شائع کر دیں اور باہم برائے نام سمجھوتا ہو گیا لیکن اسوقت سے لیکر آئندہ کبھی ان دونوں حریف قائدوں میں مخالفت ٹھنڈی نہ پڑی اور یہ ایک دوسرے سے ۱۸۶۴ء تک نہیں ملے۔

اس اثناء میں رد عمل ہر جگہ جڑ پکڑ رہا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ڈرسڈن میں بغاوت کے بعد کچھ لمحوں کے لئے شہر انقلابیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ پانچ دن تک اسے انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور ایک انقلابی حکومت قائم کی۔ ان انقلابیوں نے پروشی فوجوں کا جو مقابلہ کیا اس کا روح رواں باکونین ہی تھا۔ لیکن یہ مغلوب کر لئے گئے اور باکونین ہوائنر اور رچارڈ واگنر کے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں گرفتار کیا گیا اور موسیقی کی خوش نصیبی کہ موخرالذکر گرفتاری سے بچ گیا۔

اب بہت سے مجلسوں اور مختلف ملکوں میں قید کا ایک طویل زمانہ شروع ہوتا ہے۔

۱۴؍جنوری ۱۸۵۰ء کو اس پر سزائے موت کا حکم لگایا گیا، لیکن ۵ مہینہ کے بعد یہ حکم بدل دیا گیا اور اسے اسٹریا کے سپرد کر دیا گیا جو اسے سزا دینے کی سعادت کا طالب تھا۔ اسٹریوں نے بھی مئی ۱۸۵۱ء میں اسے سزائے موت کا حکم لگایا اور پھر یہ حکم بھی حبس دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ آسٹروی قید خانوں میں اس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ایک قید خانہ میں تو اسے کمر کی پیٹی سے دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ باکونین کو سزا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص مسرت حاصل ہوتی تھی کیونکہ اسٹریوں سے اب روسی حکومت نے اسے طلب کیا اور انہوں نے اس کے سپرد کر دیا۔ روس میں اسے پہلے پطرس اور پولوس کے قلعہ میں قید رکھا گیا اور بعد کو شلوسل برگ میں۔ یہاں اسے فساد خون کا عارضہ ہو گیا اور اس کے سارے دانت گر گئے۔ اس کی صحت بالکل خراب ہو گئی اور اس کے لئے تقریباً ہر غذا کا ہضم کرنا ممکن ہو گیا۔ لیکن اگرچہ اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا، تاہم اس کی روح مغلوب نہیں ہوئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ ایک بات کا ڈر تھا۔ یہ کہ کہیں قید کے کمزور کرنے والے اثر سے یہ کسی دن ذلت کی اس حالت پر نہ پہنچ جائے جس کی مشہور مثال سلویو پیلیکو ہے۔ یہ خوف تھا کہ یہ کہیں نفرت کرنا نہ چھوڑ دے، کہیں بغاوت کا وہ جذبہ جو اسے سہارا دیتا رہتا تھا اس کے دل سے مٹنے نہ لگے، کہیں یہ اپنے سزا دینے والوں کو معاف کر کے اپنی قسمت پر قانع و صابر نہ ہو جائے۔ لیکن یہ خوف غیر ضروری تھا، اس کی قوت نے ایک دن کے لئے بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اپنی قید کی کوٹھری سے اسی آن بان سے نکلا جیسے اس میں داخل ہوا تھا۔

ترکی اور جنگ عظیم

قصہ شروع ہوا اسٹریا کے ولی عہد کے قتل سے اور ختم ہوا جنگ عظیم کے اعلان پر ان دنوں ترکی میں کوئی یہ گمان بھی نہ کرتا تھا کہ اسکا نتیجہ ایسی عالمگیر تباہی کی شکل میں نکلے گا۔ اس تباہی کی ذمہ داری پر میں بحث نہ کرونگی۔ اگر جرمنی کی معاش اور فوجی ترقی اور اسکا مادی فلسفہ اس جنگ کے معین تھے تو اب یہ بھی تو معلوم ہو چکا ہے کہ اتحادیوں کی طرف بھی ایسے ہی مادی اسباب اور اتنی ہی جارحانہ تیاریاں عرصہ سے جاری تھیں لیکن جن وجوہ سے ہم اس عام تباہی میں شریک ہوئے ان پر ایک نظر تکلیف دہ سہی لیکن دلچسپ ضرور ہے۔ ہمارے شامل ہونے سے ہی مشرق قریب میں ۴ سال جنگ رہی، دنیا کو بہت کچھ دکھ پہنچا! اور خود ترکی قوم کی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور ایسی تکلیفیں اٹھانی پڑیں جنکا اٹھانا کچھ ضروری نہ تھا۔ اپنی شمولیت کی وجہ بتانے سے پہلے میں قارئین کرام کی توجہ تین خاص کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتی ہوں جن سے واقعات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ پہلی کتاب تو پروفیسر آرل ( ) کی تصنیف ہے "بغداد ریلوے" جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف غیر متعصب آدمی ہے حق بات معلوم کرنا چاہتا ہے اور ایسے زمانہ میں اس نے اپنی کتاب لکھی ہے جب دونوں طرف سے پروپگنڈا کے بادل چھٹ چکے تھے اس لئے یہ معاملات کو صاف صاف دیکھتا ہے۔ اور چونکہ کتاب خاص معاشی ہے اس لئے جو شخص اس معاشی معمہ کو سمجھنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے یہ کشمکش ہوئی اسے اس کتاب میں نہایت اچھی اور غیر جانبدار سند ملے گی۔

دوسری کتاب روسی سفارتخانہ قسطنطنیہ کے ترجمان ادل منڈلسٹن کی تصنیف ہے سلطنت عثمانیہ) یہ کتاب ۱۹۱۷ء

میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے نوجوان ترکوں کی بابتہ بہت زیادہ مواد جمع کیا ہے۔ اور ان اسباب کی بابتہ جنہوں نے ترکی کو جرمنی کی طرف شریک جنگ کرایا۔ اس مصنف کا بس ایک مقصد ہے اور اس نے اپنا تمام مواد اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے جمع کیا ہے اور اسے ہر طرح توڑ مروڑ کر اسی کام کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا نقطہ نظر کم وبیش وہی ہے جس پر ان دنوں میں ساری دول اتحادی نہایت شدت کے ساتھ، اندھے پن اور تنگی دل سے یقین رکھتی تھیں۔ اس مصنف کے دلائل کی روح یہ ہے کہ ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہئیں۔ ترکوں کو معمولی انسان نہ سمجھنا چاہئے؛ اور نوجوان ترکوں کو تو ارمنیوں کے قتل کے باعث عادی مجرم جاننا چاہئے۔ کتاب میں ارمنیوں کے قتل کا تفصیلی بیان ہے اور دوسری اقلیتوں کی بابتہ بہت مبالغہ آمیز الزامات ہیں جن کے متعلق اس کا دعوٰے ہے کہ ترک انہیں یک قلم مٹا دینا چاہتے تھے لیکن مجھے اس بات میں بلغاریوں کے ہاتھوں ترکوں کے قتل کا ذکر کہیں نہ ملا، نہ ۱۹۱۲ء کے مظالم کا، نہ ترکوں کے اس قتل عام کا جو ارمنیوں نے روسی فوج کے ساتھ مشرقی ترکی میں داخل ہو کر ۱۹۱۵ء میں کیا تھا، اور جس کا ذکر صاف سیدھی زبان میں انہی روسی افسروں نے کیا ہے جنہوں نے ان ارمنی مظالم سے بیزاری ظاہر کی تھی۔ کثرت مواد کے باوجود اس کتاب سے مجھ پر پہلی مرتبہ روشن ہوا کہ میرے ملک اور میری قوم کے متعلق اس زمانہ میں یورپی دماغ میں کیسی لاعلاج تنگی تھی اور کیسا یکطرفہ پن۔ اور پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ نوجوان ترکوں کے دلائل میں سچ مچ واقعیت تھی۔ بہر حال ہمارے ایک سابق وزیر اعظم کے بیانات میں (جنہیں مصنف نے اپنی کتاب کے مطالب کی رد میں خود نقل کیا ہے) ترکوں کی جانب سے کافی مواد اور نہایت قوی اور ناقابل انکار دلائل موجود ہیں۔

منڈلسٹن کی کتاب کے بالکل مخالف ایک تیسری کتاب ہے، ''اسباب جنگ'' جو بوغی چے وتچ کی تصنیف ہے اور ابھی حال میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں

ان رجحانات سیاسی کا ذکر ہے جو جنگ سے پہلے دنیا پر چھائے ہوئے تھے : زاری روس کی سیاست جس کا مقصد اسٹریا کو اور بلقان میں ترکی کو ختم کر دینا تھا، اور فرانس کی سیاست جو روس کی حمایت کرتی تھی تاکہ جرمنی کو پیس ڈے اور الساس لورین کا صوبہ واپس لے لے بوغی بے وہ ایک پرانا سربی رکن سیاست ہو جوان سیاسی مقاصد کے تیاری کے زمانہ میں نیز ایام جنگ میں سیاسی کام کرتا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت دلچسپ سیاسی دستاویزیں بھی نقل کی ہیں۔

میں خود تو ہر جنگ کی مخالف ہوں اس لئے میں شرکت جنگ کی حمایت نہیں کرسکتی چاہے وہ کسی طرف سے ہوتی۔ لیکن اگر کوئی اس راز کے سیاسی دلائل کی گتھیوں کو سلجھائے اور ان نوجوان ترک قائدوں کی کیفیت ذہنی کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اسباب بالکل واضح ہو جاتے ہیں: پہلا سبب تو خود مختاری کی خواہش تھی یعنی غیر ملکیوں کے مراعات کو مٹا دینے کی خواہش۔ نوجوان ترکوں نے بہت سخت کوشش کی کہ اتحادی دول کی ہمدردی حاصل کریں۔ لیکن بے سود۔ اتحادی انہیں غیر جانبدار دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس کے عوض کچھ دینے کو تیار نہ تھے۔ دوسرا سبب روسی سامراج کا موروثی اور جائز خوف۔ یہ ادریات ہو کہ روس کو قسطنطنیہ دینے کا وعدہ ۱۹۱۴ء میں کیا گیا یا ۱۹۱۶ء میں نوجوان ترک یہ ضرور جانتے تھے کہ روایتی اور سیاسی اعتبار سے روس انگلستان کا دشمن ہے اسے پھانسنے کے لئے انگلستان ترکی کو ضرور نرم چارہ کی طرح استعمال کرے گا۔ تیسرا سبب ترکی کی افسوسناک مالی حالت تھی۔ غیر جانبدار رہنے کے لئے بھی ترکی کو مالی مدد درکار تھی اور یہ مالی مدد اتحادیوں سے مل نہ سکتی تھی۔ دور حاضر کے ایک معروف مدبر نے مجھ سے بیان کیا کہ جب انگلستان نے ہمارے جہاز ضبط کئے اور انکے دام دینے سے بھی انکار کیا تو حکومت پر جنگ کے موافق عنصر کا بہت اثر پڑا اور وہ اس طرف ڈھل گئی۔ بالغرض اگر یہ بیان پوری حقیقت حال پر حاوی نہ ہو تو اس کے ایک اہم جزو پر ضرور حاوی ہو

اور اس سے ترکی کی شدید مالی احتیاج کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھا سبب اتحادیوں کا کھلم کھلا اور متعصبانہ طور پر عیسائیوں کی حمایت کرنا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ عیسائی اقلیتوں کو مدد دی کہ یہ مسلم و ترک اکثریت کے مقابلہ میں معاشی بلکہ سیاسی تفوق تک حاصل کرلیں۔ پانچواں سبب یہ تھا کہ جرمنی کو ترکی کمزوریوں سے پوری پوری ذہنی و نفسی واقفیت تھی اور اس نے صحیح لمحہ کے انتخاب میں نہایت ہوشیاری سے کام لیا۔

نوجوان ترکوں کے قائدوں نے اپنے جنگ میں شامل ہونے کے موافق جو دلیلیں بھی ممکن تھیں سب کی سب استعمال کیں،، اور ترک قوم کو جس میں اتحادی بہت ہر دلعزیز تھے اتحادیوں کے خلاف ابھارنے کی سب کوششیں کیں۔ عجیب سی بات ہے کہ ترکی رائے عام اس وقت اتحادیوں کے خلاف ہوئی اور نوجوان ترکوں کے دلائل کو اس نے اس وقت صحیح تسلیم کرنا شروع کیا جب نوجوان ترک برسراقتدار نہ رہے۔ یونانی قبضہ اور انگریزوں کی شہ پر یونانی مظالم اُدھر اور زمیں فرانسیسیوں کی سرپرستی میں ارمنیوں کے مظالم جب سامنے آئے تو لوگ کہنے لگے کہ دیکھا اتحادیوں کے انصاف اور حکومت کا یہ نمونہ ہے اور اسے اتحاد و ترقی والوں نے جنگ سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں عام آبادی ہی نہیں بلکہ خود اتحاد و ترقی کے اکثر اہل فکر اور با اثر لوگ جنگ کے مخالف تھے۔ صرف انور پاشا اور ایک چھوٹا سا فوجی گروہ جنگ کے موافق تھا اور انکے ساتھ کچھ ایسے لوگ جو جنگ سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا بات تھی لوگ جنگ کو ناممکن سا سمجھتے تھے۔ اگرچہ ڈرتے بہت لوگ تھے اور بے چین بھی تھے اسلئے کہ ترکی میں حکومت فوجی کی قوت سے واقف تھے۔

شروع اکتوبر میں دو شخص میرے پاس ملنے آئے اور ان سے دو یادگار گفتگوئیں ہوئیں پہلے جمال پاشا، وزیر بحر آئے۔ اور بیگم جمال کے ساتھ میرے یہاں آکر چا پی۔

میں نے ان سے صاف صاف کہا " مجھے تو ڈر ہے کہ ہماری حکومت جنگ کیطرف

چل رہی ہے" وہ ہنسے گویا میں نے کوئی بے معنی بچوں کی سی بات کہی۔ مجھے انکے چہرہ کا نہایت قطعی انداز ابتک یاد ہے جب انہوں نے کہا "نہیں، نہیں، خالدہ خانم، ہم جنگ میں شریک نہ ہونگے،" میں نے پوچھا "اور وہ کیسے؟" جواب ملا! "میرے پاس اتنی قوت ہے کہ میں ان لوگوں کو سمجھا سکوں کہ جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ اگر میں اس میں ناکام ہوا تو میں استعفیٰ دیدوں گا۔ جنگ میں شامل ہونا سخت حماقت ہوگی"

تین دن بعد جاوید بے ملنے آئے۔ یہ کچھ مایوس اور شکستہ خاطر سے تھے اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت پریشان ہیں۔ میں نے ان سے بھی وہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا "اگر یہ لوگ جنگ میں شریک ہوئے تو میں مستعفی ہوجاؤں گا۔ ہم اگر جیت بھی گئے تو تباہ ہوجائیں گے۔ اور لوگ بھی ہیں جو استعفا دیدینگے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم انہیں جنگ میں شامل ہونے سے روک لیں گے۔ طلعت بھی اس وقت جنگ کے مخالف ہیں"

اسی مہینہ کی اٹھارہ تاریخ کو ترکی جنگ میں شریک ہوگیا۔ جاوید بے اور انکے کچھ ساتھیوں نے استعفا دیدیا لیکن جمال پاشا مستعفی نہ ہوئے۔

چند ہی روز بعد جمال پاشا رخصت ہونے آئے۔ یہ تیسرے لشکر کے سردار مقرر ہوئے تھے یعنی روسی محاذ پر۔ خوب بشاش تھے اور اپنی رائے میں تبدیلی کے وجوہ بیان کرتے تھے۔ ان کی خاص دلیل وہی روس والی دلیل تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر اتحادی جیتے تو قسطنطنیہ روس کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اور چونکہ غیر جانبداری کی صورت میں اتحادی کوئی کافی ضمانت نہیں دیتے اس لئے ترکی فوج کا یہ فرض اول ہے کہ روس کے مخالفوں کی مدد کرے۔ اور اگر جرمن اور ترک جیتے جس کا انہیں کامل یقین تھا، تو ترک ایسے آزاد ہوجائیں گے جیسے کبھی پہلے نہ ہوئے تھے اور خارجی مداخلتیں اور مراعات بالکل ختم ہوجائیں گی۔

آج یہ سوچکر کیسا افسوس ہوتا ہے کہ اگر اتحادی اسوقت مراعات کے ہٹا دینے پر راضی ہوجاتے اور قسطنطنیہ کی بابت کوئی یقین دلا دیتے تو فوجی جماعت ترکی کو جنگ میں

نہ گھسیٹ سکتی۔

جاوید بے معتوب تھے اور انکی سختی سے نگرانی ہوتی تھی، کچھ دنوں تو یہ گھر سے نہ نکلے۔ انتہا پسند اور اتحاد و ترقی والے نہایت سختی سے ان پر حملے کرتے تھے اور بعض نے انہیں غدار تک ٹھہرایا۔

جمال پاشا کو بعد میں چوتھے لشکر کا سردار بنایا گیا اور انہیں شام بھیجا گیا۔ انکے سپرد مصر پر حملہ کرنا اور انگریزوں کو مصروف رکھنے کا کام ہوا تا کہ انگریز شامی محاذ پر اپنے لشکر جمع کر دیں گیلی پولی کی دل ہلا دینے والی مدافعت۔ ترکی میں جنگ کا سب سے پہلا اہم واقعہ تھا۔ میں یہاں اس کی فوق البشری شجاعت اور قربانی کا ذکر نہ کروں گی۔ میرے نزدیک تو ساری عزت اور سارا فخر عام ترکی سپاہی کا حق ہے جسکا نہ کوئی نام جانتا ہے نہ پتہ اور جو متحرک تصاویر میں شخصیت وقت کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔ مسٹر میسفلڈ کی کتاب "گیلی پولی" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز جیسی قوم نے اس معرکہ میں کتنے آدمی اور کتنا سامان کیا۔ اور اسی کتاب سے ترکی فوج کی قوت مدافعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جس نے اتحادیوں کی افواج اور بیڑوں سے گیلی پولی کو بچایا۔ سپاہیوں میں نہایت قومی احساس تھا کہ وہ ترکی ارض پاک کے دروازوں کی حفاظت کر رہے ہیں اس سے زیادہ احساس اس بات کا تھا کہ وہ اس روسی بھوت سے لڑ رہے ہیں جس کی شکل اتحادی افواج نے انکے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی۔

در دانیال پر جب اتحادیوں کا حملہ ہوا ہے تو بہت سے خاندان قسطنطنیہ سے آئے تھے۔ اور میں نے بھی اپنے بچوں کو بروسا بھیجدیا تھا۔ تقریباً ۵ مارچ کے معرکہ عظیم کے وقت یوسف اکچورہ نے قوم پسند مصنفوں کو "ترک یوردو" کے دفتر میں جمع ہونے کی دعوت دی اور نہایت سنجیدگی سے اس پر غور شروع ہوا کہ اگر اتحادی افواج در دانیال سے گزر کر قسطنطنیہ میں داخل ہوگئیں تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اس مصیبت میں انہیں قسطنطنیہ

ہی میں ٹھہرنا چاہئے یا کسی محفوظ تر مقام پر جا کر کام کرنا اور لوگوں کے سینوں میں قومیت کے جذبات اور تخیلات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بڑی لمبی لمبی نشستیں ہوئیں، اور طولانی بحثیں، اور سب نے آخر میں جا کر ایک مبالغہ آمیز سی شکل اختیار کی۔ لیکن انکی گرمی اور حدت کبھی کم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر عدنان چونکہ حاضرین میں سب سے زیادہ ٹھنڈے آدمی سمجھے گئے اسلئے صدارت انہیں کے سپرد ہوئی۔

پہلے تو ہر ایک کو اپنا قومی عقیدہ بیان کرنا پڑا۔ نوجوان مصنفوں کوپرلو نواد اور عمر سیف الدین نے کہا کہ قوم پرستی نام ہے نفس قومی کی تلاش اور دریافت کا اور قوم کے افراد کو اسکا درس دینے کا۔ نفس قومی کے عناصر بنیادی کے تعین میں یہ دونوں غیر معین سے خیالات رکھتے تھے۔ عمر نے جو بعد کو میرا دوست ہو گیا تھا ایک دفعہ مجھ سے ہنسی ہنسی میں اقرار کیا کہ ہمارا استاد کوک الپ ضیا، جو اسوقت قسطنطنیہ میں موجود نہیں وہ تو ہمیشہ نفس قومی کے اجزا کو بدلتا رہتا ہے۔ ہم لوگ کبھی کوئی صاف بات اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ کہیں آگے چل کر اسکے بالکل خلاف بات نہ پیش کرنی ہو!

آغا اوغلو احمد نے جو ایک پرانے قوم پرست ہیں، کہا کہ قومیت ایک مشترک ذہنیت کا نام ہے جو چار عناصر سے مرکب ہے یعنی زبان مذہب، نسل، اور رسوم۔ ان چار عناصر پر اور انکے مدارج اہمیت پر پھر سارا مباحثہ ہوتا رہا۔ چونکہ ترکی قوم پرستی کے سیاسی رجحانات کا دارومدار بڑی حد تک ان عناصر کے مدارج کی اہمیت ہی پر تھا اس لئے یہ بحث نہایت مفید اور سبق آموز تھی۔ حسین زادہ علی نے جو ایک محترم رکن اتحاد و ترقی اور پرانے قوم پرست تھے، کہا کہ مذہب اور زبان اہم تر عناصر ہیں۔ اور نسل اس کے بعد آتی ہے۔ انہوں نے فرمایا "ایک مسلم حبشی جو ترکی بولتا اور اپنے کو ترک کہتا ہے مجھ سے بہ نسبت اس ماگیار کے قریب تر ہے جو نسلاً ترک ہے"، وہ گویا ذرا نرم شکل میں اتحاد اسلامی کے حامی تھے، نوجوان لوگ نسل اور زبان پر زیادہ مصر تھے اور مذہب کو سب سے کم اہمیت کی چیز بتلاتے تھے یہ گویا

"اتحاد تورانی"، کے حامی تھے۔

آخر میں جلسہ نے یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ جو مصنف ترکی قومیت کے خیال کا مجسمہ ہیں انہیں قسطنطنیہ میں ٹھہرنا یا کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ اس موقع پر ایک نوجوان صحیفہ نگار محمد علی توفیق نے ایک جوشیلی تقریر کی جو خطابت کی تاثیر سے پر تھی اور جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ یہ مصنف یہی نہیں کہ قسطنطنیہ میں ٹھہریں بلکہ انہیں کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے کو شہید کرائیں اور قومیت کے اعلان پر اپنے خون سے مہر لگائیں۔ اگرچہ ان دنوں اپنے کو شہید کرا دینا کچھ مشکل نہ تھا پھر بھی جو مصنف اس شرف کے اہل سمجھے گئے تھے انکی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ محمد امین جن کا نام سب سے اول تھا اپنے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔

میرا نام بھی انتخاب میں آیا تھا اور میں سوچتی تھی کہ محمد امین اسوقت موت کے خیال میں کیسے محو ہیں۔ بہت سے دوستوں کی آنکھوں میں نمی دکھائی دیتی تھی اور میں تو سمجھتی ہوں کہ ان پر غم ایام میں یہ سب سے بڑا مذاق تھا جو کیا گیا۔

دردانیال کا حملہ تو گذر گیا، لیکن مشرقی اناطولی محاذ پر گڑ بڑ شروع ہو گئی۔ ارمنوں کے اخراج اور اس کے خونی نتائج کے متعلق افواہیں برابر پھیل رہی تھیں۔ چرچا تھا کہ ارمنیوں نے ترکی گانوں جلا ڈالے اور ترکوں کا قتل عام کیا۔ اسکا بھی چرچا تھا کہ انکے انقلابی مرکز ترکی فوج کے لئے اندرون ملک میں پریشانی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ان واقعات کے بہت دنوں بعد حکومت نے ایک کتاب شائع کی جس میں مشرقی اناطولیہ کی سازشوں کو طشت از بام کیا گیا۔ جب اخراج شروع ہوا تو عام رائے دل سے حکومت کی مخالف تھی لیکن ملک جنگ میں مبتلا تھا اور اس مسئلہ کے متعلق کوئی چیز شائع بھی نہ ہوئی تھی۔ ترکی آبادی کے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ اگر عام طور پر حکومت کی یہ کارروائی ناپسند کیجاتی تھی لیکن لوگوں کو ترکی کے شدید خطرے کا پورا احساس تھا اور سب سمجھتے تھے کہ اگر فوج کو شکست ہوئی تو ترک لٹ جائیں گے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے لوگ جانتے تھے کہ

ارمینوں کے انقلابی مرکز ترکوں کے خلاف اتحادیوں کی کارروائیوں کو کامیاب بنانے کے لئے کمینگاہ کا کام دیتے تھے۔ اس سیاسی دلیل کے علاوہ جس کو ارمینوں نے خواہ مخواہ اپنی سفاکانہ اعمال سے حق بجانب بنا دیا تھا ایک معاشی دلیل بھی تھی جس کی اخلاقی تائید جرمن کرتے تھے۔ وہ یہ تھی کہ ارمینوں کے معاشی تفوق کو ختم کیا جائے اور اس طرح منڈیاں ترکوں اور جرمنوں کے لئے خالی ہوں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ جس سیاست خارجی نے ترکوں اور ارمینوں دونوں کو قتل کرایا وہ خوب جانتی تھی کہ فطرت معاشی دنیا میں بھی خلا کو پُر کر دیتی ہے اور ترکی اقوام کے باہمی قتل سے جو جگہیں خالی ہونگی انہیں یورپی ممالک کی فاضل آبادی ہی پُر کرے گی۔

دو چیزیں انسان کو اپنے نوع کے قتل پر آمادہ کرتی ہیں: متخیلین کے اصول اور وہ مادی اغراض جو ان اصولوں کی اتباع سے حاصل ہوتی ہیں۔ انہیں متخیلین کے اصول زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، اس لئے کہ اگر آدمی ان سے اتفاق بھی نہ کرے تو ان کی عزت ضرور کرنی ہوتی ہے۔ طلعت انہیں متخیلین میں تھا۔ میں نے طلعت کو ارمینوں کے اخراج کے بعد سے بہت کم کہیں دیکھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ایک دن اس مسئلہ پر بحث کرتے کرتے غصہ میں آگئے اور ذرا درشت لہجہ میں کہا "خالدہ خانم! دیکھو۔ میرا دل بھی ویسا ہی اچھا ہے جیسا تمہارا، اور انسانی تکالیف کا خیال مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا لیکن یہ شخصی معاملہ ہے اور میں دنیا میں اپنی قوم کی خدمت کے لئے زندہ ہوں اپنی احساسات کی خاطر نہیں۔ کسی مقدونی یا ارمنی لیڈر کو جب کبھی ساری دنیا میں کہیں موقع ملتا ہے تو وہ چوکتا نہیں۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں اتنے ہی ترک اور مسلمان قتل ہوئے لیکن دنیا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جبتک کوئی قوم اپنے اغراض کے لئے پوری کوشش کرتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس وقت تک دنیا اس کی قدر کرتی ہے اور اس کے اعمال کو اخلاقی مانتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے

میں اپنی جان دینے کو تیار رہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے جان دونگا۔" ۱۹۲۲ء میں ایک ارمنی نے انہیں برلن میں گولی کا نشانہ بنایا۔

۱۹۱۶ء میں میں نے ترک اوجک، میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی، حاضرین زیادہ تر اتحاد و ترقی والے تھے، تقریر ارمنی مسئلہ اور قومی معیشت کے متعلق تھی۔ آج ارمنی مسئلہ کے متعلق میرا جو خیال ہے اس وقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے ارمنی مظالم کا علم نہ تھا اور میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ اگر دوسری جگہ ایسے ہی حالات ہوتے تو دوسرے ہم سے سوگنا زیادہ سخت ثابت ہوتے چنانچہ اس تقریر میں میں نے نہایت خلوص اور عقیدت کے ساتھ خونریزی کی مخالفت کی اور اپنا یہ یقین ظاہر کیا کہ اس سے ظالموں کو مظلوموں سے زیادہ نقصان ہوگا۔ کوئی سات سو آدمی موجود تھے۔ میں نے تقریر ختم کی تو نوجوانوں نے خوب تالیاں بجائیں لیکن ایک طب کا ایک نوجوان طالبعلم جس کا نام شکری افلاطون تھا، اٹھا اور حمداللہ صبحی کو پکار کر کہا: "جناب صدر، میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حق دوسری طرف ہے" ایک اور شخص اٹھا اور بولا "شکری افلاطون جس طرز کی گفتگو کرنا چاہتا ہے اسکی اجازت اوجک کو نہ دینی چاہیئے۔ ہم اس قسم کا ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔" میرے نزدیک بڑی ناواجب بات تھی، لیکن صدر شکری افلاطون کی تقریر سننے پر حاضرین کو آمادہ نہ کرسکے۔ دوسرے ہی دن مجھے ارمنیوں کے ہاتھوں ترکوں کے قتل عام کے متعلق ایک بڑی سی کتاب ملی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ اتحاد و ترقی کے بعض اراکین مجھ پر بہت خفا ہوئے اور یہ تجویز ہوئی کہ مجھے سزا دیجائے لیکن طلعت پاشا نے انکار کردیا۔ اور کہا "وہ اپنے ملک کی خدمت جس طرح ٹھیک سمجھتی ہے کرتی ہے۔ اسے اپنے خیالات ظاہر کرنے دو وہ سچی مخلص عورت ہے۔" البتہ ان نوجوان اہل فکر کی تعداد جو مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے بہت گھٹ گئی، لیکن طلعت پاشا نے اپنے دوستانہ رویہ میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود غزنوی کا حصہ

(۲)

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عہد کے خلفاء وسلاطین خصوصاً خلفائے عباسیہ کے ذوق علم نے نہ صرف ایران بلکہ یونان وروم اور ہندوستان کے علما کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیا تھا خود عربوں پر اس وقت مذہبی جوش کا پورا تسلط تھا۔ علاوہ بریں فطرتاً وہ بجائے ذہنی ودماغی کاوشوں کے عادی ہونیکے سیاست وتدبر ملکی فتوحات کی طرف زیادہ مائل تھے اس لئے انہوں نے اگر اسوقت عربی علوم وفنون کی نشر واشاعت میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تو یہ قدرتی بات تھی لیکن خود ایران اسوقت عرب مسلمانوں کی محکومی میں داخل تھا۔ اس کی زندگی اور اسکی قومیت کی بقا کی اگر کوئی صورت ہوسکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ وہ فاتح اور غالب قوم کی مذہبی سرگرمیوں اور اسکی اشاعت علوم وفنون کی کوششوں میں پرجوش اعانت کرے۔ بلاشبہ ایرانیوں نے ایسا کیا اور بعض حیثیتوں سے محکوم قوم حاکموں سے بھی فوقیت لی گئی۔ عرب وایران کے اسی ذہنی اختلاط نے وہ شاندار علمی کارنامے انجام دے جن پر آج اسلام کو بجا طور پر فخر وناز ہے۔ پروفیسر براون لکھتے ہیں۔

> یہ فرض کر لینا کسی طرح صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی فتح ایران کے بعد دو تین صدیاں ایران کی ذہنی تاریخ کا سادہ ورق تھیں۔ برخلاف اس کے یہ نہایت عجیب اور بے نظیر دلچسپیوں کا دور گزرا ہے عہد قدیم اور عہد جدید کے تداخل وانعقاد کی تشکیل۔ اور خیالات کے باہمی تجاذب اور اعتدال کا زمانہ تھا، کسی معنی

میں بھی یہ جمود یا موت کا زمانہ نہ تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے کچھ مدت
کے لیئے ایران کی علٰحدہ ہستی رک گئی، کیونکہ یہ اُس عظیم الشان اسلامی سلطنت
میں جذب ہو گیا۔ جو جبل الطارق سے لیکر جیحون تک وسیع تھی لیکن اقلیم
دماغی میں اس نے بہت جلد وہ غلبہ حاصل کر لیا جس کا استحقاق اہل ایران
کی قابلیت اور فطری جودت و ذکاوت نے اسے دے رکھا تھا۔

غرضکہ اہل ایران میں ذہنی و دماغی جوہر پہلے سے موجود تھے ضرورت اس بات
کی تھی کہ ان خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جائے چنانچہ اسلام نے یہ اہم کام کیا اور اس
بیداری کے بعد ایرانیوں نے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے جن سے خود اسلام
کی وقعت و عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

مصنف مراۃ الشعر نے قدیم فارسی کے وجود کے ثبوت میں باربد اور اُس کی شاعری
کا بھی نہایت اہمیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے لیکن مولانا مسلم عظیم آبادی کی رائے اس
معاملے میں بالکل مختلف ہے:۔

قدیم فارسی شاعری کی تلاش میں باربد اور تین چار اور بھاٹوں کا تذکرہ
کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو پہلی صدی کے آخر میں گذرا
ہے۔ باربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے۔ باربد ایک بھاٹ تھا۔ جو خسرو پرویز
کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب
کوئی ناگوار بات اُس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار، باربد کی
موسیقی اور بول کے ذریعہ سے آگاہ کرتے۔ چنانچہ بادشاہ کے شدیز نامی
گھوڑے کی موت کی خبر باربد نے اُسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی
نظم میں اس کو بتایا ہے مگر عربی میں اس قسم کے افسانے اور ٹچکلے بہت ہیں
جن کو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے . . . . . .

اگر باربد کی اصلیت تسلیم بھی کرلیجائے تو اس کے بول شعر نہ تھے چنانچہ عوفی کا بیان ہے :-

"نوائے خسروانی کہ آں را باربد درصورت دادہ است بسیار است فاما ازوزن شعر وقافیہ و مراعات نظائران دوراست بداں سبب تعرض کردہ نیامد"

درحقیقت بھٹئی اور شاعری دو چیزیں الگ الگ ہیں اور بھاٹوں کا وجود جائے تہذیب وتمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت وبدویت کی نشانی رہا ہے آجتک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پائے جاتے ہیں جو قومی افسانے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹلینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے درباروں میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچا کرتے تھے جنکی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سروالٹر سکاٹ نے اپنی تصانیف میں کھینچی ہے۔ ...... سرحدی پٹھانوں میں بھی بھاٹ موجود ہیں۔ مگر اُنکا وجود تمدن وتہذیب اور علم وادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں "

علامہ شبلی نے بھی باربد اور اسکی شاعری کے متعلق کم وبیش انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قدیم شاعری کے ثبوت میں اکثر یہ دوشعر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

پژیرا بہ گیہاں نوشہ بدی   جہاں را بہ دیدار توشہ بدی

منم آں پیل دماں ومنم آں شیر یلہ   نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

اسمیں سے پہلا شعر شاہنامہ میں بھی موجود ہے جب کوئی درباری بادشاہ سے عرض معروض کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس شعر کو پڑھ لیتا ہے، دوسرا شعر بہرام گور کا بتایا جاتاہے ایک مرتبہ شیر کا شکار کرکے پرجوش تفاخرانہ لہجہ میں بے ساختہ اُس کے منہ سے یہ موزوں الفاظ نکل گئے۔ بہرام گور کے متعلق مشہور رہے کہ اُس نے عرب میں تربیت پائی جو اُس زمانہ

میں شعر و شاعری کا مرکز تھا اس لئے اس میں یہ مذاق پیدا نہ ہونا تعجب تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے کچھ عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں مگر اس فارسی "شعر" کے متعلق عوفی کا خیال ہے کہ یہ صرف چند موزوں الفاظ ہیں انکو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ لب الالباب میں اس شعر کو جس طرح لکھا ہے وہ بہ نسبت نظم کے نثر سے زیادہ مشابہ ہے لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں نے جنکا تمام تر ماخذ لب الالباب ہے اصلاح و تحریف کے بعد بالکل فارسی بحر میں کر دیا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں ناممکن تھا کہ شعر و شاعری کا وجود نہ ہوتا خصوصاً جبکہ وہاں فطری صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں لیکن علامہ شبلی اسکا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

"ایران کی سینکڑوں تلمیحات اور روایتیں آج موجود ہیں ایران کا فلسفہ اور علوم نہیں رہے لیکن علمائے ایران کے نام اور اُنکے اقوال آجتک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ یورپ کے محققوں نے پہلوی زبان کی بہت سی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی ہیں لیکن چار شعر بھی ہاتھ نہیں آئے فارسی کے قدیم اشعار نہ ملتے تو نہ ملتے لیکن شعرا کا نام تو زبان پر ہوتا"۔۔۔۔

اس سے پہلے کہیں تذکرہ ہو چکا ہے کہ جب دولت عباسیہ میں ضعف و انحطاط شروع ہوا تو تمام بڑے بڑے صوبے خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے، اور انکی بجائے مستقل حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت خراسان میں قائم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دربار کی شان و شوکت کے لئے دوسرے لوازم کے ساتھ شاعروں کا ہونا بھی ضروری تھا چنانچہ اس زمانہ میں متعدد فارسی شعرا پیدا ہو گئے یہ تیسری صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ تھا فارسی شاعری نے حقیقت یہ ہے کہ اسی زمانہ میں جنم لیا۔ ورنہ اس سے پیشتر کم و بیش دو سو سال تک ایران میں تقریباً بالکل خاموشی چھائی رہی۔ یہ سچ ہے کہ اس عرصہ میں کبھی کبھی کچھ چرچا ہو جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے نہانخانہ

فطرت میں شاعری کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں لیکن کوئی ہوا دینے والا نہ تھا اس لئے عرصہ تک وہ یونہیں دبی پڑی رہیں اور جب یہ بات حاصل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایران میں شاعری اس طرح پھیل گئی جیسے ”بن میں آگ لگ جائے“، لیکن یہ امر ہنوز حل طلب ہے کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر اس قدر طویل عرصہ تک ایرانیوں کی زبان گنگ رہی اور ایران ایک شاعر بھی پیدا نہ کرسکا۔ مولانا شبلی نے اس کے مختلف اسباب بتائے ہیں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

”اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا اس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کردیتا تھا کہ اُسے سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا۔ خود عرب کو دیکھو وہ ملک جس کے درودیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی۔ اسلام کے آتے ہی دفعۃً چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ولید کے زمانہ میں جب شاہانہ دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی اس لئے شاعری بھی عربی رہی شعرا جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح اُنکی زبان کیونکر سمجھتا اور نہ سمجھتا تو اُنکی داد کیا دیتا“

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون میں ادب و انشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کرلیا تھا اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اُس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں یعنی ایران، مصر، شام، اندلس ان تمام ممالک میں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کردیا اس لئے عرب کی شاعری کے آگے دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری

کرتے شرم آتی تھی، خراسان، شام، مصر وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہوگئے تھے، لیکن جو کچھ کہتے عربی میں کہتے تھے ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عجمی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے (۱)

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ اسلام جب ایران میں آیا تو ایک مدت تک عرب براہ راست حکمراں رہے حتیٰ کہ بنو امیہ کے زمانہ تک صوبوں اور اضلاع کے حاکم بھی عرب ہی ہوتے تھے عباسیوں کے دور میں وزارت عجم کے ہاتھ میں آئی اور برامکہ کے مشہور خاندان نے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا کہ عنان سلطنت بھی گویا اس کے قبضہ میں آگئی ..... شخصی سلطنتوں میں علوم و فنون بھی سلطنتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں، اس لئے جب تک ایران میں خالص عرب کی حکومت رہی فارسی شاعری نے زبان نہیں کھولی" (۲) -

لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو اپنی زبان کی طرف سے بے توجہی نہ تھی اس میں شک نہیں کہ عربی علم و ادب میں انہوں نے زبردست کمال حاصل کیا اور علم و ادب کی ہر شاخ میں مہارت پیدا کی، یہ بھی صحیح ہے کہ شروع شروع میں عربی علم و ادب نے اُنکے دل و دماغ کو اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ اپنی زبان نظروں میں ذرا بھی نہیں جچتی تھی، پھر بھی اپنی ملکی زبان کی محبت دل سے کیونکر دور ہوسکتی تھی۔ عربی میں وہ جو کچھ کہتے تھے محض خلفا و سلاطین کی قدر دانی اور صلہ کی خاطر۔ برعکس اس کے فارسی شاعری کا کوئی قدردان نہ تھا اس لئے کچھ کہتے بھی تو حوصلہ افزائی کون کرتا اور صلہ کہاں سے پاتے لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں انہیں ذرا سا بھی موقع مل جاتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ

---

(۱) شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۷ و ۱۸ (۲) شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۱ و ۱۲

نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں اس کی ایک مثال نظر آتی ہے مامون الرشید کی ماں عجمی تھی خود دربار میں عجمیوں کی کثرت تھی اس لئے عجمی شعرا کو اپنی زبان زندہ کرنے کے لئے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور عباس مروزی نے یہ فارسی قصیدہ مامون کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود برفرقدین — گسترانیدہ بفضل وجود در عالم یدین
مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را — دین یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین
کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعری نگفت — مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت — گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

مامون نے اس کے صلہ میں ہزار اشرفیاں دیں، لیکن مامون پھر بغداد چلا گیا اسلئے فارسی شاعری پر خاموشی چھا گئی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ دولت عباسیہ کے زوال کے وقت پہلا شخص جس نے خود مختاری اور استقلال کی جانب قدم بڑھایا ہو خراسان کا حاکم عام یا گورنر تھا۔ اس خاندان نے جو خاندان طاہریہ کے نام سے مشہور ہے کم و بیش ۵۴ برس تک شاہانہ کر و فر کے ساتھ خراسان پر حکومت کی خود یہ خاندان عربی النسل تھا اور فارسی سے بہت کم ذوق رکھتا تھا لیکن چونکہ حکومت خراسان میں تھی اور شاہانہ شان و شوکت کے لئے شاعروں کا وجود ضروری تھا، اس لئے حنظلہ۔ محمود وراق فیروز مشرقی وغیرہ کئی شاعر پیدا ہو گئے۔ یہ فارسی شاعری کی ابتدا تھی اور یہیں سے اُس نے آہستہ آہستہ ترقی کے قدم اٹھانا شروع کئے۔ یعقوب صفار اور اس کے خاندان کے عہد میں بھی ابو سلیک گورگانی وغیرہ دو ایک اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن فارسی شاعری کو حقیقی معنی میں ترقی و عروج سامانی خاندان کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس خاندان کی قدر افزائیوں سے فارسی شاعری میں چار چاند لگ گئے اور تھوڑے عرصہ میں شاعری نے حیرت انگیز ترقی کر لی، ایران میں عربی اثرات کے خلاف ردعمل

کی ابتدا بھی یہیں سے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامانی خاندان کا سلسلہ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا ہے اس لئے اس خاندان میں حکومت و اقتدار کے آنے کا مطلب یہی تھا کہ عجمی شان و شوکت جاہ و جلال دوبارہ عود کر آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا عجمی و ایرانی علوم و فنون اور ادبیات کی سرپرستی ہونے لگی شعرائے ایران کی حوصلہ کے موافق قدر دانی کیجانے لگی۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو اس وقت کی زبان میں قلبند در منظوم کرنے کا خیال اسی عہد میں پیدا ہو اور دقیقی کو یہ کام سپرد کیا گیا جس کی تکمیل بعد میں آکر فردوسی نے کی سامانی خاندان کی یہی قدر دانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے بہت سے باکمال شعرا پیدا کر دئے فارسی زبان کو انہوں نے دوبارہ زندگی بخشی جو خود انکی اور انکے آباؤ اجداد کی زبان تھی اور جو عربی کے مقابلہ میں دوسری زبانوں کی طرح مٹ جانیوالی تھی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ پیدا ہو کہ عربی زبان کی جو ہیبت ایرانیوں کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی وہ زائل ہونے لگی اور اُن کی سمجھ میں آیا کہ دوسری زبانوں کی طرح فارسی میں بھی بہت کچھ صلاحیتیں موجود ہیں۔ خود سامانی خاندان قدر دان علم و فن ہونیکے ساتھ صاحب کمال اور سخن سنج تھا اس نے دیکھا کہ ایرانی اپنی قومی و ملکی خصوصیات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی محنت و قابلیت ایک غیر زبان پر صرف ہو رہی ہے انکی دور اندیش نظر نے یہ بھی تاڑ لیا کہ اگر کچھ دنوں اور یہی رفتار رہی تو ایران اپنا قومی و ملکی عزّ و وقار کھو بیٹھے گا۔ اس لئے اس خاندان کے حکمرانوں نے ایرانی علوم و ادبیات کی قدر افزائی میں شاہانہ فراخ دلی اور سیر چشمی سے کام لیا فارسی شعرا کے بیش قرار مشاہرے مقرر کئے بہت سی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا کتابیں لکھوائیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی۔ غرضکہ انہوں نے عرب کے مقابلہ میں عجم کو زندہ کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو انکے امکان میں تھا چنانچہ اس زمانہ میں فارسی کے ان گنت شعرا پیدا ہو گئے۔ جن میں رودکی[1]، دقیقی[2]، ابو شکور بلخی

اور مروزی وغیرہ قابل ذکر ہیں - ان میں سے ہر ایک نے علیٰ قدر مراتب فارسی شاعری

---

(۱) رودکی اس دور کا مشہور شاعر ہے تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔ سامانیوں کے عہد میں سینکڑوں شعرا تھے لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے شریف گورگانی کہتا ہے۔

ازیں چندیں نعیم جاودانی   کہ ماند از آل سان وآل ساماں

ثنائے رودکی ماندست ومدحش   نوائے باربد ماندست ودستاں

رودکی کا اصلی نام محمد جعفر، رودک نخشب یا نسف کے ضلع میں ایک گاؤں تھا بعض کے نزدیک وہ رودک (ایک باجہ کا نام) اچھا بجاتا تھا۔ مادرزاد اندھا تھا ۸ سال کے سن میں قرآن حفظ کیا فن قرأت میں تکمیل کی، شاعری بھی اسی وقت سے شروع کر دی ساتھ ساتھ علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ آواز اچھی تھی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں طاق تھا۔ آخر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں رسائی ہوئی بادشاہ کی جانب سے زیادہ قدردانی کا اظہار رہا، اور رفتہ رفتہ رودکی کو اسقدر دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سواری میں دو سو زریں کمر غلام رکاب کے ساتھ چلتے سلطان نصر بن احمد نے کلیلہ دمنہ نظم کرائی اور ۴۰ ہزار درہم انعام دیئے عنصری کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

(تفصیل کے لئے دیکھو شعر العجم جلد اول بیان رودکی)

(۲) اصل نام منصور بن احمد وطن بخارا - ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابو المظفر نے کی لیکن جب اسکا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، دقیقی نے یہ خدمت قبول کی اور کم وبیش ۲۰ ہزار شعر لکھے جو آج شاہنامے میں شامل ہیں مثنوی کے ساتھ قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی یہ دو شعر اسی کی غزل کے ہیں۔ (بر صفحہ ۱۱۸)

کو ترقی دینے کی زبردست کوششیں کیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ طاہریہ خاندان سے لیکر
اس وقت تک فارسی شاعری نے طفولیت سے نکل کر کس طرح جوانی میں قدم رکھا ہو دہی
زبان جس میں پہلے لوگوں کو ایک شعر بھی کہتے شرم آتی تھی تھوڑی مدت میں کس طرح بام عروج
پر پہنچ گئی اور کس طرح اُسکا دامن علمی وادبی خزانوں سے مالا مال ہو گیا، یہ درحقیقت ایرانی
امرا و سلاطین کی قدر دانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے ایران کی دماغی کاوشوں
کے سیلاب کا رُخ پھیر دیا۔ عربی ایک غیر ملکی زبان تھی پھر بھی ایرانیوں نے عربی ادب اور
علوم و فنون کے حصول میں ایسی حیرت انگیز مہارت، ذہانت اور طباعی کا ثبوت دیا کہ
خود عربوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں، فارسی خود گھر کی زبان تھی اور جب انہیں خود اپنی
زبان کو ترقی دینے کا موقع ملا تو اس میں انہوں نے اور بھی کمال دکھا دیا اور تھوڑی
سی مدت میں اتنی ترقی کر لی کہ دوسری قوموں کو اس کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا
تاہم چونکہ امرا و سلاطین کی عام طور پر توجہ شاعری کی طرف تھی اس لئے اہل ملک کا بھی

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد — آرے دہد ولے بہ عمر دگر دہد
من عمر خویش را بہ صبوری گزاشتم — عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے جس کے چار شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

روا فگندا ے صنم ابر بہشتی — زمیں را خلعت ارد ے بہشتی
زمیں برساں خون آلودہ د — ہوا برساں خون آلودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک — مثال دوست بر صحرا نوشتی
بتے رخسار او ہمرنگ یاقوت — مئے بر گونہ جامہ کنشتی
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی — بجائے نرمی وجائے درشتی

دقیقی شاہنامہ نظم کرنے میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان نے ۔ ۔ ۔ قتل کر دیا (شعر العجم جلد اول)

زیادہ تر رجحان اسی طرف رہا۔ اور تھوڑے سے وقفہ میں فارسی شاعری کا مذاق گھر گھر پھیل گیا غرضکہ فارسی زبان اپنی ترقی و عروج کے لئے بڑی حد تک ایرانی امرا و سلاطین کی رہین منت ہے۔ سامانی خاندان کے علاوہ ایران میں اور بہت سے خاندانوں نے عروج حاصل کیا اگرچہ ان میں آپس میں اپنے جاہ و اقتدار کے لئے گہری رقابت اور دشمنی ہوتی تھی اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے موقع کا منتظر رہتا تھا لیکن پھر بھی انہیں کوئی چیز مابہ الاشتراک تھی تو وہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا جذبہ تھا ان میں سے اکثر نہ صرف یہ کہ شعرا اور علما کے قدرداں ہوتے تھے بلکہ خود بھی اُنہیں علم و ادب میں اچھی خاصی دستگاہ ہوتی تھی۔ شاعری کی ترقی میں انکی نکتہ سنجی اور قابلیت علمی کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ شاعر کی قدر و منزلت انکے یہاں حکومت کے کسی اہم رکن سے کسی طرح کم نہ تھی بڑے بڑے شہنشاہ شعرا کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتے تھے شاعروں کے گھر پر ملاقات کے لئے جاتے تھے۔ مشہور سلاطین کے یہاں ملک الشعرا کا عہدہ قائم تھا جس کی بیش قرار تنخواہ ہوتی تھی ملک الشعرا کے علاوہ دربار میں اور بھی بہت سے شاعر ہوتے جو مختلف موقعوں پر مدحیہ قصائد لکھکر انعام حاصل کرتے چنانچہ محمود کے دربار میں علاوہ ملک الشعرا عنصری کے چار سو شاعر تھے۔ شعرا کی ان قدردانیوں کی تہ میں علاوہ زبان کی خدمت کے ایک اور جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور وہ یہ کہ شعر بقائے نام اور شہرت دوام کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ شریف گورگانی کہتا ہے۔

ازاں چندیں نعیم جاودانی — کہ ماند از آل ساساں و آل ساماں

ثنائے رودکی ماندست مدحش — نوائے باربد ماندست دستاں

نظامی عروضی کہتے ہیں۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد — کہ از رفعت ہمی با مہ نزا کرد

نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برجائے — مدیح عنصری ماندست برجائے

اسمیں شک نہیں کہ شاہان ایران کی یہ فیاضیاں اسراف و تبذیر کی حد تک پہنچ گئی تھیں

لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسقدر غیر معمولی نیاضی اور داد و دہش سے کام نہ لیا جاتا تو شاعری کو اس قدر فروغ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

یہ فیاضیاں اصول سلطنت کے لحاظ سے جائز تھیں یا ناجائز اسکا فیصلہ شاعری کی تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس نے شاعری کی ترقی و وسعت میں آب حیات کا کام دیا تمام ملک میں شاعری کا مذاق پھیل گیا بڑے بڑے حکما اور علما علوم و فنون چھوڑ کر شاعر بن گئے یہ فیاضیاں نہ ہوتیں تو اقلیم سخن کو، خیام، انوری، نظامی، ناصر خسرو فیضی کہاں سے ہاتھ آتے۔

غرضکہ فارسی شاعری سلاطین و امرار کے دامن دولت میں تربیت پا رہی تھی اور روز بروز ترقی و وسعت حاصل کر رہی تھی تا آنکہ سلطان محمود کا زمانہ آیا یہ وقت فارسی ادبیات کی ترقی و عروج کے شباب کا تھا۔ محمود کی ادبی سرپرستیوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور فارسی شاعری ترقی کے انتہائی منازل تک پہنچ گئی ایران کے مشہور شعرا فردوسی عنصری۔ اسدی طوسی۔ منوچہری۔ فرخی۔ حکیم سنائی جن میں سے ہر ایک یکتائے روزگار ہے۔ سب اسی عہد کی پیدا وار ہیں۔

رائنر ماریا رلکے

(نمبر ۲)

(مئی کے نمبر میں ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب اس جرمن شاعر کے کلام کی خصوصیات بتا چکے ہیں۔ اب وہ اسکی چند منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں)

آوازیں

ماخوذ از "دس بوخ در بلدر"

عنوان

امیر اور خوش نصیب کیوں نہ چپ رہیں،
کوئی کیوں جانے کہ وہ کیا ہیں۔
لیکن محتاج تو اپنے تئیں دکھائیں گے،
وہ تو کہیں گے
کہ لوگو دیکھو میں اندھا ہوں
یا نہیں ہوں تو ہو جاؤں گا،
یا بڑی آفت ہی مجھ پر جینا،
یا میرا بچہ بیمار رہی،
یا یہ دیکھو میں پیوند ہوں اور پیوندوں پر رفو . . . .
اور شائد اتنے ہی پر بس نہیں۔
اور چونکہ لوگ جیسے سب چیزوں کو ویسے انکو
دیکھتے جاتے ہیں اور گزرتے جاتے ہیں۔

اس لئے وہ مجبوراً گاتے ہیں۔
اور ان سے اچھے اچھے گیت سننے میں آتے ہیں
البتہ آدمی زاد عجیب مخلوق ہی
اس کو بھولے راہبوں(۱) کے مل مل کر گانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔
لیکن خدا خود مصیبت کے ماروں کے گیت سننے آتا ہی اور دیر تک سنتا ہی
جب یہ محزون اسے سناتے ہیں۔

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہی یہ،
ایک نقیض ہے، ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دو نا رات چوگنا بوجھ۔
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اس کی بیرنگ بیرنگی پر
اور وہ مجھکو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو، اور سمجھتے ہو

---

(۱) ان راہبوں کیطرف اشارہ ہی جو قرون وسطیٰ میں رومن کیتھلک گرجوں میں گانے کے لئے اختہ کر دئے جاتے تھے تاکہ اُنکی آوازوں کی شیرینی قائم رہے۔

(۲) مترجم اس اندھے کیطرف نظر التفات چاہتا ہی جو ساری دنیا کو "اے باہر والو" کہکر مخاطب کرتا ہی اور جسکے درد بھرے دل اور کانوں کیلئے لوگوں کے ذرا ہٹ جانے کی آہٹ پتھروں کے ٹکرانے کی کرخت آواز سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہی کیونکہ ان آہٹوں سے اسمیں اپنی مجبوری اور معذوری کا احساس برابر تازہ ہوتا رہتا ہی۔

کہ تمہارے ہلنے بجنے کی آوازیں پتھروں سے ٹکرانے کی آوازوں سے شیریں تر ہیں -
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں۔
سنے تم نے یہ گیت ؟ کچھ تم نے تو گا نے نہ تھے یہ ،
اور گاتے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے -
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے -

شرابی کا گیت

میرے اندر نہ تھا - جاتا تھا، آتا تھا -
میں نے روکنا چاہا -
شراب نے روکا -
(اب کچھ یاد نہیں کہ کیا تھا)
پھر اس نے میرے لئے کبھی یہ چیز روکی کبھی وہ -
پھر میں نے اپنے تئیں بالکل اس کے حوالے کر دیا -
میں سڑی -

اور اب میں اس کا کھیل ہوں،
مجھے جدھر چاہے پھینکے، میری اوقات پر تھوکے،
چاہے ابھی اس جانور کے ہاتھ بیچ دے،
جس کا نام موت ہے۔
اور جب اس نے مجھ میلے کچیلے پتے کو جیت لیا
تو مجھ سے اپنی کھوپڑی کی پپڑیاں کھجائیں
اور مجھے لید کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

خودکشی کرنیوالے کا گیت۔

اور سہی ایک لمحہ۔
بار بار یہ لوگ میرے پھندے کو
کاٹ دیتے ہیں۔
کچھ دن ہوئے میں بالکل تیار تھا،
بلکہ میری انتڑیوں میں
جیسے کچھ ادھر والوں کی سی آوازیں تک آنے لگی تھیں۔۔۔
بار بار منہ میں چمچہ دئے کھڑے ہیں۔
زندگی کا چمچہ۔
نہیں، اب مجھ سے یہ نہیں نگلا جاتا
اگلنے دو خدارا اگلنے دو۔
جانتا ہوں کہ زندگی اچھی اور مزے کی چیز ہے۔
اور دنیا ایک بھری ہانڈی ہے۔

لیکن میرے خون میں وہ نہیں اترتی
میرے تو اس نے صرف سر کو پکڑ لیا ہے، سر کو۔
اوروں کے لئے پالنا ہے میرے لئے آزار،
سمجھو تو سہی لوگو کہ وہ آدمی کے حلق سے نہیں اترتی
اب تو مجھے ایک ہزار برس تک
پرہیز ہی چاہئے۔

امین کی یوسف زلیخا

دکھنی اُردو کے مواد فراہم کرنے کے سلسلہ میں اب میں پیرس کے قومی کتبخانہ سے استفادہ کر رہا ہوں مکرم دوست مسٹر یوسف حسین خاں کے حسب ارشاد ایک مضمون ناظرین "جامعہ" کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔
گر قبول افتد زہے عزو شرف۔
ہاشمی

یورپ کے عظیم الشان کتب خانوں میں جہاں دیگر زبانوں کے مخطوط محفوظ ہیں وہاں ہماری اردو کے مخطوط بھی زینت کتب خانہ بنے ہیں۔ لندن[1] کے مشہور کتب خانوں کے علاوہ پیرس اور برلن میں بھی ان کا کافی ذخیرہ ہے جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے ایک بڑے وقت کی ضرورت ہے۔

انگلستان کے کتب خانوں سے جو مواد حاصل ہوا ہے وہ کئی سو صفحات کا متقاضی ہے رسالہ معارف اور نیرنگ خیال وغیرہ کے ذریعہ کچھ حالات پیش کئے گئے ہیں۔

پیرس کا کتب خانہ Bibliothèque nationale سے موسوم ہے اس کے ذخیرہ کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہے۔ اس کی عمارت وسط شہر میں نہایت عظیم الشان اور شاندار ہے۔ برٹش میوزیم کی طرح یہاں بھی مطالعہ کے علٰحدہ[2] علٰحدہ مقام ہیں۔ انتظامی

---

(۱) لندن کے تین کتب خانوں میں اُردو مخطوط ہیں یعنی انڈیا آفس۔ برٹش میوزیم رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ اس کے علاوہ اڈنبرا۔ آکسفوڈ اور کیمبرج اور لائڈن میں بھی اس کا مواد ہے۔

(۲) برٹش میوزیم میں مطالعہ کے تین مقام ہیں۔ مطبوعہ کتب کے مطالعہ کا مقام۔ مخطوطوں کے مطالعہ کی جگہ اور مشرقی علوم کے مطالعہ کا مقام۔ مگر پیرس میں دو مقام ہیں آخرالذکر مقام علٰحدہ نہیں ہے

حالت کے لحاظ سے انگلستان کے ہر کتب خانہ کو فوقیت دیجا سکتی ہے۔ اردو مخطوطوں کی گرد آلود
حالت سے قیاس ہوتا ہے وہ عرصہ دراز سے زیر مطالعہ نہیں رہے ہیں۔ انکی کوئی علحدہ
فہرست نہیں ہے بلکہ مرہٹی۔ ہندی۔ بھاکا وغیرہ کے ساتھ ان کو شامل کرکے انڈین [illegible]
مخطوطوں سے انکو موسوم کیا گیا ہے مذکورہ کیٹلاگ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی ہے جس کا مصنف
(A. can ba.tam) ہے۔

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ کل مخطوطوں کی وضاحت کیجائے جس کے لئے کوئی اور
وقت چاہیئے۔ البتہ یہاں صرف ایک مخطوط کی صراحت کیجاتی ہے۔

زیر بحث مثنوی یوسف زلیخا کا نمبر (۸۵۲) اور ان کی تعداد (۱۴۹) اور فی صفحہ
(۱۴) سطریں ہیں نستعلیق میں لکھی گئی ہے مگر خوش خط نہیں ہے۔

یہ مثنوی محمد امین کی تصنیف ہے۔ انکے متعلق قدیم تذکرہ جات ساکت ہیں البتہ ڈاکٹر
اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا پہلا شعر بھی بطور نمونہ درج
کیا ہے۔ مؤلف اردوئے قدیم نے اسپرنگر کی صراحت کو اپنی تالیف میں اردو کا جامہ پہنایا
ہے مثنوی کے متعلق کوئی مزید اضافہ نہیں کیا۔

جہانتک میرا خیال ہے اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے کیونکہ آج تک جس
قدر کتابیں اور مضامین دکنیات وغیرہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان میں غالباً اس کا
تذکرہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس مخطوط کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔

امین کا نام محمد امین ہے یہ گجرات کے رہنے والے صوفی المشرب قادریہ طریقہ کے
بزرگ تھے عالمگیر کے عہد میں زندہ تھے اسی زمانہ میں اپنی مثنوی لکھی۔ انکے کلام سے انکو
صوفی ہونے کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ مثنوی جیسا کہ قبل ازیں ظاہر کیا گیا ہے خاصی ضخیم ہے اس کے اشعار کی تعداد (۲۱۱۴)
ہے اور تاریخ تصنیف یکشنبہ جمادی الاول ۱۱۰۵ھ۔ ان امور کو خود مصنف نے بیان کیا

ہے ملاحظہ ہو:۔

اگیارہ سوا وپر جب تو گزرے ۔۔۔ برس ہجرت محمد مصطفےٰ کے
بتیان چالیس سو پھر چودہ اور سو ۔۔۔ ہیں لکھا گودھری کے بیچ سن لیو
جمادی الاول میں اتوار کے روز ۔۔۔ اتھی تاریخ دوجی دے دل افروز
صبحی کے وقت لکھ رہیا امین رے ۔۔۔ الہی تون محبت سب کیتن دے

(ص ۱۹۸)

امین نے اس کو فارسی سے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کو گوجری سے اور کبھی "گودھری" سے موسوم کیا ہے۔ مصنف نے اکثر جگہ اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں بیان کیا کہ کس کی فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

سنو مطلب رے اب یوں امین کا ۔۔۔ لکھے گوجری میں یوسف زلیخا
ہر یک جاگہ قصہ ہے فارسی میں ۔۔۔ امین اسکوں اتارے گوجری میں

(ص ۱۰)

پڑا ہوے جو کوئی فارسی کون ۔۔۔ وہی جانے حقیقت دے سوں مون
انے جوناں پڑا ہووے بچارا ۔۔۔ سو کیا بوجھے اتون کا عشق سارا
ہیں اس کے واسطے کیتی یہ گجری ۔۔۔ حقیقت سب عیاں ہوئے انون کی

(ص ۲۹۵)

امیں آتا ہی میرے دل میں یون ۔۔۔ زلیخا اور یوسف کے قصے کون
کروں پورا نے سو ہوے خوشحال ۔۔۔ سنے اس کے جگت کے چھوڑ جنجال
الہی میں مجھے توفیق جو دی ۔۔۔ تو میں کی فارسی سین گوجری کی

(ص ۲۹۴)

مثنوی میں حسب رواج قدیمہ اول حمد ہے جس کے (۳۶) شعر ہیں اس کے بعد

نعت میں (۱۶۹) شعر اسی میں معراج کے متعلق بھی صراحت ہی پھر وہ خلفائے راشدین کی منقبت کا عنوان قائم کرتے ہیں اسی سلسلہ میں امام حسینؑ فاطمہ زہراؓ امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کی ہی۔ اس کے بعد عشق کی توصیف کرتے ہوئے قصہ کی ابتدا کی ہے۔ قصہ کو بھی عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ آخر میں خاتمہ سے پہلے عالمگیر کی مدح کی ہی اور اس کی عدالت کا ذکر کرتے ہوے دعائے خیر کی ہے۔

قاضی محمود بحری نے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی مثنوی "من لگن" ۱۱۱۲ھ میں لکھی مگر زبان کے لحاظ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اس کی زبان قاضی صاحب سی بہت صاف ہی۔ بطور مقابلہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بحری نے حمد اور نعت میں لکھا ہے:۔

لے روپ ترا رتی رتی ہے	پربت پربت رتی رتی ہے
اوٹ اے قلم اس گھڑی نہ گھبرائیں	ٹک نعت نگر کی سیر کرائیں
ہے ناؤ احد نشان احمد	سرخی سوا حد ہے پان احمد

یا مثلاً عالمگیر کی مدح کرتے ہیں:۔

اب بول تون مدح بادشاہ کا	ہور اس کی کمالیت کلاہ کا
جس کی بود و بال پن کی عادت	عالمگیر تھی ہوس عبادت
یک ملک نہیں جوان لیا نہیں	یک نقش نہیں جوان کیا نہیں
دیندار دلیر ہور دانا	یک علم نہ سب منے سیانا

اب حمد و نعت میں امین کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اول تعریف سن خالق کی اے یار	کہ دو نو جگ کا ہی ؟ کرن ہار
دہی نا بود سون سب کو کرے بود	کرے سب کون حیاتیں دی کے خوشنود

محمد کی سنو معراج کی بات　　ابین بخشے نبی کون رب نے درجات
نبی کی سن کے صفتاں خوش کر دل　　شفاعت وہ کریں گے روز مشکل

عالمگیر کی مدح :-

زمانے شاہ اورنگ زیب کے ہیں　　لکھی یوسف زلیخا کون ابین نین (نے)
الہی تون ایسا عادل شہنشاہ　　رکھیں جب لگ رہے قائم مہر ماہ

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے ابین نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے اور یہی انکے صاحب سخن ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ مختلف مقامات سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے انکے کلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

قصہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں :-

ارے ساقی پیالا بھر شتابی　　ابین کے ہاتھ دے ذرا انشرابی؟
بلور بن جام کی بہتر مے لعل　　تون پڑکر کرا ابین کو بخش درحال

زلیخا کی شادی عزیز مصر سے ہونے کا ذکر :-

پیالا لا اے ساقی لایزالی　　تو اسمیں بھر شراب پرتگالی
پچھون تیموس نے کیتی فکر یوں　　مصر کے بیچ یک قاصد کو بھیجوں
لکھی تیموس اُنے یک کتابت　　عزیز مصر کون بکئیں نزاکت
لکھا یوں کر کے یک بیٹی ہے میری　　اسے آتی رہیں مانگے بہتیری
زر دم و شام اور رد دیے لگ سوں　　ولے آتا نہیں کوئی میرے من موں
میرا دل یونکہ ہے بیاہوں مصر میں　　تو کچھ ہووے ٹھنڈک میری جگر میں

(ص ۱۵۷)

شادی ہونے کے بعد عزیز مصر کو زلیخا دیکھتی ہے اور اپنے خواب کی صورت نہونے

سے ماتم کرتی ہے :۔

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب　　پڑی دھرتی اوپر پچھاڑ کے تب
کہ داویلا کہ داویلا کر دائی　　بخت رب نے میری اوندھی دکھائی
دینو کچھ اور تھا ایتو ہے کچھ اور　　ایتو دشمن رہا اس دوست کے ٹھور
ہمیں وے کد ملیگا مجھ ستیں دوس　　ارے ہیہات اور انسوس انسوس
ہمیں کیونکر ملیگا محبوب وے شاہ　　ہزار افسوس اور صد اہ صد اہ

(ص ۶۷)

یوسف غلاموں کے بازار میں فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں قیمت کا تصفیہ نہیں ہوتا لوگوں کا ہجوم ہے زلیخا جنگل کی سیر سے واپس آ رہی ہے اور مجمع کا سبب دریافت کرکے غلام کو دیکھنے کے لئے پردہ اٹھاتی ہے اور خواب والی صورت پاکر بے قرار ہو جاتی ہے :۔

زلیخا نے سو تب پردہ اٹھا کر　　صورت یوسف کی نظروں بیچ لیا کر
پہچاناں ہے وہی دل یار جانی　　کہ جس کارن ہوں پھرتی تھی دیوانی
یوسف کو دیکھ کر روئی پکاری　　پڑی ہو بیخبر کر کر کے زاری
سواری کون شتابی لیکہ بھاگے　　زلیخا کو لے آئے گھر کے آگے
اتارے گھر میں تب ہوئی خبردار　　پوچھی تب دائی نے یوں اسکو گفتار
تیری پھر عقل اور سدھ کان گئی تھی　　ایسی تو بے خبر کیوں ہو رہی تھی

(ص ۱۰۱)

یوسف کی قیمت بہت زیادہ ہے عزیز مصر انکے خریدنے سے عاجز ہو کر زلیخا سے آکر بیان کرتے ہیں میرے اتنی دولت نہیں جس کو دیکر یوسف کو خریدوں یہ سنکر زلیخا ڈبیا سے موتی دیکر یوسف کو لانیکی فرمایش کرتی ہے :۔

عزیز نے تب کہا نہیں مجھ کنے زر　　کہ میں اسکوں لے آؤں مول دیکر

جو کوئی میری متاع ساری ملاوے — تو بھی یوسف کا آدھا مول پاوے
زلیخا نے تب ایک ڈبا نکالا — بھرے تھے اس بہتر موتی سوالا
دیا ڈبا کہا اب لیا تون کر مول — دے اب موتی تون اب مالک کتیں کھول

(ص ۱۰۲)

یوسف خرید ہو کر آئے زلیخا ان کی والہ و شیدا ہو گئی اور اپنے عشق سے بے قرار ہو کر پہلے دائی کے ذریعہ اور پھر خود آ کر یوسف سے التجا کی یوسف جواب میں کہتے ہیں :-

کہا یوسف نے یوں سن اے زلیخا — تو بی بی ہے انے میں ہوں سو بندا
ایتو مجھ بندے سوں ہوئیگا نہیں کام — نہ کر مجھے تون عاجز کون یوں بدنام
منجے تو عشق میں لبستا نہیں کئیں — ہوا مجھ زیان سب جا عشق کیتیں

(ص ۱۲۴)

اس کے بعد یوسف قید ہوئے برسوں مقید رہے قید سے رہا ہوے اور ترقی کرتے کرتے عزیز مصر ہوئے ۔ زلیخا اپنے کئے پر نادم ہوئی ۔ جوانی گزر گئی بڑھاپا آ گیا تمام مال و دولت خیرات میں دیچا چکی اور غربت میں بسر ہونے لگی ۔ یوسف کو اس کا خیال ہی نہیں رہا ایک مدت کے بعد یوسف کا اس طرف گزر ہوا جہاں زلیخا رہا کرتی تھی ۔ زلیخا کو یوسف کا آنا معلوم ہوا سامنے آئی اور اس موقع پر پہلے شوق اور بے تابی سے کہتی ہے ۔

کر اے یوسف منجہ تیں تان پچھانے — پچھانان تجکو میں اے یار جانی
وہی میں ہوں زلیخا نام میرا — وہی یوسف تیں دل آرام میرا
وہی میں ہوں جو تیں سیر کیں ہان — دیکھا صورت بی کیتی منجکوں بیان
وہی میں ہوں جو تیں سیرے وطن سوں — کری منجہ بیوطن اور دکھ دیا یوں
وہی میں ہوں جنے تجکوں لیا تھا — لکھو کھا درہم تیرا مول جو دیا تھا

(ص ۱۵۰)

ان امور کے بعد زلیخا کو گھر لاتے ہیں خدا سے دعا کرتے ہیں زلیخا جوان ہو جاتی ہے اور پھر یوسف اس سے شادی کرتے ہیں اور سب کی ضیافت کی جاتی ہے۔ داستان اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد یوسف کا انتقال ہوتا ہے اس رنج سے زلیخا پہلے تین دن تک بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس کے بعد زلیخا کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔

انوں سجدے ستیں سر نہیں اٹھایا　　دیسے میں جبریل ان پاس آیا
کہا یوسف کر سر کون سوا ونچا　　تمارا سوال درگاہ بیچ پہنچا
کری حق نے قبول اے عرض ساری　　جوانی کیتی سو پھر بوڑی دے ناری
خدا نے دی اُسے پھر کر جوانی　　توانا کیتی کھو کر ناتوانی
یہ سن خوش خبریا سر کون اٹھایا　　زلیخا کا درس نظروں میں آیا
دیکھا مکھڑا اشو روشن جون چند سور　　نین دو نور ستیں دیکھے بھرپور

(ص ۱۵۵)

پڑی بیہوش ہو کر پھر زلیخا　　نہ تھا معلوم اس کو حال اپس کا
پڑی رہی تین دن تک پھر بچاری　　یہی چوتھے روز آئی ہوشیاری
بیٹھی اُٹھ کر یوسف پکاری　　اپنے دل سرد ستیں آہ ماری
کہتی تھی یوں کہ سن یوسف پیارے　　دغا آخر منجھے تیں کیوں دیا رے
نہ چاہیئے تم کون اٹھ جنت میں جاؤ　　منجھے اس بھاگ سے بھتیر جلاؤ
منجھے کیوں چھوڑے ری چھوڑے یوسف　　محبت کائے تم توڑے رے یوسف
اگن بھیتر جلائے نین منجھے رے　　نہ آیا ترس کچھ آخر تجھے رے
ارے ہہات اور ہہات ہہات　　نہ لینے تم مجھے کیوں آپنے سات
بہت روئے سوں پھر بیتاب ہو کر　　پڑی پچھڑا ے کر دھرتی کے اوپر

(ص ۱۸۵)

اس پر کتاب ختم نہیں ہوتی آخر میں ساقی نامہ آخر میگوید " کا عنوان ہے خاتمہ میں عالمگیر کی مدح اور تاریخ تصنیف وغیرہ کے اشعار آئے ہیں، کتاب ذیل کے شعر پر ختم ہوتی ہے :-

کہ سب کوئی کرے اس کے اوپر پیار پڑے دل جان سیتی ہوکے ہشیار

اس تفصیل سے امین کے طرز کلام کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اور شاعری میں انکا کیا رتبہ قرار دیا جا سکتا ہے خود ناظرین غور فرما سکتے ہیں۔ مخطوطے میں کتابت کی تاریخ اور کاتب کے نام کے علاوہ جس کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا نام بھی درج ہے ملاحظہ ہو:-

"باختتام رسید کتابت یوسف زلیخائے ہندی دکھنی تصنیف محمد امین بخط احمد علی گوپاموی بخاطر صاحب والا مناقب کپتان ڑایر صاحب در ماہ جمادی الاول ۱۲۴۶ھ"

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں عام طور سے دکھنی اور گجراتی وغیرہ کو ہندی دکھنی سے موسوم کیا جاتا تھا۔

اس مختصر صراحت سے امید ہے "یوسف زلیخا" کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

فلسفۂ انبساط

انتخاب از "رس" مصنفہ پنڈت حبیب الرحمٰن صاحب (غیر مطبوعہ)

سنسکرت کے ماہرین علم الجذبات کا خیال ہے کہ انسان کے دل میں قدرت نے مستقل جذبات ودیعت کئے ہیں: محبت شگفتہ دلی۔ افسوس۔ غصہ۔ حوصلہ یا امنگ۔ خوف کراہت۔ تعجب۔ سکون۔

شاعری اور ناٹک میں یہی جذبات اپنے اسباب و آثار کی وساطت[1] سے جب ارتقائی مدارج سے گزر کر دائرہ وجدان میں پہنچتے ہیں تو ایک غیر محدود لذت کا مزہ بنجاتے ہیں اسی کا نام رس ہے

---

(۱) جن اسباب و آثار کی وساطت سے جذبات مذکور ارتقائی مدارج سے گزر کر رس کہلاتے ہیں انکی تفصیل یوں سمجھنا چاہئے مثلاً جذبہ محبت کے رس بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ڈراما اور شاعری میں وہ شخصیت پیش کیجائے جس سے کسی کو محبت ہوتی ہے، اور پھر محبت ہوجانیکے بعد موسم بہار۔ موسیقی اور چاند وغیرہ (جذبہ محبت کو مشتعل کرنیوالی اشیاء) کا بیان کیا جائے تاکہ جذبہ مذکور خوب بھڑک اٹھے۔ پھر اس جذبہ کے اثر سے جو تغیرات عاشق پر طاری ہوتے ہیں (اشکباری وغیرہ) اُنکا تذکرہ ہونا چاہئے تیسرے درجہ پر پہنچکر جو خوشی۔ جنون۔ امید۔ نا امیدی وغیرہ فوری و آنی جذبات دریائی موجوں کی طرح عاشق کے قلب میں پیدا ہونے لگتے ہیں اُسکا سماں کھینچنا چاہئے۔ محبت کے درس میں مذکورہ بالا شخصیت محرک اساسی کہلاتی ہے اور موسم بہار اور چاند وغیرہ ہیجان پیدا کرنیوالی اشیاء محرک کے نام سے تعبیر کیجاتی ہیں۔ نیز اشکباری اور دیگر معلولات جذبہ کا نام اثرات رکھا گیا ہے اور تیسرے درجہ پر جو اثرات نمودار ہوتے ہیں انکو منقلبات کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ (باقی صفحہ ۱۳۶)

رسوں کی تعداد ۔عشق ۔ہنسی ۔ رحم ۔ غضب ۔ بہادری ۔ دہشت ۔ نفرت ۔حیرت اطمینان ۔ یہ نو رس ہیں ۔

ان میں سے عشق (شرنگار) کے رس کی تعریف یہ ہے ۔شرنگ عشق کے دیوتا (کامدیو) کے ابھرنے کو کہتے ہیں اس ابھرنے کا سبب اور زیادہ تر اعلیٰ ہیرو سے متعلق رس عشق کا رس کہلاتا ہے ۔

پرائی عورت اور بے دفا طوائف کو چھوڑ کر دوسرے اقسام کی عورتیں اس میں محرک اساسی ہوتی ہیں، نیز عادل (تمام بیویوں سے یکساں موانست رکھنے والا) اور اسکے مماثل ہیرو زبھی، چاند ۔صندل ۔بھنورے کی مستانہ گنگناہٹ اور ایسی ہی دوسری چیزیں اس میں محرک مہیج ہوتی ہیں، محبت نما پر شکن ابرد اور الفت آمیز نگاہیں اس رس کے اثرات ہیں ۔غضب ۔ موت ۔ سستی اور کراہت کو چھوڑ کر بقیہ کل جذبات عارضی اس میں منقلبات ۔بنتے ہیں۔ اس کا جذبۂ مستقل محبت ہے ۔ مثال نئی دلہن ۔سونی خواب گاہ (سہیلی وغیرہ سے خالی) دیکھکر پلنگ سے قدرے آہستہ آہستہ اٹھی اور اٹھکر بناوٹی نیند سوئے ہوئے محبوب (شوہر) کے چہرے کو بہت دیر تک بغور دیکھا (کہ کہیں جاگتے تو نہیں ہیں) پھر سوتا سمجھ کر بڑے اطمیناں سے اس کا بوسہ لیا لیکن اس بناوٹی نیند میں مشغول محبوب کے رخساروں پر (خوشی کیوجہ سے) اقشعرار[1] دیکھکر اس نوعروس کا چہرہ شرم سے نڈھال اور پژمردہ ہوگیا اور اس کے محبوب (شوہر) نے ہنس ہنس کر اسے بہت دیر تک پیار کیا۔

مثال بالا میں ہیروئن کے دل میں موجودہ محبت کا محرک اساسی ہیرو ہے ۔اور خواب گاہ کا خالی ہونا محرک مہیج ہے ۔اطمینان سے بوسہ لینا اثر محبت ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھنے

زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔

(۱) بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجانا ۔

سے خوف پتین کے ساتھ شوق خفی ، اور بغور دیکھنے سے ظاہر و نمایاں ہونیوالا خوف اور شرم منقلبات ہیں ، اسی طرح اس مثال میں ہیرو کی محبت کا محرک اساسی ہیروئن ہے ۔ اس کے (ہیروئن کے) چہرہ کا نڈھال ہونا مہیج ہے ۔ دیر تک پیار کرنا اثر محبت ہے ، خوشی اور ہنسی جذبات عارضی یعنی منقلبات ہیں ، ان محرک ، اثر اور منقلبات کے سمجھنے والے ناظرین عشق کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں "

عشق کے رس کی دو قسمیں ہیں نمبر ۱ فراق نمبر ۲ وصال ۔

جب محبت ہو جانے پر چاہت تو گہری ہو لیکن وصل محبوب نصیب نہو تو اسے فراق کہتے ہیں ۔ فراق کی اندرونی توضیح سمجھنے کے لئے حسب ذیل حالتوں کا بیان ضروری ہے ۔

آرزو ۔ تفکر ۔ یاد ۔ تذکرہ اوصاف ۔ بے چینی ۔ بڑ ۔ پاگل پن ۔ بلائے نہانی ۔ بے حسی ۔ موت ۔ یہ دس حالتیں فراق کے وقت عشاق پر طاری ہوتی ہیں انکی تعریفات حسب ذیل ہیں ۔

وصل کی تمنا کا نام آرزو ہے ۔

محبوب سے ملنے کی ترکیب سوچنے کو تفکر کہتے ہیں ۔

ذی شعور اور غیر ذی شعور کی تمیز نہ رہنا پاگل پن ہے ۔

دل کے بہکنے سے پیدا ہونیوالی بے تکی باتوں کو بڑ کہتے ہیں ۔

ٹھنڈی سانس ، بدن میں زردی اور لاغری پیدا کرنیوالی اندرونی حالت کو بلائے نہانی کہتے ہیں ۔

اعضاء اور قلب کے بے حس و حرکت ہونیکا نام بے حسی ہے ۔

بقیہ حالتیں واضح ہیں اور تعریف کی محتاج نہیں ۔

واقعی دیدار سے پیدا ہونیوالی آرزو کی مثال :۔

اُس بھولی چتون والی حسینہ کردہ محبت آلود ، الفت سے پر ، شناسائی کیوجہ سے گہری چاہت میں مستغرق ، فطری طور پر دلکش اور شیریں ، عشقیہ حرکات و سکنات کیا میری جہ

سرکبھی پھر واقع ہونگی، جن کو ذرا سا یاد کرتے ہی فوراً آنکھ وغیرہ حواس خارجی کے مشاغل روک کر میری روح ایک گہری مسرت میں محو ہو جاتی ہے۔

عملیات (ورد وظائف) کے ذریعہ سے دیدار حاصل ہونیکی آرزو کی مثال:۔

"عشق کے دیوتا کی حقیقی دولت اس غزال چشم کو میں کیسے دیکھوں گا اس سوچ میں پریشان ہیرو کو رات میں نیند نہیں آئی۔"

اس مقام پر کسی ہیروئن کو عمل کے زور سے دیکھکر مشتاق ہیرو کا تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔

بے چینی کی مثال: تمہاری جدائی میں وہ نازک بدن لمبی لمبی سانسیں لیتی ہے۔ زمین پر لوٹتی ہے تمہاری راہ دیکھتی ہے، اور دیر تک گریہ وزاری میں مصروف رہتی ہے، اور اپنے لاغر ہاتھ ادھر اُدھر ٹیکتی ہے۔ اے دلربا! خواب ہی میں تمہارا وصل ہو جائے اس تمنا میں نیند چاہتی ہے لیکن بدقسمتی اسے سونے نہیں دیتی۔

بڑ کی مثال:۔ پچھلی شب میں ذرا دیر کے لئے آنکھ لگتے ہی یہ ہماری سہیلی "اے مہادیو کہاں جاتے ہو؟" کہتی اور بڑبڑاتی ہوئی کسی کی خیالی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے جاگ اٹھتی ہے۔

بے حسی کی مثال: کنول کی سیج پر پڑا جسم تو بالکل بے حس ہے۔ ہاں لمبی سانس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جان باقی ہے۔ (اگرچہ مخالف رس ہونیکی وجہ سے موت کا بیان نہیں کیا جاتا۔ لیکن پھر بھی موت کی مانند حالت کا بیان کرنا چاہیئے اور موت کی تمنا کا بھی اور اگر جلدی ہی پھر زندگی نصیب ہو جائے تو موت کا بھی بیان کر دیا جاتا ہے)

پہلی مثال: وہ نازک بدن ہارسنگھار کے پھول کھلے دیکھکر تو کسی نہ کسی طرح زندگی قائم رکھ سکی لیکن اس وقت مرغ کی اذان سنکر بیچاری نہ معلوم کس حالت میں ہوگی (ہارسنگھار کے پھول آدھی رات میں کھلتے ہیں) آدھی رات تک تمہارا انتظار کرتے کرتے انہیں دیکھکر آتش جدائی سے پریشان وہ نازنین کسی نہ کسی طرح زندہ رہی مگر اب مرغ کی آواز سے صبح سمجھ کر نہ معلوم کس حال میں ہوگی۔

دوسری مثال: بھنورے اپنی مستانہ گنگناہٹ سے اطراف کو پر کریں صحرائی صندل سے آئی ہوئی صندل بیز ہوا، آہستہ آہستہ چلتی رہے۔ آموں کے بور پر بیٹھی ہوئی مست کوئل پانچویں سُر میں اپنی میٹھی راگنی الاپتی رہے اور پتھر سے بھی سخت تر میری جان بھی اب رخصت ہو۔

تیسری مثال: جیسے کادمبری نامی کتاب میں پنڈریک کی موت اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا بیان ہے۔

فراق کی چار قسمیں ہیں۔ اول "پہلا رنگ"۔ دوسرے روٹھنا۔ تیسرے پردیس جانا۔ چوتھے رحم در فراق۔

خوبصورتی وغیرہ اوصاف حمیدہ کے سننے اور دیکھنے سے ایک دوسرے پر مائل ہیرو اور ہیروئن کی وصل سے قبل کی حالت کا نام "پہلا رنگ" ہے۔ پہلا رنگ تین طرح کا ہوتا ہے۔ نیلا (نیلگوں) کسومّی۔ مجیٹھی۔ جو اوپری چمک دمک تو زیادہ نہ دکھائے لیکن دل سے کبھی جدا نہ ہو وہ "نیلا رنگ" کہلاتا ہے جیسے رامچندر اور سیتا کا رنگ محبت۔

کسومی رنگ وہ ہوتا ہے جس میں دلکشی بہت ہو لیکن قائم نہ رہے۔

مجیٹھی رنگ اسے کہتے ہیں جس میں دلکشی بھی ہو اور قیام بھی۔

غصہ ہو جانے کا نام روٹھنا ہے۔ یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک محبت سے پیدا ہوتا ہے دوسرا رقابت کی آگ سے۔ محبت کی الٹی رفتار ہوتی ہے اس لئے دونوں کے دل میں پوری محبت ہونے پر بھی جو بلا سبب ایک دوسرے پر غصہ پیدا ہو اسے محبت کا روٹھنا کہتے ہیں۔

محبت میں ہیرو کے روٹھنے کی مثال: نیند کا بہانہ کرکے یونہی آنکھیں میچنے والے حضرت مجھے بھی تھوڑی جگہ دو۔ رخسار چومنے سے مقشعر الاعضا ہوتا جی (شاہ صاحب) اب کبھی دیر نہ ہوگی۔

دونوں کے ایک ہی وقت روٹھنے کی مثال: دونوں محبت کی وجہ سے روٹھے ہیں اور دونوں ہی بناوٹی نیند سو رہے ہیں نیز آہستہ آہستہ روک روک کر لی ہوئی ایک دوسرے کی سانسوں

پر دونوں ہی کان لگائے پڑے ہیں، دیکھیں ان دونوں میں کون بہادر ہے (اگر یہ روٹھنا منانے تک نہ قائم رہے تو اسے عشق کے رس کی قسم (فراق) نہ سمجھنا چاہئیے بلکہ وصل کے رس کا "منقلب" جاننا چاہئیے اس کی مثال حسب ذیل ہے۔

بھویں ٹیڑھی کرنے پر بھی (علامت غصہ پیدا کرنے پر بھی) نظر، زیادہ پُر اشتیاق ہو جاتی ہے۔ گفتگو بند کر دینے پر بھی جھلسا (عورتوں کی غصہ کے وقت کی گالی) منہ مسکرانے لگتا ہے دل سخت کر لینے پر بھی جسم میں اقشعرار ہونے لگتا ہے پھر بھلا انکا سامنا ہونے پر غصہ کو کیسے نبھا سکوں گی؟ (جب ساری فوج ہی دوسروں سے جا ملے تو سپہ سالار بیچارہ کیا کریگا)

اسی کی دوسری مثال: دل میں منانے کی خواہش پیدا ہونے پر بھی اپنا اپنا بھرم (خودداری) قائم رکھنے کے لئے منہ پھیرے چپ چاپ علٰحدہ سیج پر بےچین پڑے ہوئے ہیرو، ہیروئن کی آہستہ آہستہ محبت بھری ترچھی نظروں کے ذریعہ سے چار آنکھیں ہوتے ہی جنگ محبت ختم ہو گئی اور ہنستے ہوئے ہم آغوشی ختم ہوئی۔

شوہر کا دوسری عورت میں عشق دیکھنے پر یا قیاس کرنے پر یا کسی سے سن لینے پر عورتیں رقابت کیوجہ سے روٹھتی ہیں (دوسری عورت سے شوہر کی محبت کا قیاس تین طرح پر ہوتا ہے۔ خواب میں دوسری عورت کے متعلق باتیں بڑبڑانے کی وجہ سے یا شوہر میں وصل غیر کی علامتیں ملنے سے یا شوہر کے منہ سے اچانک دوسری عورت کا نام نکل جانے سے)

دوسری عورت میں شوہر کا عشق دیکھکر روٹھنے کی مثال: ہیرو کو دوسری ہیروئن کی آنکھوں سے پھونک کر زرگل ہٹاتے دیکھکر اس عورت کی دونوں آنکھیں آتش غضب سے سرخ ہو گئیں۔

وصل غیر کی علامات ملنے کی وجہ سے روٹھنے کی مثال: جسم کی تازہ خراشِ ناخن کو کپڑے سے چھپاتے ہو۔ اور دانتوں سے زخمی ہونٹ ہاتھ سے دبا رہے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ دوسری عورت کے وصل کی گواہ، چاروں طرف پھیلتی ہوئی اس نئی خوشبو کو کیسے روکو گے۔

ضرورت۔ بددعا یا خوف کیوجہ سے ہیرو کے دوسرے (دور دراز) مقام پر چلے جانے

کو پردیس جانا کہتے ہیں۔ اس حالت میں ہیروئن کے جسم اور کپڑوں میں میلاپن۔ سر میں صرف ایک جوڑا (خاص طور پر آراستگی کے ساتھ نہ گوندھ کر سب بالوں کی ایک چوٹی بنا لینا) ہوتا ہے نیز حرماں نصیب نازنین ٹھنڈی سانسیں لیتی ہے اور روتی اور زمین پر لوٹتی ہے)

پردیس جانیکی مثال: کسی انتہائی ضرورت کیوجہ سے پیارا شوہر پردیس جانے کے لئے تیار ہے۔ نازنین کو اس واقعہ سے جانکنی کی سی تکلیف ہو رہی ہے۔ تپش اور درد نہانی کی زیادتی کے اثر سے پگھلی ہوئی روح آنکھوں کے ذریعہ آنسوؤں کی شکل میں برابر بہہ رہی ہے اتنے میں شوہر نے باہر سے آکر محبت آمیز نگاہوں سے اپنی محبوبہ کو خوش کرتے ہوئے سفر کے لئے رخصت چاہی۔

شوہر۔ اے حسینہ ہم جاتے ہیں (اس سوال پر محبوبہ نے صاف طور پر منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور بدشگونی کے خوف سے اپنے کو مانع سفر نہ بنایا لیکن اپنے سرتاج کو در پردہ طور پر سفر سے روکنے کے لئے جو بلیغ گفتگو کی وہ حسب ذیل ہے)۔

عورت۔ اے پردیسی جاؤ۔

مرد۔ اے نازک اندام بیکار رنج مت کرو۔

عورت۔ اے پردیسی مجھے تمہارے جانے میں رنج کیوں ہوگا۔

مرد۔ اگر رنج نہیں ہے تو پھر یہ لگاتار آنسو کیوں بہا رہی ہو۔

عورت۔ تم جلدی نہیں جاتے اس لئے۔

مرد۔ مجھے بھیجنے کے لئے تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے۔

عورت۔ تمہارے ساتھ ساتھ جانے کے لئے کمربستہ۔ میری جان کی یہ گھبراہٹ ہے۔

ہیرو اور ہیروئن میں سے ایک کے مرجانے پر دوسرے کو جو غمگینی ہوتی ہے اس کو رحم "درفراق" کہتے ہیں لیکن یہ قسم اسی وقت صادق آتی ہے جب اس مردہ ہستی کے اسی دنیا میں اسی جسم کے ساتھ پھر ملنے کی امید ہو، جیسے کادمبری نامی کتاب میں جہاشویتا

اور پنڈریک کا واقعہ، اگر پھر ملنے کی امید ٹوٹ جائے یا دوسری زندگی میں ملاقات کا سہارا
ہو تب تو صرف رحم ہی کا رس ہوتا ہے۔ لیکن پنڈریک کے مرنے پر ہاتف غیبی کے زندگی کی
خوشخبری سنانے کے بعد اس کے ملنے کی امید میں جذبۂ محبت میں ایک گونہ تازگی اور
روئیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے، اسوقت عشق کا رس تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ہاتف غیبی کی
آواز سے پہلے رحم ہی کا رس ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک افسوس ہی کا دور دورہ رہتا ہے
محبت مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہے جو عشق کے رس کی بنیاد ہے۔

ایک دوسرے کی محبت میں چور ہیرو اور ہیروئن کا باہمی دیدار وارتباط سے مستفید
ہونا وصل کہلاتا ہے۔

بوس وکنار اور دیگر اس کے غیر محدود اقسام کا شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے وصل
کے نام سے موسوم اس کی ایک ہی قسم مانی جاتی ہے۔

چھ موسموں۔ سورج اور چاند۔ طلوع اور غروب۔ سیر دریا۔ صبح کی سیر۔ مےنوشی
رات کا کھیل۔ صندل لگانا۔ زیورات کی آراستگی اور دوسری صاف ستھری خوشگوار اشیاء
کے بیان پر وصل کے مضامین مشتمل ہوتے ہیں۔ یہی بھرت منی نے کہا ہے۔ اگرچہ وصل اپنی غیر
محدود قسموں کی وجہ سے قابل شمار نہیں، اس وجہ سے ذاتی طور پر ایک ہی مانا جاتا ہے
لیکن پھر بھی پہلے رنگ۔ روٹھنے۔ پردیس جانے اور حدرقابت کے بعد واقع ہونیکی وجہ سے
اسے بعض لوگوں نے چار قسم کا مانا ہے مقصد یہ ہے کہ وصل اس وقت تک کامل وصل نہیں
ہے جب تک کہ فراق کے بعد واقع نہو اور فراق کی چار قسمیں ہیں لہذا وصل کی بھی چار قسمیں
ہوئیں چنانچہ کہا گیا ہے۔ کہ بغیر فراق کے وصل مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جیسے کسی دوسری مناسب
چیز میں رنگنے کے بعد کپڑے پر اصلی (مقصود) رنگ خوب چڑھتا ہے (یہی وجہ ہے کہ اکثر
انار کے چھلکوں کے پانی میں کپڑوں کو رنگنے کے بعد دوسرے رنگ میں رنگنے کا رواج
ہے۔ یہ اس وجہ سے تاکہ رنگ مقصود خوب چڑھے) اسی طرح فراق کے بعد کا وصل بہت

ہی پر لطف اور مکمل ہوتا ہے۔ اور فراق کی چونکہ چار قسمیں ہیں لہذا اس کے بعد واقع ہونے والے وصل کی بھی چار قسمیں ہوئیں۔ اس کی مثالیں بخوف طوالت نظرانداز کیجاتی ہیں۔

متغیر شکل، آواز، لباس۔ اور حرکات وسکنات کا سین کھینچنے سے قلب میں ہنسی کا رس ظاہر ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل شگفتہ دلی ہے۔ جس شخص کی بدلی ہوئی شکل آواز، اور پوشش کو دیکھکر لوگ ہنستے ہیں، وہ اس کا محرک اساسی ہوتا ہے اور اس کی حرکات، محرک مہیج ہوتی ہیں۔ آنکھیں سکڑنا۔ منہ اور چہرے کا کھل جانا وغیرہ اس کے اثرات ہیں اور نیند۔ سستی اور انحفار جذبات اس کے منتقلبات میں داخل ہیں۔ ہنسی کی چھ اقسام ہیں۔

(۱) جب آنکھوں میں کچھ شگفتگی ہو۔ اور ذرا ذرا ہونٹ سکڑیں تو اُسے تبسّم کہتے ہیں۔

(۲) اگر افعال مذکورہ کیساتھ کچھ کچھ دانت بھی چمکنے لگیں تو اُسے خندہ شیریں (انظرار) کہتے ہیں۔

(۳) اب سب کے ساتھ ہلکی آواز بھی ہو تو اُسے خندہ نازک (کنکنا) کہتے ہیں۔

(۴) اور اگر کندھے وسر وغیرہ میں کپکپی بھی پیدا ہو جائے تو وہ قہقہہ (کرکرہ) ہے۔

(۵) جس ہنسی میں آنکھوں میں پانی بھی آجائے وہ خندہ گریاں (استغراب) ہے۔

(۶) اور اگر ہنسنے والا ادہر اُدہر ہاتھ پیر بھی پھٹکنے لگے تو وہ زہرقہ (انتہائی ہنسی) ہے

بڑے لوگوں میں تبسم ہوتا ہے۔ درمیانی لوگوں میں خندۂ نازک اور قہقہہ اور ادنے لوگوں میں قہقہہ اور زہرقہ ہوتا ہے۔ ہنسی کی ان اقسام کی وجہ سے ہنسی کے رس کی بھی چھ قسمیں ہو جاتی ہیں۔

مثال۔ وشنو شرما پنڈت کا حسب ذیل قول بیان کرکے کوئی ہنستا ہے:۔

"میرے اُس سر پر جو وید منتروں کے ہر ہر ربع کے تلاوت کے ختم پر پانی (دم شدہ) کے چھینٹوں سے پاک کیا گیا تھا، طوائف نے تھوک کر ناپاک ہاتھ کا گھونسہ بنا کر دھم سے مارا"

یہ کہکر ہائے ہائے کرکے پنڈت وشنو شرما رو رہا ہے۔

اس مثال میں وشنو شرما محرک اساسی ہے اور اُسکا رونا محرک مہیج، اور تماشائیوں

یں پیدا ہونیوالی مسکراہٹ اور قہقہہ اس کے اثرات ہیں، دیکھنے والوں کی گھبراہٹ اور اضطراب منقلبات میں شامل ہے اور شگفتہ دلی اس کا جذبہ مستقل ہے۔

مرغوب اور محبوب شے کے مٹنے اور غیر مرغوب کے حصول سے رحم کا رس نمودار ہوتا ہے۔ اس میں افسوس جذبہ مستقل ہوتا ہے اور مرے ہوئے اعزہ (قابل افسوس شخصیتیں) محرک اساسی ہوتے ہیں، اور انکی تجہیز و تکفین اور اس کے لوازمات محرک مہیج، پچھاڑیں کھانا۔ گریہ وزاری کرنا۔ تبدیلی رنگت۔ لمبی سانسیں بے حسی اور بڑا اس کے اثرات ہیں شکستہ دلی۔ پریشانی۔ صرع۔ مرض۔ تکان۔ تذکرہ۔ محنت۔ بے حوصلگی۔ سراسیمگی۔ جنون اور فکر اس کے منقلبات میں شامل ہیں۔ چونکہ اس کا جذبہ مستقل افسوس ہوتا ہے اس وجہ سے اسکا شمار رحم در فراق میں ہے پھر وصل کی امید قائم رہنے کی وجہ سے محبت ہی جذبہ مستقل رہتی ہے۔

مثال۔ اے مادر محترم یہ جلدی کہاں جانے کے لئے ہے، یہ کیا ہوا۔ ہائے دیوتاؤں (بزرگوں) کی دعائیں کہاں گئیں۔ لعنت ہے ہماری اس (جو ایسی مادر محترم کے مرے پر بھی صحیح و سلامت ہے) جان پر۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔ تیرے ہاتھ پیر دل میں آگ دیدی گئی۔ آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس طرح چلا چلا کر رونے کی وجہ سے عورتوں کی گلے میں پھنسی اور تھرائی ہوئی دردناک آوازیں تصویروں تک کو طرح طرح سے رلا رہی تھیں اور اپنے دردناک اثر سے در و دیوار کے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی تھیں۔

اس مثال میں جذبہ مستقل افسوس ہے، اس کا محرک اساسی مردہ عورت، اور عورت کا جلانا اور جلانے کے لوازمات محرک مہیج ہیں۔ شہر کی عورتوں کا رونا اثرات میں داخل ہے۔ بے بسی تکان اور غشی اس کے منقلبات ہیں۔

غضب کے رس میں غصہ جذبہ مستقل ہوتا ہے اور محرک اساسی دشمن اور دشمن کی حرکات مہیج ہوتی ہیں۔ چیں بر جبیں ہونا، ہونٹ چبانا۔ خم ٹھونکنا۔ جھڑکی دینا اپنے پچھلے

مناقب (بہادری کے) بیان کرنا۔ ہتھیار گھمانا غضب۔ گھبراہٹ۔ اقشعرار عرق ریزی۔ لرزہ سستی یہ اس کے اثرات ہیں، اعتراض کرنا غضب آلود نگاہ سے دیکھنا۔ پریشانی اور غلش انتقام منقلبات ہیں۔ (بھبھوڑنے۔ پھاڑ ڈالنے گھونسہ مارنے گرانے اور جنگ کے لئے بیتابی کے بیان سے یہ رس خوب جھلکتا ہے آنکھوں اور چہرے کے غصہ سے سرخ ہو جانا اسی رس کی علامت ہے۔ بہادری میں یہ علامت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ بہادری کے رس میں حوصلہ جذبہ مستقل ہوتا ہے)

مثال — جن ہتھیار بند حدود شکن۔ انسانی صورت حیوانوں نے یہ (قتل اُستاد) گناہ کیا۔ جن لوگوں نے مشورہ دیا۔ جنہوں نے اسے دیکھنا روا رکھا سری کرشن۔ ارجن اور بھیم کے ساتھ میں اُن سب کے لہو گوشت اور چربی سے اطراف کے دیوتاؤں۔ (سنسکرت ادب میں ہر سمت کا مالک ایک دیوتا تسلیم کیا گیا ہے) کی دعوت کروں گا۔

اس مثال میں غصہ جذبہ مستقل ہے۔ اُس کے محرک اساسی ارجن وغیرہ قاتل ہیں، اور قاتل کے والد کی موت اور مارنے والوں کا اپنے ہاتھوں میں ہتھیار گھمانا محرک ہیج ہے، اور قاتل کا عہد مذکور (دعوت کروں گا) اثرات میں شامل ہے اور "ایسا میں کروں گا" اس جملے سے مترشح گھمنڈ اس جگہ جذبہ منقلب ہے۔ اس تفصیل کو سمجھنے والے تماشائی غضب کے رس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بہادری:۔ یہ رس عالی ظرف ہیروؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل حوصلہ ہے اور فتح کرنے کے قابل مرد مقابل اس میں محرک اساسی ہوتا ہے اور مرد مذکور کی حرکات ہیج ہوتی ہیں، معاونین جنگ (ہتھیار یا فوج وغیرہ) کی تلاش اس کے اثرات میں شامل ہے۔ سکون۔ فیصلہ۔ گھمنڈ۔ تذکر۔ سوچ و بچار اور اقشعرار اسکے منقلبات ہیں۔

مثال۔ راون کا لڑکا (میگھناد) رامچندر جی کی فوج سے حسب ذیل خطاب کرتا ہے۔

"اے پیچ و پوچ بندرو! تم مت ڈرو کیونکہ راجہ اندر کے ہاتھی کے کوہان کو ریزہ ریزہ کرنے والے میرے تیر تمہارے جسم پر پڑتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اے لکشمن تو ایک طرف ہٹ جا۔ کیونکہ میرے غصہ کے لئے تو بھی مناسب محل نہیں ہے مجھے تو اُس رام کی تلاش ہے جس نے اپنی ترچھی ابرو کے ادنیٰ اشارے سے سمندر کے بہاؤ کو روک دیا ہے۔

مثال بالا میں حوصلہ جذبہ مستقل ہے اور اُسکا محرک اساسی رامچندر جی ہیں۔ اور سمندر کا بہاؤ روکنا محرک مہیج ہے۔ کمزوروں پر بے توجہی اور رامچندر جیسے جوانمرد سے لڑنے کی تمنا اثرات میں داخل ہے۔ اپنے گذشتہ کارنامے کی یاد اور "میرے تیر شرماتے ہیں" اس قول سے تشیخ گھمنڈ منقلبات میں داخل ہے۔

باغی

سلمیٰ لاگرلاف ایک زمانے میں معلمہ تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اہل سویڈن کی قومی عید کے موقعہ پر اُس کے سر پر "تاج ادب" رکھا گیا اور اس طرح وہ ملک کی ہردلعزیز مصنفہ قرار پائی۔ اُس نے بچوں کے متعلق قصوں کا ایک سلسلہ لکھا ہے جس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اسلئے کہ ان قصوں میں قدیم زمانے کی داستان نویسی کے عجائب وغرائب کا ایک پرلطف ادبی صنعکاری اور عہد حاضر کی نطرت نگاری اور واقعہ طرازی کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے۔

۱۸۹۵ء میں اس نے ممالک غیر کی سیاحت کی، اور اس کے بعد ہی اپنے مشہور "قصص صقلیہ" پیش کئے؛ اس سلسلہ کے اکثر انسانوں کو ادب انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔

سلمیٰ لاگرلاف کا طرز تحریر سکون، بے تکلفی، قادرالکلامی، وسعت تخیل اور شعریت کے لوازم سے ممتاز ہے "باغی" جو اس کے تمام انسانوں کی جان ہے، اُس کی جملہ ادبیانہ خصائص کا حامل ہے۔

ایک دہقانی نے ایک راہب کو مار ڈالا تھا اور جنگل میں بھاگ گیا تھا۔ متمدن دنیا کو مستقلاً ترک کے وہ باغی بن گیا۔ اس کے سر کے لئے ایک انعام کا اعلان کیا گیا۔

جنگل میں وہ ایک دوسرے مفرور سے ملا۔ یہ ایک نوجوان ماہی گیر تھا جو دور دراز جزائر سے ترک وطن کرکے آیا تھا۔ اُس پر ایک جال کی چوری کا الزام تھا۔ چنانچہ بمصداق:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو   خوب گذرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو!

دونوں میں خوب گاڑھی دوستی ہوگئی، انہوں نے پہاڑ کے سنگین دامن میں

اپنے رہنے کے لئے ایک غار کاٹ لیا اور ساتھ ساتھ رہنے لگے ۔ وہ ساتھ ہی ساتھ اپنا کھانا
پکاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ تیر بنانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ
بٹاتے تھے، اور باری باری سے اپنی صحرائی کمینگاہ سے نکل کر شکار کرتے تھے۔

دہقانی کبھی جنگل کے محفوظ دامن کو نہ چھوڑ سکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک سنگین جرم
کا مرتکب ہوا تھا، لیکن ماہی گیر جس کا جرم اتنا شدید نہ تھا وقتاً فوقتاً آبادی کیطرف نکل جاتا
اور شہر کے مضافات ومفصلات میں پہنچکر اپنے شکار کے بدلے دودھ مکھن، لباس اور
تیروں کے پیکان لے آتا۔ مچھلی کے علاوہ اس بازار میں پیش کرنے کے لئے اُس کے پاس پہاڑی
مرغ اور اُس کے چمکیلے پر، ذائقہ دار گوشت والی جنگلی فاختہ اور خرگوش ہوا کرتے تھے۔

اُنکا سنگستانی مسکن ۔ ایک عمیق غار تھا جس کے منہ کو چوڑی چوڑی پتھر کی سلوں سے
بند کر دیا گیا تھا اور مزید حفاظت کے لئے خاردار جھاڑ جھنکاڑ کا ایک پردہ بھی کر دیا جاتا تھا۔
پہاڑ کی چوٹی پر ایک عظیم صنوبر کا درخت تھا جس کی پیچ در پیچ جڑوں کے بیچ میں ہمارے
ان صحرانشینوں کے باورچیخانے کے دودکش کا دھواں گم ہو جایا کرتا تھا۔ اس طرح کسی
انسانی بود و باش کی کوئی علامت دور سے نظر نہ آسکتی تھی۔ غار تک پہنچنے کے راستہ
میں ایک نالہ بھی حائل تھا جو پاس ہی کے پہاڑ کے دامن سے نکلکر بہتا تھا۔ ان دونوں
"صیدہائے رمیدہ" کے حق میں یہ جگہ ایک "حرم" کا حکم رکھتی تھی۔

شروع شروع میں لوگوں نے انکو گرفتار بھی کرنا چاہا اور دیہاتی اُنکے بہت درپے
ہوئے، یہ لوگ اُنکا تعاقب کیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر یہ خطرناک وحشی ہاتھ لگجائیں
تو انکو بھیڑئیے یا ریچھ کا لقمہ بنوادیں۔ اکثر گاؤں کے کماندار جنگل کا محاصرہ کر کے کھڑے
ہو جاتے تھے اور پھر نیزہ بردار لوگ اندر گھستے اور کوئی جھاڑی یا کوئی نالہ بغیر جستجو کے نہ
چھوڑتے۔ دونوں باغی ایسے وقت اپنے تیرہ و تار غار میں چھپکر بیٹھ جاتے، وہ بالکل دم بخود
ہوتے اور خوف و وحشت سے لرزہ براندام، اور جب انسان کا شکار کھیلنے والے ان شکاریوں

کی ٹولی شور و غل مچاتی ہوئی نکل جاتی تب انکی جان میں جان آتی -

ایک دفعہ اسی قسم کے تعاقب اور دار و گیر کے سلسلہ میں ان دونوں روپوش باغیوں کو پورے دن بھر اس کالے غار میں گوشہ نشین رہنا پڑا، چنانچہ جو شخص ان میں قاتل تھا وہ اس قید تنہائی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ یکبارگی اس "قبر" سے نکل کھڑا ہوا تاکہ کھلے میدان میں آکر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ متعاقبین نے اس کو دیکھ پایا اور فوراً اُس کے پیچھے ہو گئے اگرچہ موقع مخدوش تھا لیکن اُس کو یہ پسند تھا اور نامردوں کی طرح زندہ در گور رہنے سے اس مقابلہ کو وہ بہرحال ترجیح دیتا تھا! چنانچہ اب وہ آگے تھا اور لوگ اُس کے پیچھے: وہ نالے کو کودا، پہاڑ کے ڈھلان سے پھسلا، اور کوہستان کی عمودی بلندی پر چڑھ گیا۔ جان کے خطرہ نے تازیانے کا کام کیا تھا، اس کے سارے اعصاب متحرک ہو گئے تھے اور ساری خوابیدہ عضلاتی طاقتیں بیدار! نقل و حرکت کرنے میں اس کا بدن ایسا لوچدار ہو گیا تھا جیسے کہ ایک فولادی اسپرنگ! اُس کا پاؤں جہاں پڑتا تھا صحیح پڑتا تھا، اُس کا ہاتھ جس چیز کی گرفت کرتا تھا مضبوط کرتا تھا، اُس کے چشم و گوش کی حس دو چند تیز ہو گئی تھی!! درختوں کی پتیوں کی ایک ایک جنبش کے معنی وہ سمجھتا تھا! ہر بیجان پتھر کی حرکت خفی کی سخن فہمی کے لئے اُس میں ایک اور راک پیدا تھا!

ایک بڑے اونچے پہاڑی کگارے پر چڑھ کر باطمینان تمام وہ بیٹھ گیا۔ نیچے تعاقب کرنیوالے آکر جمع ہو گئے تھے، لیکن سب بے بس تھے اور مفرور تک کسی کی رسائی ہونا کارے دارد کا معاملہ تھا، چنانچہ وہ اپنے دشمنوں کی اس بے دست و پائی پر فاتحانہ نعرے لگا رہا تھا اور حقارت آمیز الفاظ میں انکو چیلنج دے رہا تھا لوگ جب اپنے نیزوں کو پھینک کر اُس کے سر کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو وہ انکو بڑی چابکدستی سے گیند کی طرح جھیل لیتا تھا، اور پھر لوٹکر اُنھی کے سر پر رسید کرتا تھا اُس کے اندر ایک وحشیانہ مسرت کا جوش تلاطم تھا۔ اسی حالت میں ایک پہاڑی پر اُس کی نظر پڑی جس کی چوٹی عام سطح کوہستان سے بہت

اونچی نکلی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر کلغی کی طرح ایک سرِ بفلک صنوبر کا درخت اُگا ہوا تھا!
درخت کی انتہائی بالائی شاخوں میں ایک شاہین کا گھونسلا تھا جو اُس بلند فضا میں ہولے
جھولا جھول رہا تھا! دلیر باغی کی بلند حوصلگی اور بلند پروازی ان بلندیوں کے مناظر میں
اپنی معراج پر تھی چنانچہ وہ دوسرے دن اسی درخت پر جا چڑھا اور بالکل اس کی چوٹی
پر پہنچ گیا۔ گرفتار کرنے والوں کا پڑاؤ بھی اسی نواح میں پڑا ہوا تھا اور وہ بدستور سرگرم
جستجو تھے، لیکن وہ اُنکی تیز نظروں سے بالکل بے خوف اپنی "میمونی تفریح" میں مصروف
تھا۔ گھونسلے کے پاس جا کر اُس نے آشیانہ نشین شاہیں کے بچوں کا جائزہ لینا شروع
کیا۔ انکے ماں باپ اس مخدوش انسانی دستبرد سے بیتاب ہو گئے اور مداخلت کرنیوالے
کے سر کے گرد منڈلانے لگے۔ وہ تیزی اور خونخواری سے اس پر جھپٹے مارتے لیکن وہ
خوشی سے اُنکا خیر مقدم کرتا اور اُنکے خطرناک پنجوں کے وار کو اپنے کھلے ہوئے چاقو پر لیتا۔
شکاری پرندوں کی ساری حملہ آوری بیہودہ تھی اور ہمارے باغی کے لئے ایک دلچسپ
سامانِ تفنن!

اب اُس کا شوقِ تفریح اور بھی تیز ہوا اور اس نے کیا کیا کہ عین گھونسلے میں پاؤں
ڈال کھڑے ہو کر "ہنڈولے" کی طرح اُس میں جھولنا شروع کیا!

مگر اب جبکہ دیر کے بعد ہوش آیا تو متعاقبین دور نکل گئے تھے۔ تفتیش کے دوران
میں ان میں سے ایک کی بھی نظر ہمارے من چلے جنگلی پر نہ پڑی جو آسمان سے باتیں کرنیوالے
ایک نرالے جھولے پر بچپنے کی ساری بے ہوشی اور بے پروائی کے ساتھ محو لہو و لعب تھا! مگر
اب اُس نے آخر کار موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اُسکا جی لرز گیا اور ہاتھ پاؤں میں
رعشہ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی گویا تلوار کی دھار پر سدھی ہوئی تھی اور اُس کو اپنا حشر
بہت ہولناک نظر آ رہا تھا! آخر کار بہزار خرابی وہ درخت سے صحیح سالم اترنے میں کامیاب
ہو گیا۔ اگرچہ اب وہ زمین پر تھا مگر ہراس و ہیبت نے اُس کے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ

وہ اب بھی کانپ رہا تھا۔ لغزش زدہ پاؤں کو سہارا دینے کے لئے اُس نے ایک درخت کا تنہ پکڑ لیا، اور بالآخر زمین پر چت لیٹ گیا اور ایک جھاڑی کے پردے میں اپنے آپکو چھپا لیا۔ اس وقت وہ ایسا ہیجان اور زار و نزار ہو رہا تھا کہ صرف ایک آدمی بآسانی اُس گرفتار کر سکتا تھا!

ماہی گیر کا نام ٹارڈ تھا، وہ صرف سولہ سال کا تھا لیکن مضبوط اعصاب اور بڑے دل گردے کا نوجوان تھا۔ اُس کی بادیہ نشینی کو اب ایک سال ہونے آتا تھا

دہقانی کا نام برگ تھا، لوگ اسکو "دیو" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک خوبصورت سڈول جسم کا آدمی تھا، سارے ضلع کی آبادی میں سب سے زیادہ قوی الجثہ اور طویل القامت تھا۔ وہ چوڑا سینہ اور کاندھے رکھتا تھا لیکن پھر بھی چھریرا معلوم ہوتا تھا، اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کام کاج سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔ اُس کے بال بادامی تھے اور اُس کے چہرے کے رنگ میں ایک صباحت تھی۔ لیکن جنگل میں رہنے سے اُس کے تیوروں میں قدرے خشونت پیدا ہو چلی تھی۔ شکاریوں کی سی نظر بازی کی مشق سے اُس کی آنکھیں بڑی تیز ہو گئی تھیں، اور پیشانی پر جلالی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اُس کے ہونٹ زیادہ چپک گئے تھے اور چہرے کا سارا حلیہ متغیر ہو گیا تھا۔ منہ کا گوشت پگھل گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ کنپٹیاں خشک ہو گئی تھیں اور اُن میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ الغرض جنگل کی جفاکشی کی زندگی سے جسم کی ساری نرمی و نزاکت رخصت ہو گئی تھی، اور رگ گوشت بدن میں بہت خشکی اور سختی آ گئی تھی، لیکن اعصاب میں اسی نسبت سے مضبوطی بھی آ گئی تھی۔ بالوں پر بھی تیزی سے سفیدی آ رہی تھی۔

ٹارڈ نے جسمانی جمال و جلال کا ایسا پیکر عمر بھر نہ دیکھا تھا۔ اُس کو اپنے متخیلہ میں برگ ایک عظیم الشان شاہ بلوط معلوم ہوتا تھا۔ وہ آقا کی طرح اس کی خدمت کرتا تھا، اور

دیوتا کی طرح اُس کی پرستش! ٹارڈ بھی ایک رضا کار اور بے عذر غلام بنکر شکاری نیزہ اٹھا کر جنگل کو پہلتا، اور مارا ہوا شکار خود ہی لادکر لاتا، خود ہی پانی بھرتا، اور خود ہی آگ جلاتا۔ دیوہیکل برگ ان ساری نیاز مندانہ خدمتوں کو شرف قبولیت بخشتا لیکن کبھی بھولے سے بھی ٹارڈ پر ایک نظر نوازش نہ ڈالتا۔ وہ اُس کو ایک حقیر شئے سمجھتا تھا، اور ایک قابل نفرت چور!

یہ لوگ اگرچہ باغی ہوگئے تھے، لیکن لوٹ مار پر بسراوقات نکرتے تھے۔ اُن کا ذریعہ معاش شکار اور ماہی گیری تھا۔ وہ ایسی امن پسندی اور خوش معاشی کی زندگی بسر کرتے تھے کہ اگر برگ ایک مقدس شخص کا قاتل نہوتا تو گردونواح کے دیہات والے کبھی اسقدر انکے درپے نہوتے اور کوہستان کی پناہ گاہ میں انکو بے غل وغش زندگی بسر کرنے دیتے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک ایسے شخص کو کیفر کردار کو نہ پہنچایا گیا جس نے خدائے قدوس کے ایک خادم خاص (راہب) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں تو گاؤں پر قہر خداوندی نازل ہوجائے گا! جب کبھی ٹارڈ آبادی میں اپنا شکار بیچنے کے لئے لیجاتا تو لوگ بخوشی اُسکو خریدتے، اور کچھ زائد رقم بھی اس کو پیش کرتے۔ وہ اُس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اُن سے برگ کی مخبری کردیے کہ وہ اس کو اپنے مواخذے سے بری کرنے کے لئے بھی تیار تھے لیکن ٹارڈ ساری مراعات کو ٹھکرادیتا اور اگر کبھی گاؤں والے خود ہی اس کے ساتھ ہولیتے تاکہ قاتل کا سُراغ لگائیں تو وہ غلط راستہ اختیار کرلیتا اور انکو اسقدر سرگردان کرتا کہ پریشان ہوکر وہ اس تفتیش سے دستبردار ہوجاتے!

ایک دفعہ برگ نے ٹارڈ سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ کبھی لوگوں نے اُس کو خیانت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب ٹارڈ نے اثبات میں جواب دیا اور برگ کو اُس انعام کی مقدار معلوم ہوئی جو اس کام کے معاوضہ میں اُس کو پیش کیا جاتا تھا تو اُس نے بہت متغص ہوکر کہا کہ "تم بڑے گدھے ہو کہ ایسے بڑے معاوضہ کو مفت میں ہاتھ سے دیدیا!"

برگ کی اس گفتگو پر ٹارڈ کی آنکھیں ایک ایسے جذبے سے منعکس ہوگئیں جس کا مشاہدہ اول الذکر نے کبھی نہ کیا تھا، کسی حسین عورت نے جس کو ایام شباب میں اُس نے اپنی محبوبہ بنایا ہو، کبھی اُس کی طرف اس نگاہ ناز اور ایسی طرز جانفستاں سے نہ دیکھا ہوگا، خود اُس کے بچوں اور اُس کی بیوی کی آنکھوں نے کبھی ایسی محبت پاشی نہ کی ہو گی!

"آہ آپ ایسا خیال فرماتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ میں نے آپ کو اپنا دیوتا بنایا ہے! آپ میرے فرمانروائے مطلق ہیں جن کی حکومت کو میں نے اپنے اوپر بہ طیب خاطر قبول کیا ہے!"

برگ کے دل میں اس نوجوان کی طرف سے کچھ جگہ ہوئی، وہ اب ذرا قدر کی نگاہ سے اُس کو دیکھنے لگا، اُس نے محسوس کیا کہ لڑکا ایک خلوص و وفا کا پیکر ہے، اور اگرچہ وہ لمبے چوڑے دعوے کرنے کا عادی نہیں لیکن وقت پر اپنی جان پر کھیل جانیوالا ہے! وہ کوہ صحرا کے سارے خطرات اور موسم کی بے رحمیوں کے سارے مصائب بھگتنے کے لئے تیار ہے، لیکن اُس کی رفاقت اور خدمت سے محرومی گوارا نہیں کرتا۔

کبھی کبھی برگ اُس کے ان فداکارانہ جذبات کی طرف اشارہ کرتا اور اس کی اس بے غرض محبت کا سبب اُس سے پوچھتا تو وہ اس معمے کو حل نہ کرسکتا اور کچھ سراسیمہ سا ہو جاتا!

ٹارڈ کبھی رات کو آگ کے پاس نہ لیٹتا جو غار کے عقبی گوشہ میں گرمی پیدا کرنے کے لئے جلائی جاتی تھی، اُس کے نزدیک برگ کی جان کی حفاظت اور اُس کے مسکن کی نگہبانی مقدم تھی۔ چنانچہ جب برگ سو جایا کرتا تو وہ سرک کر آتشدان کے پاس سے غار کے منہ پر چلا آتا اور وہاں ایک چوڑی سِل پر بستر لگا کر لیٹتا! برگ نے ایک رات اس بات کو دیکھ پایا، اگرچہ اُس نے اپنے قیاس سے اس کی وجہ معلوم کرلی تاہم اُس نے ٹارڈ سے اُس کی نسبت پوچھا۔ مگر ٹارڈ کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ مزید پرسش اور کاوش سے برگ کو بچانے کے لئے اُس نے اپنے بستر کی جگہ بدل دی، اور دو نین کا غوطہ دے کر

پھر اپنی اصلی "خوابگاہ" میں منتقل ہوگیا!

ایک رات برف کا سخت طوفان آیا۔ تمام شجر و حجر برف پوش ہوگئے، بلند صنوبر کے درختوں کی چوٹیوں سے لے کر نیچی سے نیچی جھاڑی کی جڑ تک برف کے تودوں میں اَٹ گئی۔ یہ طوفان برف و باد اتنا شدید تھا کہ "باغیوں کے غار کے بعض اندرونی گوشوں تک کی برف کی گلوں نے خبر لی، ٹارڈ جب صبح اُٹھا ہے تو وہ برف کے ایک کمبل میں لپٹا ہوا تھا! یہ ایک اندیشہ ناک افتاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ برف باری کے دو تین دن بعد ٹارڈ بیمار پڑگیا۔ اُس کے سینہ کے رگ و ریشہ میں درد پیدا ہوگیا اور اُس کو تنفس میں وقت محسوس ہونے لگی۔ کئی دن تک وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کرتا رہا لیکن ایک دن شام کو جب وہ آگ پھونکنے کے لیے جھکا تو یکبارگی درد اور ضعف میں بیتاب ہوگیا بے اختیار گر پڑا، اور کسی طرح اُٹھ نہ سکا۔ برگ جھپٹکر پاس آیا اور اس کو بستر میں آرام سے لیٹنے کی ہدایت کی۔ ٹارڈ اگرچہ درد کی شدت سے بے حال تھا لیکن ایسا نزار و نزار ہو رہا تھا کہ مطلق حرکت نہ کرسکتا تھا۔ وہ بیچارگی سے پڑا پڑا کراہ رہا تھا۔ آخر برگ نے اُس کو اپنی گود میں اُٹھایا اور بستر پر جا کر ڈالا۔ ٹارڈ کو اُٹھاتے وقت برگ کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی سانپ کو چھو رہا ہو! اس کے منہ سے اس کو ایسی بو آئی جیسے اُس نے گھوڑے کا گوشت کھایا ہو! ایک ذلیل و حقیر چور کے بدن کو مس کرتے ہوئے وہ کیسا متنفر و بے زار ہو رہا تھا!

برگ نے ریچھ کی کھال ٹارڈ پر ڈالدی اور اُس کو پانی لاکر دیا۔ یہی کل تیمارداری تھی جو اُس نے اُس کی کی۔ لیکن خوش قسمتی سے بیماری خطرناک نہ تھی اور ٹارڈ کی صحت و طاقت بہت جلد عود کر آئی۔ اس بیماری کے ایام میں چونکہ برگ نے بھی ٹارڈ کی تھوڑی خدمت و خبرگیری کی اس لئے دونوں ایک دوسرے سے اور بھی مانوس ہوگئے۔ برگ کی نگاہ لطف نے ٹارڈ کی کچھ ہمت افزائی کی، اور وہ کبھی اپنے آقا سے ہم کلام ہولیتا تھا

چنانچہ ایک دن شام کو جبکہ دونوں آگ تاپ رہے تھے اور تیر بناتے جاتے تھے، اُنکے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

"آپ بہت عالی خاندان شخص ہیں" ٹارڈ نے برگ سے کہا "آپ کے رشتہ دار اس گانوں کے سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہیں، آپ کے ہم نام (لقب) اور ہم خاندان لوگوں نے بادشاہوں کی خدمتیں کی ہیں، اور اُن کے قلعوں میں لڑکر داد وفاداری دی ہے۔"

"لیکن اکثر اوقات انہوں نے بادشاہوں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا ہے اور شاہی املاک دجائداد کو نقصان پہنچایا ہے" برگ نے جواب میں کہا۔

"آپ کے بزرگ میلاد مسیحؑ کی تقریب پر بڑی بڑی شاندار دعوتیں دیا کرتے تھے اور جبتک آپ کی یہ جلاوطنی شروع نہ ہوئی تھی تو ضیافتوں کی ان خاندانی روایات کو آپ نے بھی پوری آن کے ساتھ قائم رکھا۔ آپ کے دارالضیافت کے پُرشوکت ایوان میں سیکڑوں مردوں اور عورتوں کی کرسیوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ یہ ہال ایک قدیم عہد کی تعمیر تھا اور ایک مشہور رسم کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ بڑے بڑے نقرئی ظروف ان دعوتوں میں استعمال کئے جاتے تھے اور پُرتکلف کھانوں سے مہمانوں کی مدارات کیجاتی تھی۔"

ان نیاز کیشانہ قصیدہ خوانیوں پر برگ نے ٹارڈ کی طرف دیکھا۔ ٹارڈ اپنے بیان سے خود متاثر ہو رہا تھا جس وقت برگ کے خاندان کی عظمت وحشمت کے ذکر واذکار میں وہ رطب اللسان تھا، تاریخ گزشتہ کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، چشم تخیل نے اُن پُرشوکت ضیافتوں کی تصویر کھینچدی جن میں زرق برق لباس پہنے ہوئے مہمانوں کا ہجوم ہوتا تھا اور برگ صاحب خانہ کی حیثیت سے ساری محفل کا سرتاج نظر آتا تھا۔ برگ نے دیکھا کہ اُس کی عظمت واقبال کے زمانے میں بھی کوئی خادم اُس کے لئے اس قدر طاعت واطاعت کا مجسمہ نہ تھا، نہ اُس کا ایسا مداح اور وفادار! وہ اس سے بہت متاثر ہوا لیکن

ساتھ ہی اس نے ایک طرح کی کبیدگی بھی محسوس کی ۔ ٹارڈ پھر ایک حقیر آدمی ہے ۔ اس کے منہ کی تعریف و توصیف ہی کیا ؟ ایک ذلیل چور اُس کی مدح وستائش کر کے سوئے ادب کا موجب ہو رہا ہے !

"کیوں کیا تمہارے گھر میں دعوتیں نہیں ہوا کرتی تھیں ؟" برگ نے سوال کیا

" وہ دور چٹانی جزیروں پر والد و والدہ کا دولت خانہ ہے ! باپ کا یہ پیشہ ہے کہ طوفانِ شکستہ کشتیوں کو لوٹ لیا کرتا ہے ، اور ماں ایک جادوگرنی ہے ۔ جب سمندر متلاطم ہوتا ہے اور بحری مسافروں کی کوئی جماعت مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو وہ ایک آبی جانور کی پیٹ پر سوار ہو کر موقع واردات پر پہنچ کر منتظر کھڑی ہو جاتی ہے ، اور موجیں جتنی لاشوں کو اچھالکر خشکی پر پھینکدیتی ہیں وہ سب اس کا مال ہوتی ہیں !"

" مگر وہ لاشوں کو لے کر کیا کرتی ہے ؟" برگ نے پوچھا ۔

" اجی آپ کو معلوم نہیں ؟ جادوگرنیوں کو ہمیشہ لاشوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے میری ماں اُن سے دوا بناتی ہے ، اور شاید ان کو کھاتی بھی ہے ۔ چاندنی راتوں میں وہ ان لاشوں کو لے کر بیٹھتی ہے اور اپنے عملیات وحاضرات کیا کرتی ہے ۔" ٹارڈ نے جواب دیا ۔

" کتنی ہولناک باتیں ہیں !" برگ بولا ۔

اسمیں شک نہیں ہے ؛ لیکن یہ محض دوسروں کے نقطۂ نظر سے نہ کہ ایک جادوگرنی کے خیال میں ، اُسکو بغیر اس کے چارہ نہیں ۔" ٹارڈ نے متانت اور سکون سے کہا ۔

برگ کے لئے یہ ایک بالکل ہی نیا زاویۂ نگاہ تھا جس سے اُس نے ایک عورت کی زندگی پر تبصرہ کیا ۔

" تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پھر چوروں کو چوری کرنا چاہئے جس طرح کہ جادوگرنیوں کے لئے جادو منتر کرنا لازمی ہے ؟" برگ نے جھلا کر سوال کیا ۔

" جی ہاں ، کیوں نہیں " لڑکے نے جواب دیا " ہر شخص کو لامحالہ وہ کام کرنا

مزوری ہے جس کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے۔" لیکن انکسار اور دعا سے مخلوط ایک مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ظاہر ہوئی جس کے ساتھ اُس نے کہا:

"بعض ایسے چور بھی ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے۔"

"اس بے معنی بات کے معنی؟" برگ نے پوچھا۔

لڑکے کے چہرے پر اب بھی وہی پُر اسرار مسکراہٹ تھی، برگ کے سامنے اس نے ایک پہیلی کہدی تھی اور برگ اُس کی بوالعجبی سے جس طرح ششدر و پیچ میں تھا اُس سے ٹارڈ لطف لے رہا تھا۔

"ہاں بعض ایسی چڑیاں ہیں جو اڑتی نہیں، اور بعض ایسے چور ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے!" ٹارڈ نے پھر کہا۔

برگ نے ارادۃً اپنے کو مبہوت بنا لیا تاکہ ٹارڈ جو رمز کہہ رہا تھا اس کی تشریح کرے اُس نے کہا:

"یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس نے چوری کا ارتکاب نہ کیا ہو اُس پر چور کا لقب صادق آئے!"

لڑکے نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے، گویا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اُس کو زبان پر لانے میں تامل ہے۔

"لیکن فرض کیجئے کہ اس کا باپ چور ہو؟" بالآخر اُس کے منہ سے نکلا۔

"ایک لڑکا ورثہ میں اپنے باپ کا گھر اور مال پا سکتا ہے، لیکن "چور" کا خطاب تو اُسے خود اپنی کمائی کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔

ٹارڈ آہستہ سے ہنسا "لیکن اگر کسی کی خوش قسمتی سے اُس کی ایک ماں ہو جو اُس کے پاس آئے اور واویلا مچائے اور منت وزاری سے کہے کہ باپ کے جرم کا ترکہ بھی قبول کرو۔ اور پھر اگر وہ اس مصیبت میں مبتلا ہو جائے، اور ایک موقع پر جبکہ وہ

بالکل ناکردہ گناہ ہو سرکاری داروگیر سے اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں بھاگ آئے تب؟ ممکن ہے کہ اس کو باغی بنا کر قانون کے سارے حق حقوق سے محروم کر دیا جائے لیکن وہ غریب کیا کرے جب کہ اُس کے اوپر ایک ایسے مچھلی کے جال کی چوری کا الزام ہو جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے؟"

برگ نے غصے میں اپنا گھونسہ پتھر کے تختے والی میز پر مارا! "اُف اس نوجوان خوبصورت لڑکے نے اپنی جوانی میرے لئے وقف کر دی! اس کو اپنے ماں باپ کی کوئی محبت نہیں، اپنی برادری کی وابستگی کا کوئی خیال نہیں، چوری کے پیشہ کے دھن دولت کا کوئی لالچ نہیں صرف میرے لئے گویا "امور خانہ داری کا کل انصرام اس نے اپنے اوپر لے رکھا ہے" اور پھر کمبخت نے مجھکو اپنی حقیقت سے بالکل بے خبر رکھا اور میری بدسلوکی سے اپنی معصومیت کی توہین کرائی!"

الغرض برگ نے تارڈ سے بہت شکوہ شکایت کیا، لیکن نوجوان نے مطلق اُس کی پروا نہ کی، اور اُس کو صرف ایک دلسوز ماں کی ملامت سمجھا!

کوہستان کی بلندی پر ایک مسطح قطعہ پر جس پر گھنی جھاڑی تھی، ایک دلدلی جھیل واقع تھی۔ اُسکا دور مربع شکل کا تھا، اور اُس کے کنارے بھی ایک مربع کے ضلعوں کی طرح خط مستقیم میں چلے گئے تھے۔ جھیل کے گوشے بھی ایسے ہی صاف تھے گویا کہ وہ اقلیدی شکل کے باضابطہ زاویے ہوں اور انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہو۔ جھیل کے تین طرف اونچی پہاڑیاں تھیں جن کی سنگین سطح پر سخت جان کوہستانی صنوبر اُگے ہوئے تھے، اور جن کی جڑوں کی دبازت ایسی تھی جیسی کہ انسانی بازوؤں کی موٹائی ہوتی ہے۔ یہ جڑیں پانی میں بھی چلی گئی تھیں اور اکثر موقعوں پر جھیل کی سطح کے اوپر نکل آئی تھیں۔ آپس میں پیچ در پیچ ہو کر انہوں نے ایک خاص منظر اختیار کر لیا تھا، اور ایسا نظر آتا تھا کہ گویا یہ کوئی عجیب و غریب قسم کے سانپ ہوں جو پانی سے نکلکر بھاگ رہے ہوں لیکن جھیل کے

کسی سحر انگیز اثر سے پتھر بن گئے ہوں! یا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان دیووں کے ڈھانچے ہیں جو کبھی جھیل میں ڈوب گئے ہیں اور اب ان کی مردہ ہڈیوں کو جھیل نکال کر پھینکدینا چاہتی ہے۔ سکرات موت کے عالم میں ان دیووں کے ہاتھ پاؤں بری طرح آپس میں اینٹھکر الجھ گئے ہیں اور انگلیاں سخت ہو کر پتھروں میں غرق ہو گئی ہیں، اُنکی پسلیوں نے محرابیں بنائی ہیں جو ان عظیم الہیئت درختوں کو اپنے اوپر سادھے ہوئے ہیں! لیکن وقتاً فوقتاً ان آہنی انگلیوں اور سنگین پنجوں کی ساری گرفتیں اور بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور تیز و تند شمالی آندھیوں نے ان درختوں کو اکھاڑ پھینکا ہے جو اپنے موقع سے بہت دور جھیل کی دلدل میں جا گرے ہیں، جہاں اُنکی چوٹیاں کیچڑ ملے پانی میں گھس گئی ہیں۔ درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں نے مچھلیوں کو چھپنے کے لئے محفوظ کنج بہم پہنچائے ہیں۔ گرے ہوئے درختوں کا سارا نقشہ ایسا ہے کہ گویا وہ دیووں اور بھوتوں کے خوفناک پنجر ہوں جنہوں نے جھیل کو بد منظر کر کے اس کو ایک مکروہ صورت دیدی ہے!

جھیل کے چاروں طرف سنگین کنارے سلامی بنتے چلے گئے ہیں۔ ایکطرف سے ایک چھوٹا سا دریا جھیل سے نکلا تھا، لیکن قبل اس کے کہ اس کو ایک ہموار راستہ ملے اُسکو بہت سے پیچیدہ اور تنگ نالوں، نالیوں میں ہو کر گزرنا پڑا، جا بجا مٹی اور پتھر کے تودوں کی بلندیاں ہیں جنہوں نے بیشمار جزیروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مجمع الجزائر میں بعض ٹاپو اتنے چھوٹے ہیں کہ بمشکل اُن پر قدم رکھا جا سکتا ہے اور بعض کا طول وعرض اور رقبہ ایسا ہے کہ وہ اپنی پشت پر بیس بیس درختوں کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔

یہاں چونکہ چٹانیں زیادہ بلند نہیں ہیں اور سورج کی روشنی کے لئے کھلا رستہ ہے اس لئے تھوڑے تھوڑے پتوں والے درخت اُگ آئے ہیں، مزید براں مختلف قسم کی کوہستانی نباتات کا اس جگہ ہجوم ہے اور ان کی سبزی اور پھولوں کی عطر بیزی سے یہ خطہ معطر اور گلزار ہو رہا ہے۔

جھیل کے دہانے پر چھوٹی چھوٹی قدآدم جھاڑی کا ایک جنگل ہے جس میں سے ہو کر
سورج کی دھوپ ایسی نرم اور سبزگوں ہو کر پڑتی ہے جیسے کہ ہری مخمل کے فرش پر لیمپ کی
روشنی۔ جن موقعوں پر پانی تھا وہاں جھاڑیوں روزنوں نے پیدا ہو کر چھوٹے چھوٹے تالاب
بنا دئے ہیں جن میں کنول چمک رہے ہیں! فطرت کی یہ نازک اندام اور گلبدن نازنینیں
طلوع آفتاب کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولتی ہیں اور سورج کی شعاع واپسیں کے ساتھ اپنے
ننھے ننھے سینوں کو بند کرلیتی ہیں۔

(باقی)

غزل

از حضرت جگر مرادآبادی

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب — "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"
شوق بے پایاں و جوش بے حساب — عشق کیا ہے ایک مسلسل اضطراب
دستِ رنگین و جمالِ بے حجاب — اے خوش آں وقتے و خوش جامِ شراب
میری ہستی ہی غبارِ کوئے دوست — مجھ سے پیدا ہر سکوں ہر اضطراب
ہوش ہے پھر مائل فرزانگی — لاشراب، او دست ساقی لاشراب
آج کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں — میں کہاں ہوں اے نگاہ باریاب
جاں سراپا کچھ ہے راحت کچھ خلش — دل مجسم کچھ سکوں کچھ اضطراب
عشق کیا ہے پرتوِ حسن تمام — شوق کیا ہے حسن کا عکسِ شباب
اُن لبوں کی جاں نوازی دیکھنا — مُنہ سے یوں اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب، اجل تعبیرِ خواب

ولہ

ستم کامیاب نے مارا — کرم لاجواب نے مارا
ایک رنگیں نقاب نے مارا — حُسن بن کر حجاب نے مارا
جلوۂ آفتاب کیا کہئے — سایۂ آفتاب نے مارا
نگہہ شوق و دعوی دیدار — اس حجاب الحجاب نے مارا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا ۔۔۔ اس ادائے حجاب نے مارا
اب نظر کو کہیں قرار نہیں ۔۔۔ کاوش انتخاب نے مارا
ہم نہ مرتے ترے تغافل سے ۔۔۔ پرسش بے حساب نے مارا
خود نظر بن گئی حجاب نظر ۔۔۔ ہائے اس بے حجاب نے مارا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا ۔۔۔ اس سوال و جواب نے مارا
حشر تک ہم نہ مرنے والوں کو ۔۔۔ مرگ ناکامیاب نے مارا
بچ رہا جو تری تجلی سے ۔۔۔ اُس کو تیرے حجاب نے مارا
اپنے سینہ ہی پر پڑا اکثر ۔۔۔ تیر جو اضطراب نے مارا

دل کہ تھا جان زیست آہ جگر
اسی خانہ خراب نے مارا

ولہ

غافل زدہ لم نشنیں جاناں زسر مستی ۔۔۔ صد نغمہ برانگیز و سازے کہ تو بشکستی
صد حسن دراں نہاں صد جلوہ ازاں پیدا ۔۔۔ قربان نگاہ تو، نازیم بہ ایں مستی
از اول گام عشق، کردیم نثار حسن ۔۔۔ دنیا و غم دنیا، ہستی و غم ہستی
گہ تا فلک اندیشم گہ بیخبر از خویشم ۔۔۔ گاہے بہ جناں ہوشے گاہے بہ جنیں مستی

آں رند خراباتے نامش کہ جگر خوانند
صد ہوش بہ جاں دارد با اینہمہ صد مستی

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

نظام المشائخ (رسول نمبر)   پیشوا (رسول نمبر)

نظام المشائخ (رسول نمبر) | سائز ۸×۲۲ حجم علاوہ اشتہاری ضمیموں کے ۲۳۲ صفحات
سالانہ چندہ باتفسیر ہے بے تفسیر ۶ فی پرچہ ۴ر اس نمبر کی قیمت ۸ر
پتہ :- دفتر نظام المشائخ ۔ کوچہ چیلان ۔ دہلی ۔

خواجہ حسن نظامی صاحب' خالص اور بے میل، سادہ اور چٹکیلی اردو لکھنے میں جتنی صحیح اور جائز شہرت رکھتے ہیں اسی قدر انکا یہ رسالہ پسندیدہ شہرت کا مالک ہے۔ رسالہ کی یہ ۴۲ ویں جلد ہے اور عام رواج کے مطابق جبلی نمبر کے لئے گویا اب ۷ یا ۸ ہی جلدوں کی کسر ہے۔ عرصے سے اب اس کی ترتیب واشاعت کے ذمہ دار خواجہ صاحب کے معقول، سنجیدہ و متین حواری جناب واحدی ہیں اور خوشی کی بات ہے رسالہ انکی ادارت میں برابر ترقی کر رہا ہے ۔

رسول نمبر ماشاءاللہ بہت خوب ہے اور مرتب کی خوش مذاقی اور سلیقہ کا شاہد۔ مضمون نگاروں میں بعض مشاہیر علماء اور معروف ادیبوں کے نام ہیں اور اول سے آخر تک جو کچھ ہے معقول و دلچسپ ہے۔ سیرۃ مقدسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً جملہ مضامین متین دلکش اور بعض خاصی کاوش و تلاش کے نتائج ہیں۔ چند نظمیں بھی اچھی خاصی ہیں، حضرت امجد حیدرآبادی کی نظم ہجرت خواجہ حالی مرحوم کے مشہور مسدس کے انداز میں سب نظموں پر بھاری ہے، لیکن اگر نظموں کی مزید تلاش و ترتیب میں ذرا اور کاوش کیجاتی تو اچھا تھا۔
بہرحال رسول نمبر محاسن صوری و معنوی سے آراستہ اور رواج کے خلاف گندے

اشتہاروں سے بھی الحمدللہ پاک وصاف ہے۔ سرورق کا ڈیزائن بھی مرغوب سادگی کے ساتھ بہت دلکش ہے۔

پیشوا (رسول نمبر) | سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۱۸۴ صفحات، سالانہ چندہ ۶/ فی پرچہ ۳/ اس نمبر کی قیمت ۱۲/
پتہ:- دفتر پیشوا دہلی۔

یہ اس رسالہ کی چھٹی جلد شروع ہوا اور خوشی کی بات ہے۔ اس مختصر عرصے میں رسالہ نے باعتبار روش اور بلحاظ محاسن صوری و معنوی امید افزا ترقی ہے۔ اس سال اس نے پھر ایک موٹا سا بھاری بھرکم رسول نمبر نکالا ہے جو پچھلے سال سے بہتر ہے۔ کاغذ نفیس اور کتابت بھی (بقائی صاحب کے رسالے کی بری بھلا کیونکر ہو سکتی ہے) خاصی ہے۔ طباعت کے لئے آزاد پریس کا نام کافی ضمانت ہے۔ پورے ڈھائی درجن بلاک کے مطبوعہ فوٹو ہیں گویا روحانی تسکین و تسلی کے ساتھ ساتھ مقامات مقدسہ کا ایک البم بھی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے موجود ہے۔

پوری ۲۹ نعتیہ نظمیں اور تقریباً ۸۰ مضامین نثر کے ہیں جو اکثر مشہور علماء اور ادیبوں کے نتائج افکار و قلم ہیں۔ مختصراً یہ کہ رسول نمبر ماشاء اللہ بہت اچھا ہے اور مسلمانوں کو اس سے ضرور مستفیض ہونا چاہئے۔

جناب بقائی کی خدمت میں بخلوص و ثبات نیت ہم یہ عرض کرنے سے کسی طرح باز نہ رہ سکے کہ "رسول نمبر" کا ڈیڈیکیشن دنیا کے کسی بڑے سے بڑے رئیس یا "شہریار کے نام" دیکھ کر راقم الحروف ایسے عامی مسلمان کو تو تکلیف ہی ہوئی۔ خواہ وہ رئیس یا "شہریار" کیسے ہی پسندیدہ صفات و خصائل محمودہ کے مالک ہوں۔ اس کے علاوہ رسول نمبر میں "شب عروسی" کا اشتہار وہ بھی بہت نمایاں کہ ٹھیک سرورق کے صفحہ ۴ پر خاصی زیب و زینت کے ساتھ دیا گیا ہے، کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔

(م-ا-ا)

شذرات

وسط اگست سے دہلی کے بعض محلوں میں فصلی وبا شروع ہوگئی ہے لیکن خدا کے فضل سے اور محکمہ حفظان صحت کی سرگرمی کی بدولت اب تک زیادہ پھیلنے نہیں پائی اور امید ہے کہ آخر ستمبر تک موسم بدل جانے کے بعد بالکل معدوم ہو جائے گی۔ جامعہ ملیہ میں حفظ ما تقدم کی پوری کوشش کیجا رہی ہے۔ سب طلبہ کے ٹیکے لگائے گئے ہیں اور کھانے پینے میں ہر طرح کی احتیاط کی جا رہی ہے۔ حفظان صحت کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر سیٹھنا صاحب اس معاملے میں منتظمین جامعہ کی پوری امداد کر رہے ہیں اور انکے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے معائنے کے سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی کہ جامعہ کے طلبہ کی صحت کا عام معیار دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جناب شیخ الجامعہ صاحب اور بورڈنگ ہاؤسوں کے نگراں طلبہ کی تندرستی کے لئے نہایت دلسوزی اور توجہ سے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں یوں تو حافظ حقیقی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر شخص کو اپنی صحت اور سلامتی کے لئے اسی کا شکر کرنا چاہئے لیکن منتظمین جامعہ اس لحاظ سے تعریف کے قابل ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنے فرائض کا پورا احساس رکھتے ہیں اور انہیں بہت خوبی سے انجام دیتے ہیں۔

امیر جامعہ جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ ۶ ستمبر کو بھوپال اور حیدر آباد کے قصد سے روانہ ہو رہے ہیں کہ اپنے احباب خاص کے حلقہ میں جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر

ذاکر حسین خانصاحب بھی ممدوح کے ہمراہ تشریف لیجائیں گے۔

پچھلے مہینے جناب مولانا محمد علی صاحب کو وہ جانکاہ صدمہ پیش آیا جسے انسان کا قلب بغیر خداوند تعالیٰ کی مدد کے ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ ممدوح کی صاحبزادی نے جن کا عقد جناب ماجد علی صاحب انجنیر سے ہوا تھا دیرہ دون میں وفات پائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں جناب مولانا و بیگم محمد علی صاحبہ اور ماجد علی صاحب سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ انکو صبر جمیل عطا کرے۔

جامعہ ملیہ کے فارغ التحصیل طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے عموماً جرمنی یا فرانس جایا کرتے ہیں کیونکہ ان ممالک میں تمام یونیورسٹیاں جامعہ کی سند کو تسلیم کرتی ہیں اور یوں بھی ان ممالک میں ہندوستانی طلبہ کے ساتھ وہ تعصب نہیں برتا جاتا جس کے لئے انگلستان بدنام ہے۔ براعظم یورپ کی تعلیمگاہوں میں عموماً اور جرمنی کی یونیورسٹیوں میں خصوصاً اتنی علمی فیاضی پائی جاتی ہے کہ ایشائی طالب علموں کو تحصیل وتحقیق کا موقع اسی طرح دیا جائے جیسے یورپ کے طالبعلموں کو بلکہ کبھی کبھی ان غریب الوطنوں کے ساتھ خاص ہمدردی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

اس سال بھی جامعہ کے دو طالب علم جرمنی جارہے ہیں جن میں سے ایک ہائیڈلبرگ کی یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنا چاہتے ہیں اور دوسرے برلن اور لائپزگ میں رہ کر عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں کا لسانیات تقابلی کے اصول پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

عربیات کے ایک فارغ التحصیل طالب علم مصر جانے کا عزم رکھتے ہیں کہ جامعہ ازہر اور جامعہ مصریہ میں عربی زبان وادب اور دینی علوم کی تکمیل کریں۔

ہم ان تینوں صاحبوں کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ تحصیل علم کے مبارک ارادے سے اتنے دور دراز سفر اختیار کر رہے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ انہیں توفیق دے کہ نہایت محنت اور جفاکشی سے تحصیل علوم میں مصروف رہیں اپنے قول و عمل سے لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک و قوم کی محبت پیدا کریں اور ہندوستان واپس آکر ایمانداری اور خلوص سے مفید علمی اور عملی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر سر سی وی رامن صاحب نے مائیسور یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن خیالات کی گہرائی اور نظر کی وسعت کے اعتبار سے ان طول طویل خطبات سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے جو سامعین کو گھنٹوں تک خواب اور بیداری کی سرحد پر اس حالت میں رکھتے ہیں کہ ازیں سو رانده وازاں سو مانده۔ موصوف نے ابتدا میں ریاست میسور کی علمی خدمات کا مناسب الفاظ میں اعتراف کیا اُس کے بعد یہ بتایا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے اور مختلف قوموں کو ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کرنے کے لئے علم کس حد تک مفید ہے اور یونیورسٹیاں جو علم کا مرکز کہلاتی ہیں اس فرض کو کیونکر ادا کر سکتی ہیں۔ مثلاً جرمنی نے اپنے علمی فضل و کمال کی بدولت جنگ عظیم کے بعد کتنی جلدی پہلے انگلستان سے اور پھر دوسری قوموں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے بلکہ ان پر دوبارہ ذہنی اور تمدنی اقتدار حاصل کر لیا۔ یونیورسٹی کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اسکا کام محض عام تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ ہر نوجوان کی مخصوص ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنا اور نشوونما دینا ہے تاکہ وہ اپنے ملک کی اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اصلاح و ترقی کا بوجھ اٹھا سکیں اور آسے دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کا ہمرتبہ بنا سکیں۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ جہاں ڈاکٹر صاحب نے ملک کی سیاسی حالت پر تبصرہ کیا

ہے اور نوجوان طالب علموں کا تعلق سیاست سے دکھایا ہے وہاں یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ موصوف بھی اور اہل علم کی طرح اپنے علمی افکار و مشاغل میں اسقدر ڈوبے رہتے ہیں کہ عملی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے سے بالکل معذور ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ نوجوانوں میں سیاسی بے چینی پیدا ہونیکی وجہ محض بیکاری ہے اور اگر انکے لئے مفید کاموں کا انتظام کر دیا جائے تو یہ بات جاتی رہے گی۔ گویا آپ کے نزدیک قوموں کا سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لئے جد و جہد کرنا محض ایک بے شغلی کا مشغلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ابتدا میں برطانوی حکومت کا بھی یہی خیال تھا اور وہ ہندوستان کے "بچوں" کو کھلونے دیکر بہلانیکی کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ مگر اسے یہ محسوس ہو گیا ہے (اور ڈاکٹر صاحب اگر چاہیں تو اس سے پوچھ کر تصدیق کر سکتے ہیں) کہ ان کھلونوں سے "بچے" تھوڑی دیر تو بہلتے ہیں لیکن پھر انکی "شرارت" چوگنی ہو جاتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب انہیں یہ نصیحت کرتے ہیں جس میں ہم بھی موصوف کے ہمزبان ہیں کہ وہ انتہائی محنت اور جفاکشی سے کام لے کر علمی میدان میں آگے قدم بڑھائیں اور اپنی قوم کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ دوسری قوموں کے دل پر جما دیں۔

نوجوانوں میں جو سیاسی ہیجان و طوفان اٹھ رہا ہے اسے روکنا نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس سیلاب کو بے قید نہ رہنے دیا جائے بلکہ نہروں میں پابند کر کے اسکا رُخ اس طرح پھیرا جائے کہ ملک کی آزادی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ اس کے دھارے میں بہہ جائیں۔

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۵۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نمبر ۳
بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء
جلد ۱۳
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

مولانا اسلم جیراجپوری　　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ - ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب ۲

باکونین اور نراج

(گذشتہ سے پیوستہ)

زار نکولاس کی موت کے بعد بہت سی سیاسی قیدیوں کو معافی دی گئی لیکن اسکندر ثانی نے خود اپنے ہاتھ سے اس فہرست سے باکونین کا نام کاٹ دیا۔ باکونین کی ماں جب نئے زار کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تو زار نے اس سے کہا "خاتون، اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا بیٹا جب تک زندہ ہے آزاد نہیں ہو سکتا۔" لیکن بہر حال ۱۸۵۷ء میں آٹھ سال کی قید کے بعد اسے مقابلۃً آزاد کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ یہاں سے ۱۸۶۱ء میں جاپان بھاگ گیا اور وہاں سے امریکہ ہوتا ہوا لندن پہنچا۔ اسے حکومتوں کی مخالفت کی وجہ سے قید کیا گیا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی مصیبتوں نے اس پر وہ اثر نہ ڈالا جو لوگ چاہتے تھے یعنی ان سے محبت پیدا کرنا جنہوں نے اس پر یہ مصیبتیں ڈالی تھیں۔ اس زمانے سے اس نے اپنے کو تمامتر نراجی بغاوت کی روح پھیلانے کے لئے وقف کر دیا اور اسے کوئی مزید قید نہیں کاٹنی پڑی۔ کچھ سال یہ اٹلی میں رہا۔ یہاں ۱۸۶۴ء میں اس نے ایک "بین الاقوامی برادری"، یا "اشتراکی انقلابیوں کا اتحاد" قائم کیا۔ اس میں بہت سے ممالک کے لوگ تھے لیکن بظاہر کوئی جرمن نہ تھا۔ اس نے اپنے کو زیادہ تر مرزبان کی قوم پرستی کی مخالفت کے لئے وقف کیا۔ ۱۸۶۷ء میں یہ سوئزرلینڈ میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اگلے سال اس نے "اشتراکی جمہوریت کے بین الاقوامی اتحاد" کے قیام میں مدد دی اور اس کا

پروگرام تیار کیا۔ اس پروگرام میں اس کے خیالات کا ایک اچھا مختصر سا خلاصہ ملتا ہے:۔

"یہ اتحاد اپنے مادہ پرست ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ طبقات (معاشی) کو قطعی اور کلی طور پر مٹانا چاہتا ہے اور مردوں، عورتوں کی سیاسی اور معاشی مساوات کا خواہشمند ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ زمین، آلات محنت، نیز ہر دوسرا سرمایہ عمل جماعت کی مشترکہ املاک ہو جائے اور سوائے کام کرنے والوں (مزدوروں) کے کوئی انہیں استعمال نہ کر سکے، یعنی صرف زرعی اور صنعتی انجمنیں۔ یہ باور کرتا ہے کہ تمام موجودہ سیاسی اور با اختیار ریاستوں کو چاہئے کہ اپنی کوششوں کو انتظامی معاملات تک محدود رکھیں اور رفتہ رفتہ زرعی و صنعتی انجمنوں کے ایک عالمگیر اتحاد میں گم ہو جائیں" جمہوریت اشتراکی کے اس بین الاقوامی اتحاد نے "بین الاقوامی انجمن مزدوران" کی شاخ بننے کی خواہش کی لیکن اس سے اس بنیاد پر انکار کر دیا گیا کہ شاخیں مقامی ہونی چاہئیں، یہ خود بین الاقوامی نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس اتحاد کی جنیوا والی شاخ جولائی ۱۸۶۹ء میں داخل کر لی گئی تھی۔

"بین الاقوامی انجمن مزدوران" ۱۸۶۴ء میں لندن میں قائم ہوئی تھی اور اس کے قواعد اور پروگرام مارکس نے بنائے تھے۔ پہلے پہل باکونین کو توقع نہ تھی کہ یہ کامیاب ہوگی اور اس نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ بہت سے ملکوں میں غیر معمولی تیزی سے پھیلی اور بہت جلد اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک موثر قوت ہو گئی۔ شروع شروع میں یہ کسی طرح بالکل اشتراکی نہ تھی، لیکن یکے بعد دیگرے اجلاسوں میں مارکس نے اسے روز بروز اپنے خیالات کا حامی بنا لیا اور تیسری کانگریس منعقدہ برسلز ستمبر ۱۸۶۸ء میں یہ قطعاً اشتراکی ہو گئی۔ اب باکونین نے بھی اپنی سابقہ علیحدگی پر افسوس کر کے فیصلہ کیا کہ اس میں شامل ہو جائے اور اپنے ساتھ فرانسیسی سوئزرلینڈ، فرانس، ہسپانیہ اور اطالیہ سے متبعین کی کافی تعداد بھی ساتھ لایا۔ چوتھی کانگریس منعقدہ بیل (Bale) ستمبر ۱۸۶۹ء میں دو مختلف لہریں بالکل جدا جدا معلوم ہوتی تھیں۔ جرمن اور انگریز ریاست کی اس

شکل میں مارکس کے ہمخیال تھے جو یہ ملکیت شخصی کے مٹنے کے بعد اختیار کریگی، یہ اس خواہش میں بھی اس کے ساتھ تھے کہ مختلف ممالک میں مزدوروں کی پارٹیاں قائم کیجائیں اور نظام جمہوریت کو اس لئے استعمال کیا جائے کہ پارلیمنٹ کے لئے مزدوروں کے نمائندے منتخب ہوں۔ برخلاف اس کے لاطینی قومیں ریاست کی مخالفت اور حکومت نمائندگان کے نظام سے بے اعتمادی کے معاملہ میں باکونین کی متبع تھیں۔ ان دونوں گروہوں کی مخالفت روز بروز تلخ تر ہوتی گئی اور ایک نے دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ یہ بیان پھر دہرایا گیا کہ باکونین جاسوس ہے اور تحقیق کے بعد واپس لیا گیا۔ مارکس نے اپنے جرمن دوستوں کے نام ایک خفیہ تحریر میں لکھا کہ باکونین اتحاد سلافی پارٹی کا کارندہ ہے اور وہاں سے ۲۵ ہزار فرانک سالانہ پاتا ہے۔ اسی زمانے میں باکونین کو روس میں کسانوں کی ایک بغاوت کے اکسانے میں دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس وجہ سے اس نے "بین الملل" کے مقابلہ کیطرف سے نہایت نازک موقع پر غفلت برتی۔ فرانسیسی پروشیائی جنگ میں باکونین نے نہایت شدت سے فرانس کی طرفداری کی خصوصًا نپولین سوم کے تخت سے اتارے جانے کے بعد اس کی کوشش تھی کہ لوگوں کو ۱۷۹۳ء کی سے انقلابی مقاومت پر ابھارے، چنانچہ لیان میں بغاوت کی ایک ناکام کوشش سے اسکا تعلق پایا گیا۔ فرانسیسی حکومت نے اس پر پروشیا کا کارندہ ہونے کا الزام لگایا اور یہ بڑی مشکل سے بچکر سوئزرلینڈ بھاگا۔ مارکس اور اس کے متبعین سے اس کی جو مخالفت تھی وہ اس قومی تنازعہ کے باعث اور بھی شدید ہوگئی۔ باکونین (جیسے اس کے بعد کروپاٹکن) جرمنی کی نئی قوت کو دنیا میں حریت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ یہ جرمنوں سے نہایت سخت نفرت رکھتا تھا کچھ تو بلا شبہ بسمارک کی وجہ سے لیکن غالبًا اس سے زیادہ مارکس کی وجہ سے۔ آجتک نراج تقریبًا کلیتہً لاطینی ممالک تک محدود ہے اور جرمنی کے خلاف نفرت سے وابستہ ہے۔ جو "بین الملل" میں مارکس اور باکونین کے مناقشہ سے پیدا ہوئی تھی۔

"بین الملل" کی عام کانگریس منعقدہ ہیگ ۱۸۷۲ء میں باکونین کے فرقہ کو قطعی طور پر دبا دیا گیا۔ اجلاس کا مقام 'جنرل کونسل' نے طے کیا تھا (جس میں مارکس کا کوئی مخالف نہ تھا اور باکونین کے دوست کہتے ہیں کہ اس خیال سے یہ جگہ منتخب کی گئی تھی کہ فرانسیسی اور جرمن حکومتوں کی مخالفت کے باعث باکونین کا وہاں آنا ناممکن اور اس کے دوستوں کا آنا دشوار ہو جائے۔ باکونین کو 'بین الملل' سے خارج کر دیا گیا، اور یہ ایک اطلاع کی بنا پر جس میں اس پر علاوہ اور باتوں کے ذرا دھمکا کر سرقہ کا الزام لگایا گیا تھا۔

بین الملل کی ار تو وکسی تو نیچ گئی لیکن اس کی قوت حیات جاتی رہی۔ اس زمانے سے خود اس میں کوئی قوت باقی نہ رہی، لیکن دونوں فرقے اپنے اپنے گروہوں میں برابر کام کرتے رہے اور بالخصوص اشتراکی گروہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگے۔ بالآخر ۱۸۸۹ء میں ایک نیا "بین الملل" قائم کیا گیا جو موجودہ جنگ کے شروع ہونے تک باقی رہا۔ اشتراکی بین الملل کے متعلق پیش گوئی کرنا خلاف احتیاط ہے، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی خیال نے اتنی کافی قوت اختیار کر لی ہے کہ جنگ کے بعد اسے پھر ایک ایسے ذریعۂ اظہار خیال کی ضرورت پڑے گی جیسی کہ پہلے اشتراکی کانگریسوں میں موجود تھی۔

اس وقت باکونین کی تندرستی بالکل بگڑ چکی تھی اور چند چھوٹے چھوٹے وقفوں سے قطع نظر ۱۸۷۶ء میں اپنی موت تک کنارہ کشی کی زندگی گذارتا رہا۔

برخلاف مارکس کے باکونین کی زندگی بہت طوفانی ہے۔ ارباب اختیار کے خلاف ہر بغاوت سے اسے ہمدردی تھی اور جب ساتھ دیتا تھا تو ذاتی خطرہ کی ذرا بھی پروا نہ کرتا اس کا اثر جو بلاشبہ بہت گہرا ہے زیادہ تر اہم افراد پر اس کی شخصیت سے پیدا ہوا۔ اس کی تصانیف بھی مارکس کی تصانیف سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی اُنکی زندگی۔ یہ منتشر ہیں، زیادہ تر عارضی مواقع کے لئے لکھی گئی ہیں، نہایت تجریدی ہیں اور فلسفیانہ، سوائے اس صورت کے کہ جب یہ سیاست حاضرہ سے بحث کرتی ہوں نہ معاشی واقعات سے دوچار نہیں ہوتا

بلکہ عموماً ایک نظری و مابعد الطبیعی دنیا میں رہتا ہے اور جب کبھی اس دنیا سے نیچے اترتا ہے تو مارکس سے کہیں زیادہ موجودہ سیاست بین الاقوامی کے زیر اثر ہوتا ہے اور اپنے اس عقیدہ کے نتائج کا بہت کم اثر رکھتا ہے کہ اصلی چیز معاشی اسباب ہیں۔ وہ مارکس کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے اس مسئلہ کی تلقین کی لیکن قومی سیاست ہی کے اعتبار سے سوچتا اور فکر کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف "سلطنت اور انقلاب جماعتی" میں زیادہ تر فرانسیسی پروشی جنگ کی آخری منازل میں فرانس کی حالت سے بحث ہے اور جرمن شہنشاہیت کا مقابلہ کرنیکے ذرائع سے۔ اس کی تصانیف کا زیادہ تر حصہ بڑی عجلت سے دو بغاوتوں کے درمیانی وقفہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ادبی ترتیب کے فقدان میں بھی نزاج کی شان ہے۔ اسکی سب سے مشہور تصنیف ایک ناتمام تحریر ہے جسے شائع کرنے والوں نے "خدا اور ریاست" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ خدا اور ریاست پر عقیدے کو انسانی آزادی کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں بتاتا ہے۔ ایک نمونے کی عبارت سے اسکا طرز ظاہر ہوجائیگا۔[۱]

"ریاست جماعت نہیں، یہ تو صرف اس کی ایک تاریخی شکل ہے، جیسی مجرد ویسی ہی بہیمی، تاریخاً یہ ہر ملک میں تشدد اور تاخت و تاراج یعنی جنگ اور فتح کے دیوی دیوتا کے باہمی ازدواج کا نتیجہ ہے۔ جنہیں قوموں کے دینی تخیل نے کامیابی سے پیدا کیا۔ ابتدا سے ریاست یہی تھی اور اب بھی یہی ہے یعنی وحشیانہ قوت اور فاتحانہ عدم مساوات کا مذہبی جواز۔

ریاست اختیار ہے، جبر ہے، جبر کی نمایش اور جبر کا فریب، یہ تالیف قلوب نہیں کرتی یہ کسی کو اپنا ہم خیال بنانا نہیں چاہتی۔ یہ اچھی بات کا حکم بھی دیتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی اور اسے خراب کرتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اسکا حکم دیتی ہے اور ہر حکم حریت کی جائز بغاوتوں کو اکساتا اور تحریک دیتا ہے۔ اور اسوجہ سے کہ خیر بھی جہاں اسکا

[۱] نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۵)

حکم دیا گیا ہے تبدیل ہو جاتی ہے، حقیقی اخلاق، انسانی اخلاق (یقینی الہی اخلاق نہیں) کے نقطہ نظر سے انسانی عزت اور حریت کے نقطہ نظر سے حریت، اخلاق، اور آدمی کی انسانی شان بس اسی میں ہے کہ وہ خیر پر کاربند ہو اس وجہ سے نہیں کہ اسکا حکم دیا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود اسے خیر جانتا ہے، اس کی آرزو رکھتا اور اس سے محبت کرتا ہے

ہمیں باکونین کی تصانیف میں اس جماعت کی کوئی صاف تصویر نہیں ملتی جو اس کا مطمح نظر تھی اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت کہ ایسی جماعت پائدار بھی ہو سکتی ہے۔ ہم اگر نراج کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں اس کے متبعین کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً کروپاٹکن کی طرف جو خود اس کی طرح یورپ کے قید خانوں سے آشنا روسی امیر تھا اور اسکی طرح ایک نراجی جو باوجود اپنی بین الاقوامیت کے جرمنوں سے نہایت شدید نفرت رکھتا تھا۔

کروپاٹکن نے اپنی تحریر کا بڑا حصہ پیدائش دولت کے صنعتی مسائل پر صرف کیا ہے۔ "کھیت اور چھوٹے بڑے کارخانے" اور "روٹی کی فتح" میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر پیدائش دولت زیادہ حکمی اصول پر ہو اور بہتر منظم تو تھوڑا سا خوشگوار کام آبادی کو آرام سے قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں، اور غالباً ہمیں تسلیم کرنا چاہئے، کہ اس نے ہمارے موجودہ علوم حکمیہ کے امکانات میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بیان میں بہت کچھ سچائی ہے۔ اور پیدائش دولت کے مضمون پر توجہ کر کے اس نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اصلی سوال کیا ہے۔ اگر تہذیب و ترقی مساوات کے ہمرکاب ہوں تو اس مساوات کے معنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ ضروریات زندگی سے تھوڑا سا زیادہ حاصل کرنے کے لئے تکلیف دہ مشقت کی

(نوٹ صفحہ ۱۷۸) یہ نام باکونین کا دیا ہوا نہیں بلکہ کافیرو اور ایلزی ریکلس کی اختراع ہے۔ جنہوں نے اسے شائع کیا۔ انہیں یہ نہ معلوم تھا کہ یہ "سلطنت" کی نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعت کا ایک ناتمام جزو تھا

طویل ساعات برداشت کرنی پڑیں، کیونکہ جہاں فرصت و آرام نہیں وہاں علوم و فنون مردہ ہو جائیں گے اور ساری ترقی ناممکن ہو جائے گی۔ بعض لوگوں کو اشتراک اور نراج کے خلاف اس بنیاد پر جو اعتراض ہے وہ محنت کی امکانی پیداآوری کا لحاظ کر کے باقی نہیں رہتا۔

کرو پاٹکن کی نظر میں جو نظام ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ آجکل کے مروجہ طریقہائے پیدایش دولت میں بہت بڑی ترقی کا طالب ہے۔ یہ مزدوری کے نظام کو مطلقاً مٹا دینا چاہتا ہے اور یہ بھی اکثر اشتراکیوں کی طرح اس معنی میں نہیں کہ ایک شخص کام کرنیکی آمادگی کے لئے اجرت دینی چاہیے نہ کہ واقعی اس کام کے لئے جو اس سے مطلوب ہو، بلکہ اس سے زیادہ اصولی اور گہرے معنی میں۔ یعنی کام کرنے پر کوئی مجبور نہ ہو، اور ساری اشیا کل آبادی میں مساوی تقسیم ہوں۔ کرو پاٹکن کو بھروسہ اس پر ہے کہ محنت کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ جو جمعیت اس کے پیش نظر ہے اس میں عملاً ہر شخص کاہلی پر کام کو ترجیح دیگا۔ کیونکہ کام کے معنی ضرورت سے زیادہ مشقت اور غلامی نہ ہونگے، نہ اس میں اب وہ انتہائی تخصیص کار ہوگی جو موجودہ نظام صنعتی کا نتیجہ ہے، بلکہ دن کے چند گھنٹوں کے لئے ایک خوشگوار مشغلہ ہوگا جس میں آدمی کو اپنے فطری محرکات تخلیقی کے اظہار کے مواقع ملیں گے۔ کوئی جبر نہ ہوگا، نہ کوئی قانون حکومت جو جبر کا استعمال کرے، اعمال جمعیت اب بھی باقی رہیں گے لیکن یہ سب کی رضامندی کا نتیجہ ہونگے، اور چھوٹی سے چھوٹی اقلیت بھی بہ جبر نہ دبائی جائے گی۔ ہم ایک اگلے باب میں یہ تحقیق کریں گے کہ یہ نصب العین کہاں تک قابل حصول ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ کرو پاٹکن نے اسے نہایت خوبی کے ساتھ اسے پیش کیا ہے کہ آدمی قائل ہو جائے۔

یہ نراج کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ بیجا طرفداری ہو گی اگر ہم اس کے تاریک پہلو کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ یعنی وہ پہلو جس سے اسے پولیس سے ٹکرایا اور معمولی شہریوں کے

لئے اسے ایک ہیبت خیز لفظ بنا دیا۔ اس کے عام مسلک میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تشدد کے طریقوں کو یا امیروں کی شدید نفرت کو کوئی لازمی تعلق ہو اور اس عام مسلک کے اکثر ماننے والے ذاتی طور پر نرم دل اور طبعاً تشدد سے بیزار ہوتے ہیں۔ لیکن نراجی جمعیت اور اخبارات کا عام لہجہ اس درجہ تلخ ہے کہ اسے بمشکل عاقلانہ کہہ سکتے ہیں اور خصوصاً لاطینی ممالک میں معلوم ہوتا ہے کہ خوش نصیبوں کے خلاف کینہ کو اکسایا جاتا ہے نہ کہ بدنصیبوں کے ساتھ رحم کو۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے اس کا بالکل قابل اعتماد تو نہیں مگر واضح اور دلچسپ بیان فیلس ڈیوبو کی کتاب "نراجی خطرہ" میں ملتا ہے جہاں ضمناً نراجی رسائل سے بعض کارٹون بھی نقل کئے گئے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں محبت انسانیت کا حقیقی جذبہ قابو میں رکھے اور دل میں قانون کے خلاف بغاوت کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام معمولاً قبول کئے ہوئے اخلاقی قاعدے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور انتقامی بیرحمی کی وہ تلخ روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے کوئی خیر بمشکل پیدا ہو سکتی ہے۔

عام نراج کی سب سے عجیب خصوصیت اس کی شہید پرستی ہے جو مسیحی شکلوں کی نقل کرتی اور جس میں (مثلاً فرانس میں) صلیب کے بجائے پھانسی ہوتی ہے۔ ارباب اختیار کے ہاتھوں جن لوگوں نے تشدد کی وجہ سے موت کا منہ دیکھا ان میں سے بہت سے بلاشبہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے سچے دل سے ایک مقصد میں اپنے عقیدہ کی خاطر تکلیف اٹھائی لیکن دوسرے ایسے بھی ہیں کہ جن کی عزت اتنی ہی کیجاتی ہے، لیکن انکا معاملہ مشتبہ ہے اس دبے ہوئے مذہبی ہیجان کی نکاسی کی سب سے عجیب مثال راواسول کی پوجا ہے جسے مختلف ڈینامائٹ کے جرموں کی بنا پر ۱۸۹۲ء میں پھانسی دیگئی تھی۔ اسکا ماضی مشتبہ تھا لیکن اس نے جان دی بہادری سے اور اس کے آخری الفاظ ایک مشہور نراجی گیت Chant du Pere Duchesne (یا دادو شین کا گیت) کے تین مصرعے تھے۔

قدرتی بات تھی کہ سر آوردہ نراجیوں نے اس کی یاد کی تقدیس میں حصہ نہ لیا، لیکن

پھر بھی یہ رسم حیرت انگیز بے اعتدالیوں کے ساتھ بڑھی۔

مسلک نراج یا اس کے سربرآوردہ حاملین کے خیالات پر ایسے مظاہر کو دیکھکر حکم لگانا بالکل بےانصافی ہے، لیکن یہ امر واقعہ اپنی جگہہ باقی ہے کہ نراج اپنی طرف بہت سے ایسے مواد کو کھینچتا ہے جو جنون اور جرم کی سرحد پر ہے[1]۔ اس واقعہ کا یاد رکھنا ارباب اختیار اور غور نہ کرنے والے عوام کی صفائی کے لئے ضروری ہے کہ یہ اس تحریک کے نکھٹوؤں کو اور ان سچے بہادر اور عالی خیال لوگوں کو یکساں نفرت میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جنہوں نے اس کے نظرئے ترتیب دئے اور انکی اشاعت و تبلیغ کی خاطر اپنا آرام اور اپنی کامیابی قربان کر دی۔

یہ تشدد کی تحریک جس میں راواشول جیسے لوگ کام کر رہے تھے عملاً ۱۸۹۴ء میں ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بہتر قسم کے نراجیوں نے ٹالسٹائی کے زیر اثر ایک کم نقصان دہ راہ

---

(۱) تمام بہتر قسم کے نراجیوں کا رویہ وہ ہے جو ل۔ س۔ بیونگٹن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔ "بیشک ہمیں علم ہے کہ اپنے کو نراجی کہنے والوں میں غیر متوازن جوشیلے دیوانوں کی ایک چھوٹی سی تعداد ہے جو ہر غیر قانونی اور سنسنی خیز تشدد کے فعل کو بڑی مسرت اور تحسین کے قابل تصور کرتے ہیں یہ لوگ جو پولیس اور اخبارات کے لئے نہایت کارآمد کاذہن کے ڈانواں ڈول اصول اخلاق میں کمزور ہوتے ہیں بارہا ثابت کر چکے ہیں کہ وہ مالی (رشوت) اثرات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ انکا تشدد اور انکا نراج خریدے جا سکتے ہیں، اور آخر کار اس بے دردی کی جنگ میں جو بورژوا طبقہ قوم کے آزادی خواہوں کے خلاف کر رہا ہے یہ اس کے نہایت کارآمد ساتھی بن جاتے ہیں اور انکی بڑی آؤبھگت ہوتی ہے" انکا نتیجہ نہایت عاقلانہ ہے:" بلا امتیاز قتل و غارت کے کام کو ہم حکومت کے لئے چھوڑ دیں۔ اس کے مدبروں کے لئے، اس کے دلالوں کے لئے، اس کے عہدیداروں اور اس کے قانون کے لئے"۔ (نراج اور تشدد صفحہ ۱۰-۹)

نکالی کہ اتحادہائے صنعتی اور "مبادلات محنت" میں انقلابی سنڈکلیت کی حمایت کریں۔

نراجی اشتراکیوں نے جماعت کی معاشی تنظیم کا جو تصور قایم کیا ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں جو اشتراکی چاہتے ہیں، اشتراکیوں سے انکا اختلاف حکومت کے معاملے میں ہے۔ انکا مطالبہ ہے کہ حکومت کے لئے سب محکوموں کی رضامندی کی ضرورت ہے نہ کہ صرف ایک اکثریت کی۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثریت کی حکومت آزادی کے تقریباً اتنی ہی منافی ہو سکتی ہے جتنی کہ اقلیت کی حکومت اکثریت کے حق الہی کا بے قیل و قال عقیدہ اپنے اندر بس اتنی ہی سچائی رکھتا ہے جتنا کہ کوئی اور ایسا عقیدہ۔ ایک مضبوط جمہوری ریاست آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر ظلم شروع کر سکتی ہے یعنی انپر جن کی دماغی بے تعلقی انہیں ترقی کی ایک قوت بناتی ہے۔ جمہوری پارلیمنٹی حکومت کے تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ پہلے کے اشتراکیوں نے اس سے جو توقع قائم کرلی تھی یہ بہت کم پوری ہوئی چنانچہ اس کے خلاف نراجی بغاوت کچھ تعجب خیز نہیں۔ لیکن خالص نراج کی شکل میں یہ بغاوت کمزور اور ہنگامی رہی ہے۔ یہ دراصل سنڈکلیت ہے اور وہ دوسری تحریکیں جو اس سے پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے پارلیمنٹی حکومت اور مزدوروں کی رہائی کے لئے خالص سیاسی ذرائع کے خلاف بغاوت کو عوام میں پھیلایا۔ لیکن اس تحریک سے ایک علٰحدہ باب میں بحث کرنی چاہیئے۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(۳)

سلطان محمود غزنوی | قبل اس کے کہ محمود غزنوی کی علمی سرپرستیوں کا ذکر چھیڑا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے

غزنوی خاندان کے سلسلہ کی کڑی بھی دراصل سامانی خاندان سے ملتی ہے اس لئے کہ عبدالملک نوح سامانی کے عہد میں ایک شخص نصر حاجی تاجر نے سبکتگیں کو خرید لیا اور بخارا لیجا کر امیر البتگین امیر حاجب کے ہاتھ فروخت کر دیا اسی سبکتگین نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی اور اس قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ آخر کار غزنین کا تخت حاصل کر لیا نہ صرف یہ بلکہ غور و طخارستان وغیرہ بھی مفتوحہ ممالک میں داخل کر لئے۔ ہندوستان پر بھی دو تین نہایت سخت حملے کئے۔ غرضکہ ایک ادنیٰ سے غلام نے محض اپنے بل بوتہ پر ایسی حیرت انگیز ترقی کر لی اور وہی ذلیل ہستی جو ادھر اُدھر بکتی پھرتی تھی بڑے بڑے رؤسا امرا سلاطین کی گردنیں اس کے سامنے خم ہونے لگیں

محمود[1] غزنوی ۳۶۱ھ میں پیدا ہو ۳۸۷ھ میں باپ کے انتقال پر بادشاہی تخت

---

(۱) نام و نسب محمود بن سبکتگین، سلطنت غزنین کا دوسرا بادشاہ - دادا کا نام قرابحکم اصل نام جوق ترکی میں بحکم بمعنی شور و غوغا اور قرا سیاہ کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس کے رعب و ہیبت کی وجہ سے پڑ گیا سلسلۂ نسب یہ ہے محمود بن سبکتگیں بن جوق قرابحکم بن قرا ارسلان بن قرابات بن قرالقمان بن فیروز بن یزدجرد

پر بیٹھا۔ خلیفۂ وقت قادر باللہ نے یمین الدولہ امین الملۃ محب امیر المومنین کا خطاب عطا فرمایا۔ محمود کے حوصلے اور ارادے اپنے باپ سے بھی بلند تر تھے، زمانہ مابعد اسلام میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، تھوڑے سے عرصے میں اس نے اس قدر طاقت و اقتدار حاصل کر لیا کہ خود دربار خلافت میں اس کے نام سے ہیبت طاری ہو جاتی تھی، اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر سال جہاد کریگا چنانچہ ہندوستان پر اس نے کم و بیش سترہ حملے کئے۔ خود تمام ایران اور وسط ایشیا اُس کے زیر نگیں تھا۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے تقریباً شرقی علاقے تک اُس کے حملوں سے محفوظ نہ رہے چنانچہ بنارس بھی اس کے مفتوحہ علاقے میں شامل تھا۔

محمود کے جہاد کی حقیقت پر بہت کچھ بحث کی گئی ہے عام طور پر یہ خیال ہو کہ محض مذہبی جوش اور اشاعت حق کا خیال ان حملوں کا موجب تھا۔ ایک جدید خیال یہ ہو کہ محمود کے ان حملوں کو ہرگز کوئی مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ جہاد کے پردے میں ہندوستان کی بے اندازہ دولت کی طمع تھی جو اسے بار بار حملے کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان میں اگر اُس نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس سے اشاعت دین و مذہب کا ثبوت ملتا ہو، نہ اُسکا رویہ کچھ ایسی جاذبیت رکھتا تھا جو ہندوؤں کو قبول اسلام کی جانب مائل کرتا برخلاف اس کے وہ ہر بار ہندوستان سے بیشمار مال و دولت گھسیٹ کر لیجاتا اور بجائے اس کے کہ اس روپیہ کو مذہبی کاموں میں خرچ کرتا یا ہندوستانیوں کے فائدے کے لئے خود ہندوستان پر خرچ کرتا۔ اس نے اس بے شمار دولت سے ایران کی ترقی و تعمیر کا کام لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے ہندوستان کی بعض مشہور عبادتگاہوں کو تباہ کیا جو مرکزی حیثیت رکھتی تھیں لیکن اس میں کسی مذہبی جذبہ کو دخل بہت کم تھا اُس زمانہ میں مذہبی عبادتگاہیں زر و جواہر سے پر ہوتی تھیں سومناتھ کے مندر کی بربادی اس لئے نہیں ہوئی کہ محمود کا جذبہ ایمان اُسے اس بربادی پر مجبور کر رہا تھا بلکہ اس کو منہدم کر کے اس نے لاکھوں اور کروڑوں

روپیہ کی دولت حاصل کی۔

بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ وہ غلام در غلام تھا اس لئے اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے اُس نے جہاد کی پالیسی اختیار کی تاکہ اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے اوصاف اس کی بدنسلی کے عیوب پر پردہ ڈالدیں، اور لوگوں کی نظریں اُس کی ذات پر پڑنے کی بجائے اُس کے افعال پر پڑیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کی ان فتوحات کا موجب در اصل ایران کی تمدنی نشوونما کا تخیل تھا وہ خود ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا، ایران کی ترقی اور نشوونما کے لئے جس قدر کامیاب جدوجہد اُسکے زمانے میں ہوئی اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی، فردوسی کا "شاہنامہ" جو فارسی دنیا کی ادبیات میں ایک عظیم الشان اور عدیم النظیر کارنامہ ہے اُسی کے زمانہ میں اور اُسی کے حکم سے تصنیف ہوا علاوہ اس کے ایرانی شاعروں کی اس نے حیرت انگیز طریقہ پر حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے فارسی شاعری انتہائے عروج پر پہنچ گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود نے اپنی طاقت کے بل پر تمام ایران اور وسط ایشیا کو زیر اثر اور زیر نگیں کر لیا تھا، ہندوستان پر اس کے بعض حملے نہایت کامیاب ہوئے، اُس نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بڑی بڑی بہادر قوموں کو نیچا دکھایا بلکہ بے اندازہ مال و دولت بھی حاصل کی لیکن باوجود اس کے ہمیں اس کو ایک کامیاب فرماں روا تسلیم کرنے میں تامل سے کام لینا چاہئیے یہ سچ ہے کہ اس نے ہندوستان کی بڑی بڑی قوتوں کو شکست دی بڑے بڑے، اہم معرکوں میں کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا ہندوستان کی مرکزی عبادتگاہوں کو مسمار کیا، لیکن انتظامی صلاحیت کے فقدان کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ باوجود اس قدر زبردست اور پیہم فتوحات کے ہندوستان پر کبھی مستقل قبضہ نہ کر سکا۔ درحقیقت ہندوستان میں اس کی فتوحات

ایک سیلاب تھا کہ آیا اور بہت سے قلعوں کو مسمار بہت سی عمارتوں کو منہدم اور بہت
سے شہروں کو تباہ و برباد کرکے گذر گیا ۔ خود ایران اور غزنین میں اُس کی حکومت مستقل
بنیادوں پر قایم نہ تھی ایران کی چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتوں کے استیصال میں اُسے
پورے طور پر کامیابی نہیں ہوئی تھی یہ محض محمود کی ہیبت تھی کہ اُس کے زمانے میں ایران
میں ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے سر نہیں اٹھایا ۔

اسکے مرنیکے بعد اُسکے جانشینوں نے اور بھی نا قابلیت کا ثبوت دیا سعود نے بیشک کچھ عرصہ تک کامیابی
سے حکومت کی لیکن احمد بن حسن میمندی کے بل بوتے پر کیونکہ احمد بن حسن میمندی اسکا وزیر تھا اور تمام انتظامی امور انکے ہاتھ
میں تھے حکومت کا کام بھی ایک ڈھرے پر چلتا رہا اور اسکے مرنیکے بعد حکومت میں بھی ایک ابتری پیدا
ہو گئی خود محمود کا دربار جنرلوں اور مدبروں سے خالی تھا اور اگر بہتات تھی تو وہ علماء اور شعرا کی حسن میمندی
بیشک ایک اچھا عالم اور مدبر تھا (اگرچہ اسکو بھی نظام الملک طوسی اور تاریخ کے دوسرے مشہور سیاسی مدبروں
کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا) لیکن اُسے بھی کسی بات سے ناراض ہو کر ہندوستان کے جیلخانوں میں ڈلوا دیا ۔
جنگی معرکوں میں محمود کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایک اچھا دلیر اور بہادر سپاہی تھا ۔ معرکہ کارزار میں وہ ہمیشہ
پیش پیش رہتا اُس کے سپاہیوں میں اس قدر غلط مذہبی جوش بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنی
جان ہتیلی پر لئے پھرتے تھے ان میں شجاعت تھی مگر تھوڑے سے لبریز ، یہی وجہ تھی کہ مخالفین کے دلوں
میں محمود اور اس کی فوج کا خوف اور ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جہاں پہنچتا تھا فتح و نصرت
اُس کے قدم چومتی تھی ۔ تاہم یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اپنے عہد حکومت کے طویل
عرصہ میں وہ ایک جنرل بھی پیدا نہ کرسکا ۔

محمود کی جنگی و انتظامی قابلیتوں پر تنقید و تبصرہ ایک طویل بحث کا محتاج ہے
جس کو ہم کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں ۔ لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ محمود کو
ایک کامیاب حکمراں یا کامیاب جنرل کی حیثیت کسی طرح نہیں دیجاسکتی بے شک وہ ایک
اچھا سپاہی تھا اور اسی سپاہیانہ سرگرمی اور جوش عمل نے اس کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا ۔ لیکن

جنگی اور انتظامی نقائص اور خامیوں کے ساتھ ساتھ اُس میں چند لایق رشک خوبیاں بھی تھیں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا اس نے ایرانی ادبیات اور ایرانی شعرا اور علما کی جیسی سرپرستی کی ہے ایران کے کسی دوسرے حکمراں کو اس کے مقابلے میں بمشکل لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محمود کو جس زمانہ میں عروج ہوا وہ عربی اثرات کے خلاف ردعمل اور ایرانیت کے نشو و نما کا زمانہ تھا ایرانیوں میں رفتہ رفتہ زندگی و بیداری کا احساس پیدا ہو رہا تھا وہ عربوں کی غلامی کے جوے کو اتار پھینکنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے دولت عباسیہ کے ضعف و انحطاط نے انہیں اور بھی اس کا موقع دیدیا تھا ایران میں آئے دن نئی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں ایران کے وہی امرا جو پہلے دربار خلافت کے حلقہ بگوش تھے اب خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے تھے وہ نہ صرف ظاہری غلامی سے بیزار تھے بلکہ ذہنی غلامی سے بھی آزادی کی کوشش کر رہے تھے۔ عربوں کی شاگردی کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے حالانکہ یہ انکی کھلی ہوئی ناسپاسی اور ناشکرگذاری تھی عربوں نے انہیں وحشت و جہالت کی تاریکیوں سے نکالا انہیں ایک شائستہ اور متمدن قوم بنایا وہ صدیوں سے نکبت و ادبار کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے تھے اور گویا اُن پر سکرات کا عالم طاری تھا عربوں نے ایسے وقت میں اُنکی مسیحائی کی اور انہیں ایک زندہ قوم بنا دیا۔ علوم و فنون اور ادب غرضکہ سب کچھ انہوں نے عربوں سے حاصل کیا۔ حتیٰ کہ اُنکی شاعری پر عربوں کے زبردست احسانات ہیں فارسی شاعری میں عربی شاعری کی حرف بحرف تقلید کی گئی بلکہ شروع شروع میں تو ایرانی شاعر عربی شاعری کے مضامین کا کھلا ہوا سرقہ کرتے تھے شعرالعجم میں آپ کو اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ غرضکہ باوجود اس قدر زبردست احسانات کے جب ایرانیوں کے قومی احساسات بیدار ہوئے تو انہیں عربوں سے انتہائی نفرت ہو گئی اور قومیت کے جذبے نے آخر کار تعصب کی شکل اختیار کر لی فردوسی نے "شاہنامہ" میں ایک سے زائد موقعوں پر اپنی اس نفرت کا اظہار کیا ہے چنانچہ ایک موقعہ پر وہ کہتا ہے۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاج کیاں را کند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

"شاہنامہ" کی تصنیف کا خیال صرف اسی غرض سے نہ تھا کہ اسلاف کے کارناموں کو زندہ کیا جائے بلکہ ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ رستم و سہراب فریدوں اور کیخسرو کو عربی ابطال کے مقابلے میں پیش کیا جائے اور ان کو ترجیح دیجائے۔ انکے دلوں میں رستم و سہراب کی جو عزت و وقعت تھی وہ خالد بن ولید اور سعد بن وقاص کی ہرگز نہ تھی وہ اپنے کلام میں دلیری و بہادری کی تشبیہہ خالد سے یا جود و سخا کی حاتم سے دینا باعث ننگ و عار سمجھتے تھے غرضکہ اس وقت ایرانی قومیت کی نشو و نما کی رفتار بہت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی۔ محمود نے بھی اس میں بیش از بیش حصہ لیا اُس کی جنگی فتوحات بھی اسی ملکی نشو و نما کے زیر اثر تھیں، ہندوستان میں سال بہ سال حملے کا مقصد اسلام کی ترویج و اشاعت تو بہرحال ہرگز نہ تھا بلکہ اغلباً اس مذہبی جہاد کے پردہ میں اصلی غرض یہ تھی کہ ایرانیت کی توسیع اور ایرانی تہذیب و تمدن کی اشاعت ہو۔

وہ خود بھی اچھا خاصہ عالم اور شاعر تھا مذہبی علوم میں بھی خاصی دسترس تھی مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

"محمود جس طرح فاتح اور کشورستاں تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا "جواہر مضیئہ" جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے"(۱)

اس کی شاعری کے متعلق ایک ایرانی تذکرہ نویس لکھتا ہے :

شاعری کا نہ صرف ذوق تھا بلکہ خود شاعر تھا ایک کنیزک سے اُسے خاص محبت تھی

---

(۱) شعرالعجم جلد اول

اس کے انتقال کی جب اُسے یک بیک خبر پہنچائی گئی تو اسے دلی اذیت ہوئی اور
اس کے مرثیہ میں یہ اشعار کہے

نا تو اے ماہ زیر خاک شدی — خاک بر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم اے دل صبر — این قضا از خدائے عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد — ہرکہ زو زاد باز اصل آمد

"جب سلطان کا بالکل آخری وقت آن لگا اور اُسے اپنی موت کا یقین ہوگیا تو
اس وقت اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں خود اپنی نوحہ گری کی ،،

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے — جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستیم شاد — گہے ز حرص ہمی رفتے زجائے بجائے
بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم — کنون برابر بینم ہمی امیر و گدائے
اگر دو کلۂ بوسیدہ در کشی زد و گور — بسر امیر کہ داند ز کلہ گرائے
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست — بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد — بقا بقائے خدا یست و ملک ملک خدائے[1]

علم و ادب کی سرپرستی میں اُس نے جنگی فتوحات سے کم انہماک سے کام نہیں لیا
شہر غزنین کو تھوڑی مدت میں علم و فن کا شاندار مرکز بنا دیا۔ شہر میں ایک عظیم الشان جامعہ یا
کالج قائم کیا۔ اس جامعہ کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کی نادر چیزیں
فراہم کی گئی تھیں۔ خود اس کے دربار میں وقت کے بہترین شاعر اور عالم و فاضل موجود
تھے، علما اور شعرا کی سچے دل سے قدردانی کرتا تھا اور اُنکا یہانتک احترام کرتا تھا کہ بعض
اوقات ابوالخیر الحسن بن سوار البابا المعروف با بن الخمار کے سامنے زمیں بوس ہوجاتا تھا۔[1]

---

(۱) البیرونی

ایک ایرانی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

"تمام جنگی مشاغل کے باوجود علماء کی تربیت سے غافل نہیں تھا انکی حوصلہ افزائی میں کبھی دریغ نہ کرتا، اُسے علماء کی صحبت کی سچی خواہش تھی اُن پر گرانقدر صلوں اور انعامات کی بارش کرتا اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے مقدور بھر اُس کے نام اور اس کے کارناموں کو غیر فانی بنادیا عبد الجبار عتبی نے تاریخ یمینی کے نام سے اس کی ایک تاریخ لکھی ہے غرضکہ اس کی علم دوستی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اہل علم سے فیض صحبت حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن جد وجہد سے کام لیتا تھا یہاں تک کہ جنگ و جدال پر بھی آمادہ ہو جاتا تھا۔ خوارزم شاہیوں سے اس نے محض اس وجہ سے جنگ کی کہ بوعلی سینا اور البیرونی کو حاصل کرے چنانچہ خوارزم فتح کرکے البیرونی کو وہ اپنے دربار میں لے آیا۔

سب سے زیادہ توجہ اُس نے شاعری پر کی اُس کا ایک علحدہ اور مستقل محکمہ قائم کیا اس محکمہ کا افسر ملک الشعرا عنصری کو بنایا گیا دربار کے دوسرے شعرا کو حکم تھا کہ اپنے اشعار عنصری کو دکھا کر پھر دربار میں پیش کریں، شاعروں کے کلام کو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتا ایک ایک قصیدہ بلکہ ایک ایک شعر پر بیش قرار انعامات دیتا، ایک مرتبہ شہزادہ مسعود کی خراسان سے غزنین میں آمد پر دربار عام منعقد ہوا، شعرا نے اپنے اپنے قصائد پیش کئے۔ اس موقع پر ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور عنصری اور زینتی کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا ہوے، عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ منہ جواہرات سے بھر دیا جاے، غضاری کو صرف دو شعروں پر دو توڑے ملے وہ خود کہتا ہے۔

مراد و بیت مود شہریار جہاں   بر آں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال

دو بدرہ بفرستاد دو ہزار درہم   برغم حاسد و تیار بد سگال نکال

محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ چار سو زریں کمر غلام

اس کی رکاب میں چلتے سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان چار سو اونٹوں پر بار ہوتا ، شعرا اس کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے تھے محمود کا لقب نام بھی اسی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے نظامی عروضی کہتے ہیں :۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد   کہ از رفعت ہمی با مہ ندا کرد

نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے   مدیح عنصری ماندا ست برجائے

غزنی کی دولت وجاہ کی یہ نوبت پہنچی تھی کہ بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے عنصری جب تک وطن میں رہا اس کے ہر قصیدہ پر بیس ہزار اشرفی مقرر تھی فردوسی کو جب شاہنامہ نظم کرنیکی خدمت تفویض ہوئی تو ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی کا صلہ مقرر ہوا محمود کی اس علم پرستی اور قدر افزائی کو دیکھکر تمام شعرا اس کی طرف جھک پڑے حتی کہ اس کے دربار کے شعرا کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی ۔ علاوہ شعرا کے دربار میں   ہر مذہب و ملت کے اہل کمال موجود تھے ۔

محمود غزنوی پر الزامات | محمود غزنوی کے خلاف دو ایک نہایت سنگین الزامات بھی لگائے گئے ہیں جن میں سب سے اہم فردوسی کو موعودہ[1] صلہ نہ دینے کا واقعہ ہے اس واقعہ کی تفصیل میں ارباب تذکرہ نویسوں کا اس قدر اختلاف ہے کہ ہمیں اصل واقعہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے ، اگر واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ہمارے خیال میں محمود کا اتنا قصور نہیں جتنا ظاہر کیا جاتا ہے ، بلکہ واقعات سے جہاں تک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اہل دربار کی دراندازیوں کو اس میں زیادہ دخل ہے ورنہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا فراخ حوصلہ فرمانروا جس کی علمی قدر دانیاں اور فیاضیاں عدیم النظیر ہیں وہ بلا وجہ اس طرح اپنے وعدے سے پھر جائے اور بجائے "سونیکے پھلوں" کے "چاندی کے پھول" پیش کرے لیکن اگر بفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ روپیہ کا لالچ اس کی علمی قدر دانی پر غالب آگیا تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ علمی قدر دانی کا جذبہ اس عارضی جذبہ سے دب نہ سکا اور آخر کار اس نے موعودہ رقم

---

[1] تفصیلی نوٹ آئندہ نمبر میں ۔

دوبارہ بھجوائی گو وہ فردوسی تک نہ پہنچی

محمود غزنوی پر دوسرا الزام یہ ہے کہ اُس نے البیرونی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ایک دفعہ اُسے غزنین کے قلعہ میں چھ ماہ کے لئے قید کر دیا[1]۔ اور پھر ہندوستان میں

---

(۱) محمود کی بدسلوکی کی ایک واقعہ چہار مقالہ میں درج ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

یمین الدولہ سلطان محمود بشہر غزنین بر بالائے کوشکے در چہار دری نشستہ بود بباغ ہزار درخت روے با بوریحاں کرد و گفت من ازیں چہار در از کدام در بیروں خواہم رفت، حکم کن و اختیار آں بر پارۂ نویس و در زیر نہالی من نہ و ایں ہر چہار در راہ گذر داشت، ابوریحاں اصطرلاب خواست وازتقام بگرفت وطالعے درست کرد وساعتے اندیشہ نمود و بر پارۂ کاغذ بنوشت و در زیر نہالے نہاد، محمود گفت حکم کردی؟ گفت کردم، محمود بفرمود تا کنندہ دستہ و بیل آوردند بر دیوارے کہ بجانب مشرق است درے بکندند وازاں در بروں رفت وگفت آں کاغذ پارہ بیاوردند بوریحاں بروے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیروں نشود و بر دیوار شرق درے بکنند وازاں در بیروں شود محمود چوں بخواند طیرہ گشت، گفت اورا بمیان سرائے فرو اندازند چناں کردند مگر بابام میانگین دامے بستہ بود بوریحاں بر آں دام آمد و دام بدرید و آہستہ بزمین فرود آمد چنانکہ بروے افگار نشد محمود گفت اورا برآرید، برآوردند، گفت یا بوریحاں ازیں حال بارے ندانستہ بودی؟ گفت اے خداوند دانستہ بودم، گفت دلیل کو؟ غلام را آواز داد و تقویم از وبستد، و تحویل خویش از میان تقویم بیروں کرد در احکام آں روز نوشتہ بود کہ ازجائے بلند بیندازند ولیکن بسلامت بزمیں آیم و تندرست برخیزم، ایں سخن نیز موافق رائے محمود نیامد طیرہ ترگشت، گفت کہ اورا بقلعہ برید و باز دارید او را بقلعۂ غزنین باز داشتند و شش ماہ در آں حبس ماند

چہار مقالہ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۵۰

جلا وطن کر دیا۔ غرضکہ البیرونی کے ساتھ اسکا رویہ کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں کہا جا سکتا لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ البیرونی کے ساتھ محمود نے جو کچھ رویہ اختیار کیا وہ خاص حالات کے ماتحت تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام مسعود تھا چھوٹے کا محمد۔ محمود کی خواہش تھی کہ محمد کو اپنا جانشین بنائے لیکن اس کے لئے خلیفہ کی تصدیق سب سے اہم اور ضروری چیز تھی تاکہ اگر بعد کو مسعود کی جانب سے ادعاے حکومت ہو تو محمد کو دربار خلافت سے ہر قسم کی تائید حاصل ہو۔ اس زمانے میں مذہب قراسطہ کا بہت زور شور تھا یہ چونکہ ایرانی دماغ کی پیداوار ہے اس لئے اسکا مرکز بھی قدرتی طور پر وہیں ہونا چاہئے تھا چنانچہ ایران کے بڑے بڑے علما پر قرمطی ہونیکا شبہ کیا جاتا تھا محمود کے پاس متعدد بار دربار خلافت سے احکام پہنچے کہ اس فتنہ کو دبایا جائے اور جن لوگوں کے متعلق شبہ ہو ان کو سزا دیجائے، محمود، کچھ تو خلافت کے احکام سے مجبور ہو کر اور کچھ خلیفہ کی خوشنودی اور تائید حاصل کرنے کے لئے اس قسم کی حرکات کر بیٹھتا تھا۔ البیرونی چونکہ فلسفی تھا اور اس وقت یہ چیزیں کٹر علما کی نظروں میں ایک شخص کو مشتبہ بنانے کے لئے کافی تھیں اس لئے البیرونی خاص طور سے محمود کی ان حرکات کا نشانہ بنا لیکن یہ عرض کرینگی ہم پھر جرأت کریں گے کہ محمود کا یہ طرز عمل اختیاری نہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ البیرونی محمود کے بعد اسی خاندان کے دامن دولت سے وابستہ رہا اور اپنی ساری عمر اسی حکومت کے زیر سایہ گزاری۔

مضمون بہت طویل ہوتا جاتا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ محمودی دبار کے شعرا اور علما کے مختصر حالات اور انکے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نگاہ ڈال لیں

فردوسی | ترتیب کے لحاظ سے مناسب تو یہ تھا کہ پہلے عنصری کے حالات لکھے جاتے اس لئے کہ عنصری محمود کے دربار کا ملک الشعرا ہے اور فردوسی کی رسائی محمود کے یہاں بہت بعد میں ہوئی ہے لیکن چونکہ فردوسی محمود کے دربار کا ہمارے نزدیک سب سے بڑا شاعر ہے اسلئے اس اہمیت کی وجہ سے ہم اس کے ذکر کو سب پر مقدم رکھتے ہیں۔

نام ونسب | حسن بن اسحاق بن شرف نام فردوسی تخلص طبرستان کے نواحی میں باژ یا شاداب نام ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گھر سے خوشحال تھا اس لئے اطمینان کے ساتھ علمی وادبی مشاغل میں منہمک رہتا تذکرہ نویسوں نے فردوسی کی جانب تمام شاعروں سے زیادہ توجہ کی ہے لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس قدر توجہ کے اُس کے حالات میں سخت اختلاف ہے مختلف فیہ روایات کی تفصیل اور ان پر جرح وتنقید کا یہ موقع نہیں بہر حال اتنا ثابت ہے کہ فردوسی نے محمود کے دربار میں آنے سے پیشتر شاہنامہ کی بنیاد ڈالدی تھی اور اس کا کچھ حصہ نظم بھی کرلیا تھا دوسری طرف محمود کو شاہنامہ نظم کرانیکی فکر تھی۔ چنانچہ یہ اہم خدمت اس نے دربار کے چند مشہور شعرا عنصری وغیرہ کے سپر کی تھی، لیکن بعد کو فردوسی کی رسائی دربار میں ہوگئی، اُس نے کچھ نظمیں لکھکر بطور نمونہ کے محمود کی خدمت میں پیش کیں محمود نے فردوسی کو اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں پایا۔ اور یہ خدمت اسی کو تفویض ہوئی۔

شاہی محل کے قریب ایک مکان بھی دیا گیا جو تمام ضروری ساز وسامان آلات جنگ اسلحہ حرب، شاہان عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کی تصاویر سے آراستہ تھا۔ فردوسی نے کئی سال کی مسلسل محنتوں کے بعد اس اہم کام کو انجام دیا۔

لیکن باوجود اس شدید محنت کے فردوسی کی حسب دلخواہ ہمت افزائی نہ ہوئی بلکہ جیسا کہ اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے محمود کی جانب سے وعدہ خلافی کی گئی اور بجائے ۶۰ ہزار سرخ دینار کے ۶۰ ہزار سفید درہم پیش کئے گئے، اس واقعہ کا ہم محمود کے بیان میں تذکرہ کرچکے ہیں اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق بھی ایسا ہی اختلاف ہے، علامہ شبلی نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ فردوسی کے وقت تک ایرانی تاریخ کا بہت کافی ذخیرہ عربی میں منتقل ہوگیا تھا ابن مقفع نے متعدد فارسی تاریخوں کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی زبان کے مصنفین نے ایران کی جو تاریخیں لکھیں انہیں ترجمہ شدہ کتابوں سے مدد لیکر لکھیں، دقیقی کے زمانے میں ایرانی تاریخ کا معتدبہ

سرمایہ فراہم ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانی خاندان کی فرمائش سے شاہنامہ لکھا۔ سامانیوں کا کتب خانہ اس وقت عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا بوعلی سینا نے جب یہ کتب خانہ دیکھا تو اس پر حیرت چھا گئی اور اعتراف کیا کہ ایسا عظیم الشان کتب خانہ اس سے پہلے اس کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ آئندہ امید ہے اس کتاب خانہ میں یقیناً دقیقی کے لئے بھی پورا مسالہ فراہم کیا گیا ہوگا۔ اور دقیقی نے اسی کو سامنے رکھکر شاہنامہ کی بنیاد ڈالی ہوگی۔ محمود غزنوی سامانیوں کو مٹاکر انکا جانشین بنا تھا اس لے اغلباً یہ تمام سامان اس کے قبضہ میں آیا ہوگا اور فردوسی کو بھی اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ ملا ہوگا لیکن خود فردوسی کو اس سے انکار ہے اس کا قومی غرور عرب کا اس قدر احسان اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا، چنانچہ فردوسی نے دعوے کیا ہے کہ قدیم زمانے کی ایک مبسوط تاریخ موجود تھی لیکن مرتب نہ تھی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے

(باقی)

ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۲)

ٹیگور اور ٹیگور کے شاگرد و خوشہ چیں

لیکن ہم کیا کریں، کہاں جائیں اور کس سے کہیں؟ پرانے اب بیحد پرانے ہوگئے اور نئے ہیں کہ بیحد نئے۔ ہماری ان تک اور انکی ہم تک رسائی دشوار۔ ہم کو چاہیے کہ ہم جو کچھ ہو چکا ہے اس کو دیکھیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھیں۔ اچھا، برا، سب لیکن کچھ کہیں تو جب کہیں کہ بن کہے نہ بنے، اور اپنے انداز سے اپنی آواز میں کہیں، ہم کو چاہیے کہ اس طرح چلنا سیکھیں جس طرح بچہ چلنا سیکھتا ہے۔ گریں پڑیں لیکن چلیں تو اپنے پاؤں چلیں۔ تعمیر؟ یہ ایک بڑا لفظ ہے اور بڑے الفاظ جس قدر کم استعمال ہوں اتنا ہی اچھا۔ یہ تو آنے والوں کا حق ہوگا کہ وہ ہمارے کئے ہوئے کو دیکھیں، اور پرکھیں کہ ہم نے کیا کیا ہے اور ہم اپنے اسلاف کے فنی ورثہ اور اپنے موجودہ ماحول سے کہاں تک مستفید ہوئے ہیں۔ آیا ہم نے ایک بے بساط اسکول کے لڑکے کی طرح محض کتاب یا ہمسائے کی کاپی سے نقل کر دیا ہے یا یہ کہ اسمیں کچھ ہماری جان اور ہماری روح کا بھی افشردہ ہے جو انکے لئے فخر کا باعث ہو سکے۔ آج دنیا تمام دوسری قوموں سے ہمارے لئے کہیں زیادہ فنی عروج کے امکانات سے پر ہے۔ بشرطیکہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اور ہم میں ایک شخص ایسا بھی موجود ہے جس نے ہم کو راستہ دکھلا دیا ہے۔

کم ہیں آج ایسے لوگ جو ابانندرا ناتھ ٹیگور کی فنی عظمت کی صحیح انتہا سے واقف ہوں۔ حال و ماضی کی دیوانی ہانڈی سے انہوں نے ایک ایسے طرز کی بنیاد ڈالی جو انوکھا اور

انکا اپنا ہے اور جس میں سراسر انکی شخصیت جلوہ گر ہے - انہوں نے اجنٹا جاکر پرانوں کی روٹیاں نہیں توڑی ہیں - منغص ہو جاتی ہے طبیعت آج کل کے فنی قلانچوں کو اجنٹا کی بے حجابانہ و بے ہنگام گداگری کرتے دیکھ کر - ٹیگور نے جو چین اور ہندوستان کے فنی کارناموں کے مصر اور مغل قلم کے دلدادہ تھے جب رجوع کیا تو اپنی طرف رجوع کیا، اپنے اندر کی طرف لوٹے، اپنا خون جگر دنیا کے سامنے پیش کیا، بنایا تو اپنا بنایا اور روح ڈالی تو اپنی روح ڈالی جب یہ سب کچھ ہو جائے تب تصویر تصویر کہلائے اور بنانے والا مصور۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ ٹیگور کے یہاں ہم کو اجنٹا کے آب و نمک اور مغل اسکول کی پرکاریوں کی جھلک، یا راجپوت اسکول کی روحی پابندیوں اور چین کی آزادہ روی کے پرتو نظر نہیں آتے یا انکے فن میں یوروپ کے طرز نو کی دیوانگی اظہار اور اس کے پرانوں کے وقار کے عنصر نہیں ملتے - ٹیگور کی آنکھوں نے سب کچھ دیکھا ہے اور ٹیگور کے ہاتھوں نے سب سے لیا ہے لیکن یہ سب کچھ لے دے کے وہ پھر اپنے اندر کی طرف لوٹے ہیں - بنایا ہی تو اپنے اندر سے بنایا ہے اور رنگ و نقش کے مجسموں میں جان ڈالی ہے تو اپنی جان ڈالی ہے - اور جو کامیابی ٹیگور کو اس طرز نو میں ہوئی ہے وہ دنیا کے سامنے موجود ہے - جس کو خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ دیکھے اور لطف اندوز ہو - ٹیگور آج دنیا میں اگر سب سے بڑا مصور نہیں تو بڑوں کا ایک بڑا ضرور ہے - اور ٹیگور نئوں[1] میں کا ایک نیا ہے جس طرح کہ فرانس کا مایہ ناز مصور رنوار[2]، جو چند سال ہوئے اسی برس سے کچھ اوپر ہو کر مرا نئوں کی صف میں شمار ہوتا تھا - ٹیگور کے مقابل انسان یوروپ کے نئوں میں سے اور کس کس

---

(۱) نئوں سے مراد ہے یوروپ کے فنی انقلاب کے بعد جو جدید روشیں قائم ہوئی ہیں انکے برتنے والے آرٹسٹ جن کو "ماڈرنز" کہتے ہیں۔ (۲) رنوار کے نام پر یورپ کی اصطلاحات میں "امپرشنسٹ" انگشت چپاں ہیں لیکن وہ فن کی ان بڑی ہستیوں میں ہے جو اسکولوں کی قیود سے بالاتر ہے - رنوار رنوار ہے اور بس -

کا نام لے۔ سیزان(۱)! فان گوخ(۲)! گوگان(۳)! ان بیچاروں کی روحیں طوفان خیز کشمکشوں کا جولانگاہ

---

(۱) سیزان ہی فرانس کا وہ آرٹسٹ ہے جس نے "اکسپرشنزم" یعنی "اظہاریت" کی بنیاد ڈالی اور اپنی تجدید فن کی راہ میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں۔

(۲) فان گوخ ہالینڈ کا وہ سریع الحس اور پر جذبات آرٹسٹ تھا جس کو "امپرشنزم" اور "اکسپرشنزم" کے درمیانی منازل کا راحل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کو شروع سے مصوری کیطرف ذرا رجحان نہ تھا چنانچہ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک پادری کی حیثیت سے مامور رہا۔ ۲۶-۲۷ برس کی عمر میں پہلے پہل نقاشی اور مصوری کی طرف یک بیک رخ بدلا اور انتہائی سرعت کیساتھ فن میں ترقی اور پختہ کاری حاصل کی۔ مصور گوگان سے انکی دوستی پہلے بہت بڑھی اور عرصے تک گو دونوں دور رہے لیکن ایک جان دو قالب کی سی صورت رہی۔ بعد میں جب کچھ دنوں ایک ساتھ رہے تو کچھ ایسی غلط فہمیاں آپس میں حائل ہوگئیں جو ان میں نزاع کا باعث اور طرفین میں محرک یاس ہوئیں۔ لیکن فان گوخ پر اس کا خاص طور سے نہایت گہرا اثر پڑا۔ چالیس کے لگ بھگ اس کے حواس مختل ہوگئے۔ اس کے کام کرنے کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ ایک تصویر کے خیال کو دن دن رات رات سودے کی طرح سر میں لئے پھرتا اور بے چین رہتا یہاں تک کہ یہ سودا رنگوں کی صورت میں سر سے پھوٹ نکلتا اور وہ درندانہ عجلت اور انہماک سے تصویر بنانے پر ٹوٹ پڑتا۔ ۔ ۔ پھر یہی سودا اتنا بڑھا کہ جنون ہوگیا اور جنون بھی اس زور کا کہ اس میں اس کے رنگوں کے زور کا اندازہ لگتا تھا اور اس میں اس کی کشمشوں اور غموں کی قوت دبیا کی نمایاں تھی۔ ایک دن عالم دیوانگی میں اپنا کان کاٹ کر پھینکدیا۔ بعد میں جب حواس آئے تو خود ہی بیٹھ کر اپنی تصویر بنائی اور اس کا نام رکھا "کان کٹا آدمی" پھر بعد میں ایک دن طمنچے سے پیٹ میں گولی مار لی۔ یوروپ والے آج اس دیوانے کو خدائے فن مانتے ہیں۔

(۳) گوگان کے ماں باپ فرانسیسی سے نہ تھے بلکہ ہسپانوی اور جنوبی امریکہ کے ایک شریف خاندان سے

تھیں اور انکی قسمت نہایت دردانگیز قسمت تھی۔ ان میں سے ایک پر اسکے فن کے انوکھے پن اور شاہراہ عام سے بعد تسلیم رکھنے کی بنا پر پیرس کے جاہل عوام نے پتھر تک برسائے۔ دوسرے نے کم عمری ہی میں پاگل ہو کر موت پائی۔ تیسرا انتہائی افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں وطن سے دور جزیرہ ہائے بحرالجنوب میں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوا، جس کی دیوانگی کی داد اس کے سیاہ رنگ "وحشی"، نوکرنے اس کی موت پر یوں بین کر کے دی کہ "اب دنیا میں انسان نہ رہا" یہ لوگ پیمبر تھے اور جو پیغام وہ لائے اس کے لئے انہوں نے اپنی جانیں دیں۔ وہ ہستیوں میں بڑی ہستی اور فن والوں میں بڑے فن والے تھے لیکن انکے فن کی نوعیت تہدیمی اور انکاری تھی۔ انکے سر انیسویں صدی کے فنی جمود سے منحرف تھے اور انکا خون انقلاب کی امنگوں سے مشتعل۔ انکو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایک

لیکن وہ پیدا پیرس میں ہوا (۱۸۴۸ء) اور فرانس ہی میں نشو و نما پائی۔ کم عمری میں ایک عرصہ تک جہازرانی کی تعلیم میں لگا رہا۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ کے بعد جہازرانی کا سلسلہ چھوڑ کر بنک کی ملازمت میں ہو گیا اور سات برس تک نہایت خوشحالی سے زندگی بسر کی ۲۸ سال کی عمر تک تصویر کے نام ایک لکیر بھی نہ کھینچی تھی۔ بالکل اتفاقیہ ایک دن اتوار کی چھٹی میں سیر کو جاتے جاتے رہ گیا۔ بیٹھ کر کسی کچے کے رنگوں کے بکس سے دفع الوقتی کے لئے تصویر بنانے لگا۔ یہ تھی ابتدا۔ مصور پسارد نے اس کی تھوڑی بہت رہبری کی پانچ برس بعد اس کی ایک تصویر کے متعلق نقادان فن کی رائے ہوئی کہ پسارد کی تصویروں کو یہ آن بان اور یہ زندگی نصیب نہ تھی۔ تین برس اور گزرے اور اس نے ایک دن یہ طے کیا کہ اب اتوار اتوار نہیں اب روز چھٹی ہو گی اور روز تصویر بنے گی۔ اپنی خوشحالی کی زندگی کو خیرباد کہا اور اس کے بدلے عسرت کے کانٹے مول لئے۔ نوکری چھوڑی اور ٹکے ٹکے کے پوسٹ کارڈ بیچ کر زندگی بسر کی۔ ایک عرصہ بعد کچھ سستی کے خیال سے کچھ نئی اور گرم آب و ہوا، نئی اور گرم صورتوں، نئے اور گرم حسن کی تلاش میں فرانس کی دور دراز، بحرالجنوب کے جزائر کی (ملاحظہ ہو صفحہ)

حسب دلخواہ طرز کی تلاش میں کوہ کنی کرنی پڑی اور انہوں نے بے دریغ کوہ کنی کی۔ انہوں نے فطرت پرستی کی رسم رائج کی ساری قیود کو نہایت بیباکی اور دلیری کے ساتھ توڑ ڈالا اور انیسویں صدی والوں کو یہ بتلا دیا کہ تم نے بھاپ سے انجن چلائے ہوں، بجلی سے سڑکیں روشن کر دی ہوں اور تم ہوا میں گرہیں لگاتے لگاتے آسمان کے تارے تک توڑنے میں کامیاب ہو گئے ہو لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے جو انسانی تمدن کا اصلی جوہر اور اس کا انتہائی مقصد ہے اس میں تمہارے کارنامے اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کہ ان کو زمین سے برابر کر کے ان پر نئی بنیادیں ڈالی جائیں، اور ایک نئی عمارت تیار کی جائے۔ پی کاسو[1] اور ماتس[2] بھی ان سے زیادہ مختلف نہ تھے گو اب بالخصوص اول الذکر "نو معروضیت" کی طرف رجوع ہو کر ایک اثباتی طرز کو ابھارنے میں کوشاں ہیں۔ اور ٹیگور بھی فن کا پیمبر ہے لیکن اس کا فن شروع ہی سے رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں اثباتی ہے انکاری نہیں اس کا فن بناتا ہے بگاڑتا نہیں، تعمیر کرتا ہے مسمار نہیں کرتا۔ البتہ بگاڑنے اور مسمار کرنے کے لئے تھا ہی کیا جو مسمار کیا جاتا۔ پرانوں کے لئے کون جان دینے لینے پر تیار ہوتا اور مغلوں کے بعد فن کی کوئی زندہ رسم موجود نہ تھی جس کے لئے لوگ آمادہ بہ پیکار ہوتے اور جس کو ڈھائے بغیر آگے چلنا دشوار ہوتا۔ اس لحاظ سے ٹیگور کا کام سہل تر تھا۔ لیکن جتنا سہل تھا اتنا ہی مشکل بھی تھا۔ کسی زندہ رسمی طرز کے نہ ہونے اور نقادان فن کے عدم وجود نے انکو اس درجہ آزادی دیدی تھی کہ اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے کے لئے ایک پیمبر فن ہی کی ضرورت تھی اور وہ بھی ٹیگور جیسے پیمبر فن کی۔

کالونی کا سفر کیا سب سے پہلے برٹانیا پھر ہیٹی میں رہا۔ ۱۹۰۳ء میں وہیں موت پائی۔ گوگان بھی اکسپرشنزم کے اولین نمائندوں میں تھا۔ لیکن اسکا رنگ عام رنگ سے جدا تھا۔

(۱) پالو پکاسو قوم کا ہسپانوی ہے لیکن اس کی نشو و نما پیرس میں ہوئی۔ یہ بھی فن مصوری کی طرف عمر کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد رجوع ہوا۔ (۲) ماتس فرانسیسی ہے اور طرز اظہاریہ میں اس کے یہاں لذت جمال سیزوں سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے خاص رنگ میں لوگ اسکو پی کاسو پر ترجیح دیتے ہیں۔

دنیا کے نئوں میں ٹیگور کا پکاسو سے موازنہ خاص طور پر دلچسپ ہو۔ ان دونوں نے ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی ۔ٹیگور نے اپنے نام سے موسوم طرز فن کی اور پکاسو نے مثلثی طرز یعنی کیوبزم کی۔ لیکن پکاسو مدرس فن کی حیثیت سے ٹیگور سے بڑا ہے۔ اس کے اثر سے چارہ محال ہے اور اس کا اثر باریک تر ہوتا ہے۔ دونوں "مشاق" ہیں یعنی فن کو طرح طرح سے برتتے ہیں۔ نت نئے انداز ڈھونڈھتے ہیں اور نئے طرز نکالتے ہیں، لیکن مشاقی فن کے لحاظ سے بھی پکاسو ہی کا پلہ چڑھا ہے ذہین دونو نہایت درجہ ہیں لیکن پکاسو ذہن کو فن میں زیادہ استعمال کرتا ہے اور ٹیگور ذہن کی لگام اپنے جذبات کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اپنے دماغ کو دل کی سرزمین تاراج کرنے سے عاری رکھتا ہو دونوں کے عمل میں مٹیشزم یعنی باطنیت کا رنگ حاوی ہو لیکن اس رنگ میں اگر ہندی ہیانی سے معمور تر ہے تو جائے تعجب نہیں۔ ان دونوں میں جو سب سے بڑا فرق ہے وہ یہ ہو کہ ٹیگور اپنی قوم کے اس دور میں پیدا ہوا ہے جبکہ وہ اپنی غلامی اور اپنے افلاس اور انحطاط کے ہاتھوں فن سے بالکل بے واسطہ اور بے بہرہ ہو اور پکاسو اقوام یورپ کے اس دور میں جبکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کوش ہیں، قومی آزادی سے انفرادی آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں، روحی کشمکشوں میں مبتلا ہیں لیکن خوشحال ہیں اور فن کی قدر انکے یہاں تمام دوسری قدروں پر حاوی ہے۔ مگر، ع ۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے - جو جہاں ہے وہیں کے لئے بنا تھا اور وہیں اچھا ہے۔ وہ وہاں اور یہ یہاں۔

ابتک تو میں نے دنیا کی ایک بڑی شخصیت کا دوسری بڑی شخصیتوں سے موازنہ کیا تاکہ ہندوستان کے مایہ ناز مصور کی خصوصیات ہم پر وسیع ترین نقطہ نظر سے ظاہر ہو جائیں اور ہم کچھ سمجھیں کہ ہمارے پاس اس وقت کیا ہے

اب رہیں ہندوستان کی دوسری فنی ہستیاں اور ان میں سب سے پہلے خود ٹیگور کے پیرو، تو پیرو ہمیشہ کم بساط ہوتے ہیں ۔ اگر مضامین نو کے انبار انکے یہاں ہوئے بھی تو انکی نے اور لَے دونوں مانگے کی۔ اور مانگے کی نے اور لَے سے کوئی کہانتک پہنچ سکتا ہے بلکہ بیشتر تو ایسے ہوتے

ہیں کہ بس استاد کے اگال کی جگالی کیا کرتے ہیں اور اسی میں زندگی کے دن گذار دیتے ہیں۔ البتہ ٹیگور کے شاگردان خاص میں سے چند افضل شخصیتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے نندلال بوس ایک ممتاز اور پرزور شخصیت رکھتے ہیں انکی تصویریں مثلاً "دریش" انسان کی نیند لے جاتی ہیں، ان کی معرفت واقعی معرفت ہوتی ہے اور وہ اس ارزان "ہو" سے ایک بالکل جداگانہ شے ہوتی ہے جو ہندوستان کی خود فریب قل اعوذیت پرچھائی ہوئی ہے اور جس کی ہندوستان کے بازاروں میں اس قدر مانگ ہے۔ ایک وقت تھا کہ نندلال اب سے زیادہ کرتے تھے اور اب سے کہیں زیادہ کہتے تھے۔ میرا مطلب بسیار گوئی اور بسیار کاری سے نہیں بلکہ زور کلام اور زور عمل سے۔ اب وہ اجنٹا کے ضرورت سے زیادہ پیچھے پڑ گئے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ انکی ندرت و دلنشینی اور انکی اثر آفرینی کم ہوتی جاتی ہے۔ اب بھی ان کے "کر سکنے" میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور آگے چلکر شاید وہ اب سے اور زیادہ "کر سکیں" لیکن مصوری کا جوہر "کر سکنا" یعنی کاریگری نہیں، بلکہ "ہو سکنا" یعنی زور ہستی ہے اور یہی ایک بڑے مصور کا تمغۂ امتیاز ہوتا ہے بہت کچھ امید ہے کہ انکے اندر خودی کی دبی ہوئی آگ ایک دن پھر بھڑکے اور وہ اجنٹا کی مریدی سے پھر کر اپنی ہی طرف رجوع کریں۔

ٹیگور کے شاگردوں میں سے ایک نہایت مسرت آگیں ہستی ہے ونکٹ ٹپا۔ ٹپا کا امتیازی پہلو انکی تصویروں کی لذت فروشی ہے ان کی تصویریں ایک صریح جسمانی سرور کا باعث ہوتی ہیں۔ ہوتی ہیں یا ہوتی تھیں کیونکہ جب سے ٹپا ریاست میسور کے درباری ہو گئے ہیں تب سے ان کے یہاں بے رس مذہبیت کی سخت بھرمار نظر آتی ہے۔ انکا طرز مغل اور ٹیگور اسکول کا ایک نہایت یگانہ و پرکار امتزاج ہے گو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ اس کے اس طرز خاص میں مغل اسکول کی جھلک نمایاں تر ہے۔ ٹپا دور حاضرہ کے ہندو اہل فن کی شاید تنہا مثال ہے جس نے مغل اسکول کی نمایاں خوشہ چینی کی ہے اور کس خوبی سے کی ہے۔ بڑی حد تک اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ ٹپا اور رسمیع الزمان جو مغل اسکول کے ہمیشہ سے فدائی رہے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے میں

کلکتے میں ٹیگور کی آنکھوں کے سامنے رہے اور انکی معلمی و مبصری سے فیضیاب ہوئے۔

سمیع الزمان جو اپنے کو صنعاتی کہتے ہیں اور جن کے بھائی ہونے کا راقم الحروف کو شرف حاصل ہے ہندوستان کے ہمعصر مصوروں میں ایک نہایت عجیب و یگانہ شخصیت ہیں۔ انہوں نے اس استاد کے طرز نو سے جس کے سامنے انہوں نے زانوے ادب تہہ کیا کوئی حصہ ورثے میں نہیں پایا۔ یہ ایک استاد کے لئے نہایت قابل ستائش ہے۔ اپنے شخصی اثرات کو دور رکھنا اور پھر بھی رہنمائی کرنا فن کے استاد اور معلم کی انتہائی خوبی ہے۔ لیکن ٹیگور کے ان شاگرد نے حد سے زیادہ اپنا نامہ اعمال مردہ صدیوں کے ساتھ بندھوا لیا ہے۔ زندہ اور آجکل والے انکے لئے دلچسپی سے بالکل خالی ہیں، وہ اس پرانے زمانے کی پرانی ریت کے قائل ہیں جب حضرت حوا پکاتی تھیں اور حضرت آدم کھاتے تھے، اور شہنشاہان مغلیہ ہمارے جزیرہ نما پر حکمراں تھے۔ یہ ایک صریح غلطی ہے اور ایک آرٹسٹ کے لئے "خشت اول چوں نہد معمار کج" کے مصداق ایک آرٹسٹ جو زندگی حال سے بالکل بے واسطہ اور منحرف ہو اس آواز کی مثال ہے جو صحراؤں میں گونج کر گم ہو جائے۔ ان کی تصویروں کے موضوع بالعموم قدیم اور بیشتر آورد پر مبنی ہوتے ہیں۔ کہیں مجنوں کی فرسودہ حکایت ہے کہیں نور جہاں کی پیدایش کے واقعہ کا لاحاصل بیان۔ انکی ہر کہانی ایک لمبی کہانی ہوتی ہے اور ہمارا دور بے لاگ، دلنشیں اور سنگین اثروں کا قائل دور ہے۔ ان کی تصویریں ایک قصے کا مرقع ہوتی ہیں یا ایک شعر کا یا بہت سے شعروں کا۔ وہ مرقع نگار ہیں اور مرقع نگاری آرٹ میں دوسرے درجے کی چیز ہے۔ وہ مغل اسکول کی تقلید میں سرمو فرق نہیں چاہتے اور اگر اپنے رنگوں اور اپنے چہروں میں ذرا بھی اس فرق کو محسوس کرتے ہیں تو اس پرانی ہیجدانی سے نالاں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ان غلط اصولوں کے باوجود فن کی ایک نہایت بڑی شخصیت ہیں۔ ایک طرف تو انکی باریکی قلم، جو گذرے زمانے میں تصویر کی خوبی کا سب سے بڑا معیار سمجھی جاتی تھی، عہد ماضی کے بڑے سے بڑے استادوں کے قلم کا مقابلہ کرتی ہے اور ان میں اکثر سے سبقت لیجاتی ہے، اور دوسری طرف انکے رنگ اور انکی نشستیں نہایت

یگانہ اور برزو ہوتے ہیں ممکن نہیں کہ کوئی مبصر انکو دیکھے اور یہ پہچان نہ لے کہ یہ کس کی حسن آفرینی کے جلوے ہیں۔ یہی حال انکے تازہ ترد دسکے آسمانوں کی پرکاریوں کا ہے کہ آدمی آنکھیں بند کرکے کہدے کہ یہ سمیع صنعانی کا بنایا ہوا آسمان ہے۔ انکی لذت کا بیان آنکھوں اور زبان دونوں کے امکان سے باہر ہے اور وہ اپنے قائل ہیں جس طرح کم کوئی دوسرا آرٹسٹ اپنا قائل ہوتا ہے انکے نزدیک صرف انکا طرز فنی اظہار کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طرز نہیں۔ اس معاملے میں وہ کسی سمجھوتے کے روادار نہیں اور اس میں انکے عقائد پتھر کی لکیر ہیں کہ ٹل نہیں سکتے۔ کوئی کچھ کہے وہ سب کی رائوں کو جوتے کی نوک پر مارتے ہیں اور اپنی تصویروں کو بہت کم نمائشوں میں بھیجتے ہیں۔ یہ سب انکے موافق ہے۔ یہ سب خصوصیات ایک نہایت بڑے اور سچے آرٹسٹ کی خصوصیات ہوسکتی ہیں۔ لیکن سمیع الزمان صنعانی زمانۂ ماضی میں ہیں زمانۂ حال نہیں اور یہ کہنے میں جو نقیص عائد ہوتی ہے وہی وہ چیز ہے جو انکی شخصیت کو ایک نہایت درجہ دلچسپ فنی شخصیت بنا دیتی ہے۔

ایک اور نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ چغتائی! عبدالرحمٰن چغتائی۔ انکا ذکر کرنے سے پیشتر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں فن مصوری کی ابتدا، اس کے عروج اور اس کی خصوصیات پر مختصراً بحث کیجائے، دنیا کی تمام قوموں کے تشکیلی فنون کی ابتدا جذبۂ پرستش سے ہوئی ہے اور انکا نشو و نما انکے مذاہب کے ساتھ بالکل نہیں تو ایک بڑی حد تک وابستہ رہا ہے۔ شوق سجود سے مجبور ہوکر انسان نے مختلف آب و ہوا میں مختلف تخیلات کے مطابق مختلف قسم کی ایسی شکلیں اختراع کیں جن کو وہ پیکر ایزدی کا مرقع سمجھکر انکے سامنے سر نیاز خم کرے اور اپنے بنانے والے اور اس کے قوانین و مظاہر کی طرف سے جو ہیبت اور محبت کے جذبات اس کے سینے میں مشتعل ہوتے ہیں انکا اظہار اپنی بندگی کے اعتراف یعنی اپنی جبیں سائی سے کرے۔ وحشی اقوام کے فنی کارنامے اس خیال کے اسی طرح حامی ہیں جس طرح کہ پرانے تمدنوں کے قدیم آثار۔ ہمارے پاس مصر، چین۔ ہندوستان، یونان کی مثالیں ایک طرف اور افریقہ

کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی تخیل نے ذات ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہار دست شیوا یا تری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی حسن کے انتہائی امکانات کی صورت میں جس کی مثالیں اپالو، زہرہ اور بیشمار دوسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ شوق سجود میں جس درجہ بیتابی اور جبیں سائی میں جس درجہ انہماک ایک قوم میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کی اختراع کردہ اشکال واقعی مظہر ہوتی تھیں ذات خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی رحمت اس کی عظمت کی۔ انسان کی صورت میں اوتار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن ان پتھروں کی صورت میں اوتار ضرور ہوجاتے تھے اور سجدوں کا جو تلاطم ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو اور یہی وجہ ہے کہ جس پائے کی شکلیں ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جسارت اس میں پیدا ہوئی کہیں اور پیدا نہیں۔ ملحوظ رہے کہ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں" لیکن شوق سجدہ سے جو تخلیق صورت وابستہ ہے اس کی علت و رہنما انسان کے مذہبی ولولے ہوتے ہیں اور اس میں ذہنی عنصر کی رہبری سے حصول حسن اور جمال آفرینی کا دانستہ (conscious) دخل معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ انکا مسلک حسن آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کی لذت حسن کی خاطر متلاشی نہ تھے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم کو انکے کارناموں میں اکثر انتہائی حسن کے نمونے نہیں ملتے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانستہ اس عنصر کے متلاشی نہ تھے برخلاف ان اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الست کے متوالے اپنی وارفتگی توحید میں بتان آذر سے دست و گریباں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ "مانو تو بت نہیں تو پتھر" یا نہ مانے تو پتھر نہیں تو بت۔ اسلام میں مذہبًا یعنی بحکم قرآن یا بحکم حدیث تصویر کشی یا تشکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولۂ توحید کا اقتضا شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ ان کی حسن آفرینی کی امنگ جو فطرت انسانی کا ایک

لازمی عنصر ہے، ایک عرصہ تک فن نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، قلمی کتابوں کے بے شمار نمونے فارس و ترکی قالینوں کے ڈزائن مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید براں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فن تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شائد کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ بڑے پیمانے پر چلکر انکی حسن آفرینی کی امنگ کا بھی ایک جولانگاہ تھا۔ اکثر نادان غیر مسلم مسلمانوں کی بت شکنی پر الزامات کے طومار باندھتے ہیں اور اکثر نادان تر مسلم اپنے اسلاف کی اس دیوانگی پر اس طرح نادم ہوتے ہیں جس طرح انگلستان سے واپس آئے ہوئے ہندوستانی اپنے غیر انگریزی ماں باپ کی ہستی پر نادم ہوتے ہیں۔ ہر شخص اور ہر قوم کا ایک خاص منصب اور مشن ہوتا ہے جس کے حصول میں اکثر برا دکن واقعے پیش آتے ہیں۔ ہر شخص یا ہر تمدن کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھنا ایک ہی کانٹے پر تولنا اور پرکھنا انسان کی جہالت اور تنگ نظری کی دلیل ہوگی۔ اگر سومنات لوٹا اور تاج بنا تو اہل نظر اس کو بنی نوع انسان کے فنی تشکیلی تمول میں ایک بڑا اضافہ تصور کرینگے اہل نظر ہر کامل دیوانگی کیساتھ ہو سنگے خواہ وہ بت گری آذر کی صورت میں جلوہ پیرا ہو یا بت شکنی خلیل میں۔ اہل نظر تو اس کے قائل ہیں کہ وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے۔ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ البتہ وائے برحال ما کہ نہ بت گر رہے نہ بت شکن نہ کعبہ رہا نہ بت خانے۔ بہرحال شغف بت شکنی کی چند صدیوں بعد ہی سے مسلمانوں نے خوشنویسی و نقاشی کے ساتھ ہی ساتھ کتابوں میں السٹریشن کے طور پر تصاویر کو جگہ دینی شروع کی اور آٹھویں صدی عیسوی میں ہم کو عراق کے قلمی نسخوں میں سے مصوری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کی پرکاری اظہار اور زور قلم پر انسان کو تعجب آئے لیکن خاندان عباسیہ کے انحطاط کے بعد مصوری کی یہ روش بھی مفقود ہوگئی۔ دوسری طرف فارس میں بھی کتابوں کے السٹریشن نے رفتہ رفتہ رواج پکڑا گو ابھی میدان خوشنویسوں کے ہاتھ میں تھا اور مصور بیچارہ ایک ایسی گمنام ہستی رہا جس کا کتاب کے کسی حصہ میں عموماً ذکر نہ ہوتا۔ ترکی میں بھی باتصویر کتابوں کا رواج ہوا لیکن

ترکی اسکول بہت ہی کمتر پایہ پر رہکر ختم ہوگیا۔ البتہ فارس میں اس شعبہ مصوری نے روزافزوں ترقی کی جس کی سب سے بڑی وجہ چین کا اثر تھا، چین! جس کا فن نقش وتصویر میں آجتک مقابل نہ نکلا۔ چونکہ مصوری کا مقصد ہنوز یہ تھا کہ کتابوں کے قصوں کو انہیں کی جلدوں کی حدود کے اندر نقش ورنگ میں پیش کریں اس لئے یہ تصویریں لازمی طور پر مختصر ہوتی تھیں اور ان میں مصوروں کو باریکی قلم کی صنعت گری کا خاص طور پر موقع ملا۔ انکی دوسری خصوصیت انکی خوشنمائی تھی اور انکے رنگوں کی گوناگونی۔ لیکن قلب مضطرب کے ولولوں سے ابھی انکو کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہزاد، جس کا نام میدان مصوری میں زبان زد خاص وعام ہے پہلا شخص تھا جس نے تصویر کو کتاب کی تنگ چار دیواری سے آزاد کیا اور جس نے اس جذباتی عنصر کو وہ جگہ دی جس کے بغیر تصویر ایک جسم بیجان سے زیادہ درجہ حاصل نہیں کرسکتی خواہ اس جسم میں ہزاروں بناؤ ہوں یہی راز ہے بہزاد کی مجددیت فن کا، نہ کہ اس کی باریکی قلم، جس میں بہزاد سے بڑھ چڑھ کر دوسرے استاد موجود ہیں۔ فارس کے اس اسکول نے شاہان مغلیہ کے سایہ عاطفت میں آکر بہت کچھ دوسرے خط وخال اختیار کرلئے۔ ایک طرف تصوف اور دوسری طرف شاہانہ اور درباری زندگی کے نہایت پر زور اور نہایت درجہ باریک قلم مرقع اس زمانے کی فنی سطوت اور شان وشکوہ کے لازوال شاہد ہیں۔ معراج اس طرز تصویر کی شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہوئی جو فن مصوری کا اپنے زمانے میں سب سے بڑا مبصر تھا۔ مابہ الامتیاز مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا ہے کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیار اول اور معیار آخر قرار دیا اور نہایت دانستہ، اور پورے احساس کے ساتھ حسن آفرینی میں سرگرداں ہوئے۔ تصویر میں خدا پرستی چونکہ مذہبًا ناممکن تھی اس لئے انہوں نے حسن پرستی اپنا مسلک ٹھہرایا۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنی نقاط نظر میں سے خالص جمالیاتی نقطہ نظر کے بانی ہیں یہی انکا تمغہ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے انکے وجود کا کفارہ ہے لیکن اس کل

کی بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لانے سے گریز کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں۔

مگر ذکر عبدالرحمن چغتائی کا تھا نہ کہ ان بھولے ہوئے نقوش کا لیکن چغتائی بلکہ سمیع الزماں کے بھی سمجھنے کے لئے اس داستان کی تھوڑی سی ورق گردانی لازم تھی چغتائی آخرالذکر کی طرح مغل طرز کے مقلد نہیں۔ نہ انکے اندر وہ باریکی قلم ہے نہ انکی تصویروں کی "تیاری" میں وہ دیدہ ریزی، نہ وہ ناک نقشے نہ قد وقامت۔ انکے فن میں تین عنصر پائے جاتے ہیں، ہندی فارسی اور انگریزی۔ انگریزی سے میری مراد انگریزی ہے نہ کہ یوروپی۔ اور انگریزی عنصر میں بھی شاید کاٹیبل کا اثر انیں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو انکا کمزور ترین پہلو ہے۔ اور انکا زوردار پہلو انکا فارسی یعنی جمالی پہلو ہے۔ جو داستان میں اوپر بیان کر آیا ہوں اس کی حقیقت ان کی تصویر کے ذرے ذرے میں جھلکتی ہے انکی حسین کلاہ کی حسین نوک سے لیکر انکے حسین جوتے کی حسین نوک تک اور انکی حسین ناک کی نکیلی نوک سے لیکر انکی نکیلی آنکھ کی حسین نوک تک حسن ہی حسن جلوہ گر ہے۔ مگر بدن میں خون چاہو تو خون ناپید۔ ہندی عنصر انکی کوشش ہے۔ انگریزی عنصر ان کی بدمذاقی اور فارسی عنصر انکی سرشت شاید یہ انکے نہ دیکھے پن کی باتیں ہوں کہ ان میں اکثر دولاک[1] جیسے ردی و مبتذل تصویر ساز کے السٹریشنوں سے سازبازی ہوس کا احتمال ہوتا ہے۔ جس سے انکا پایہ کہیں بلند تر ہے۔ چغتائی کی سدا نیم باز آنکھیں اور انکے نقشوں کی نوکداری انکی مصوری کا ایسا اٹل ضابطہ ہو کر رہ گیا ہے کہ ان سے انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ انکے یہاں موضوع بدلتے رہیں لیکن شکلیں نہیں بدلتیں۔ یہ انکی بڑی کم مائگی ہے۔ ایک نہ ایک ضابطہ تو خیر بڑے سے بڑے آرٹسٹ اکثر قائم کر لیتے ہیں جن کو پیش نظر رکھکر وہ کتاب یا تصویر تیار کر دیا کرتے ہیں لیکن در آں حالیکہ فن کی بڑی ہستیاں اپنے زوردار پہلوؤں کو دہراتی ہیں اور انپر مصر ہوتی ہیں، کم درجے کے آرٹسٹ اپنی کمزوریوں ہی کو اپنی قوت سمجھتے ہیں اور ان چیزوں کو جو واقعی بڑھکر پر کیف ہونے کی صلاحیت رکھتی

---

(۱) Edmund du Lac کے عمر خیام کی رباعیات کے مرقعے مشہور عام ہیں

ہوں، نا قابل توجہ خیال کرتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر چغتائی اپنی مے چشم، افسردہ دل نازنینوں کو چھوڑ کر منصور کی طرح پرند یا فراتر مارک(۱) کی طرح چوپائے بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے جن میں انکو خاص ملکہ نظر آتا ہے۔ با ایں ہمہ چغتائی اپنا ایک نرالا طرز رکھتے ہیں اور انکے ہمعصروں میں سے ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں، جس پر انکا یا جس کا ان پر گمان جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود زور اور قوت سے خالی ہونیکے وہ اس درجہ اہمیت کے مستحق ہیں۔ مگر کاش کہ انہوں نے غالب کو انڈرسن کی کہانیوں کے جیسے مرقعوں کے بغیر چھپایا ہوتا۔ لے غالب کے یہاں جذبات کا تلاطم اور انکی سبز سپید بادشاہ زادیاں خون سے خالی۔ لیکن زبان اردو بیچاری جس میں اس حسن و خوبی کی کوئی دوسری کتاب نہیں ہمیشہ کیلئے ان کا احسان مانے گی۔ اور غالب خاک نشیں بھی چاہے تہ خاک تیوریوں پر بل لا کے کہیں کہ "ارے یہ کیا کیا تو نے؟" لیکن جی میں خوش ضرور ہوں گے۔ غالب مصوّر کی طباعت کے دلکش خط و خال اور مرقع چغتائی کی جمال آرائیاں احساس سلیم اور احتساب تنقید کے لئے "رہزن تمکیں و ہوش" ہیں اور انکے سامنے اپنی انتہائی رشوت پیش کرتے ہیں۔

اب رہے اور تو اوروں کی تعداد بہت ہے اور سب کے سروں پر تھوڑی یا بہت بڑائی کا پشتارہ بھی ہے۔ ٹیگور کے خاندان سے کئی ایک۔ ہلدار۔ اکیں۔ دکیل۔ چودہری اور بنگال کے فنی ٹھیکیداروں میں سے کئی اور۔ سنگھ، اور پنجاب سے دو ایک اور حکیم محمد خاں لکھنؤ سے۔ لیکن انپر کسی مفصل تنقید کی اس مختصر سے مضمون میں گنجایش نہیں۔ ان سب میں کچھ نہ کچھ ہے اور ان میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی بڑے کارنمایاں کر جاتا ہے لیکن سب کے

---

(۱) Franz Marc جرمنی کا طرز تمثلی میں مشہور ترین مصور تھا جس نے جنگ عظیم میں نہایت کم عمری کی حالت میں موت پائی۔ اس طرز میں اسکے موجد پکاسو کے بعد اسکا ہمسر شاید کوئی دوسرا نہ ہو۔ وہ جانوروں اور جانوروں میں بھی بیشتر چوپاؤں کے سوا انسانوں کے مرقع کبھی نہیں بناتا تھا۔

سب زمرۂ مقلدین میں آتے ہیں، اساتذہ میں نہیں ۔ سنگھ پوچ احساسات اور ابتذال کیطرف
مائل ہیں ۔ اپنے موقعوں کے لحاظ سے بھی اور اپنے رنگوں اور ڈھنگوں کی پسند میں بھی ۔
حکیم محمد خاں ان پیدایشی صورت نگاروں میں سے ہیں جو باوجود کمال قوت و بصارت کے
زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں بک جاتے ہیں اور جو وہ مانگتا ہے بنانے لگتے ہیں ۔ اور مانگ
ہے ابتذال کی ۔ گنگا جمنی چھتر ۔ سلمے ستارے کے جوڑ بند دانتوں کے بجائے انار دانے اور
آنکھوں کے بجائے سرمئی انجور ۔ سبز سرخ پریاں ۔ ناٹک ۔ نوٹنکی اور ۔ میں ہونگا شہ کا بادرچی
میں سب کھانے پکاتا ہوں ۔ میرے قبضے میں ہے سب کچھ جو چاہوں سو کہلاتا ہوں یا بہت بڑھے تو
"یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی
ورنہ حکیم کی ابتدا بتلا رہی ہے کہ وہ موقلم کا مالک تھا ۔ اور بہت کچھ کر سکتا تھا ۔ حسرت ، کس مپرسی
اور دنیا کی بدمذاقی کا مقابلہ آسان نہیں ہوتا

ایک نام ہرشری متی سنتا دیوی ۔ اس نام سے کم لوگ واقف ہونگے لیکن انکی تصویر
"میلے کے بعد" ایسی ہے کہ ایک مرتبہ دیکھ کر انسان پھر نہ بھولے ۔ ہندوستان کے اس دور کی
بہترین تصویروں میں سے ایک تصویر ۔ اور بالکل نیا طرز خیال اور طرز ادا اس تصویر کے
رنگ اور جسموں کی حرکت و جنبش نہایت خوب اور حد درجہ مسرور کن ہیں ۔ یہ امر غور کرنے کے
قابل ہے کہ ہندوستان کی ان عورتوں میں سے جنکا مصوروں میں شمار مسلم ہے ہم شاید ایک کو
بھی بدمذاق باطنیت ، جذبہ فروشی یا نوٹنکی کی طرف مائل نہ پائینگے ، جس کے "مردذات" مصور
اتنے گھائل نظر آتے ہیں ۔

وہ دن شاید اب لد گئے جب راوی ورما بہزاد وقت سمجھے جاتے ۔ لیکن یہ قابل ذکر
ہے کہ راوی ورما کا اثر ہندوستان کے مصوروں اور ہندوستان کی مخلوق پر ایک زمانے
میں ٹیگور سے کہیں زیادہ عام رہا ہے راوی ورما میدان مصوری میں وہ کچھ تھے جو داغ میدان
شاعری میں ، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ داغ کا دائرۂ شعر تغزل تھا اور راوی ورما کا دائرۂ

عمل مذہبی روایات۔ لیکن تھے دونوں چپ چپے، شیر فروش۔ راوی درما کے گورے گورے حسین، ہنس مکھ دیوتا کچھ ہوں دیوتا نہیں معلوم ہوتے۔ اور انکے حسن وفن کے معیار کی ابتدا پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈراپ سین کی مورتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جب استاد کا یہ حال ہے تو شاگردوں کا کیا ذکر دبیان ہو۔

ایک حضرت ہیں مسٹر فیضی رحمین ساکن بمبئی۔ انہوں نے اپنے سر یہ قومی خدمت لے لی ہے کہ قدمائے ہندوستان کے فنی کارناموں کے گیت گایا کریں اور اپنے موقلم کی ترشحات سے اوراق حال کو اپنا ممنون احسان کرتے رہیں انکا ذکر اگر اس سے زیادہ کیا گیا تو انشاءاللہ بمبئی کے آرٹ اسکول کے ذکر کے ضمن میں ایک الگ مضمون کی صورت میں کیا جائے گا۔
میں میدان فن میں آزادی اظہار کا شدت سے قائل ہوں لیکن بعض اوقات اسی شدت سے جی چاہتا ہے کہ فنی احتساب کی رسم قائم ہوتی۔ اس سے بے پروائی کس کے سر جائے گی۔ ان کے نہیں بلکہ فن کے سچے پیمبروں کے۔

اسلامی اور مسیحی اخلاق

۱۔ سوال کی وسعت اور اہمیت | آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰؑ میں اخلاق کے لحاظ سے کس کو ترجیح دیجائے؟
اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے قرآن اور انجیل کی اخلاقی تعلیم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دونوں بزرگوں کے اقوال و افعال پر ایک گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور جن حالات میں انہوں نے تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا ان کو بھی پیش نظر رکھنا لازم ہے تاکہ اس بات کا فیصلہ کیا جا سکے کہ کونسی تعلیم مختص الوقت مختص القوم اور مختص المقام ہے اور کونسی تعلیم دائمی اور عام ہے۔
یہ سوال جیسا اہم ہے ویسا ہی وسیع بھی ہے اگر فرصت ملے تو اس بحث پر ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ ان سوالوں کا جواب بھی ایسے عنوان سے پیش کیا جائے کہ طالب حق کی تسلی کے لئے کافی ہو۔

۲۔ اخلاق کی حقیقت | سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ اخلاق ہے کیا چیز؟ میں نے رسالہ معیار الاخلاق میں اس پر بحث کی ہے۔ یہاں چند موٹی موٹی باتیں مختصر الفاظ میں بیان کیجاتی ہیں۔

(الف) اخلاق جمع ہے خلق کی اور خلق نفس انسان کی وہ حالت ہے جس کی بدولت افعال بآسانی صادر ہوتے ہیں۔ اگر وہ افعال عقلاً اور شرعاً پسندیدہ ہوں تو حسن خلق یا اچھے اخلاق سمجھے جائیں گے اور اگر ناپسندیدہ ہوں تو بدخلقی یا برے اخلاق کہلائیں گے۔

(ب) اخلاق ایک متوسط حالت کا نام ہے یعنی جو کام حد اعتدال پر قائم ہو وہ قابل تعریف اور داخل حسن خلق ہے اور اگر اس میں کمی یا زیادتی ہو جائے اور اعتدال قائم نہ رہے تو وہی کام قابل مذمت اور بدخلقی میں شامل ہو جاتا ہے۔

(ج) اخلاقی فضیلت کو خط مستقیم سے اور اخلاقی رذائل کو خطوط منحنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دو

نقطوں کے درمیان ایک ہی خط مستقیم ہو سکتا ہے مگر خطوط منحنی بے شمار کھینچے جا سکتے ہیں یعنی سیدھا رستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر ٹیڑھے راستے بے شمار ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے ہر ایک نیکی یعنی اخلاقی خوبی کو صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ کہا ہے (دیکھو قرآن مجید کی پہلی سورۃ یعنی سورۂ فاتحہ)

(د) عدالت تمام اخلاقی فضائل کا سرچشمہ بلکہ کل اخلاق کا مجموعہ ہے اور ظلم (جو اس کے برخلاف ہے) تمام رذائل کا سرچشمہ بلکہ کل بداخلاقیوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ عدالت کے معنی ہیں تمام انسانی قوتوں کو اعتدال پر رکھنا۔ اور یہ عین اخلاق ہے اور ظلم سے مراد ہے کسی شے کو بے موقع رکھنا یعنی بے اعتدالی اور اسی کو بداخلاقی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں جا بجا عدل و اعتدال کی مدح اور تاکید اور بے اعتدالی و ظلم کی مذمت اور مخالفت کی گئی ہے بلکہ کل اسلامی احکام صوم و صلوٰۃ۔ حج و زکوٰۃ۔ خمس و جہاد وغیرہ کی بنیاد ہی عدل و اعتدال پر قائم کی گئی ہے۔

اب میں دو اخلاقی فضائل یعنی شجاعت اور عفت کی مختصر سی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ یہ مطلب واضح ہو جائے۔

۱۔ شجاعت کیا چیز ہے؟ | قوت غضبی کے اعتدال سے شجاعت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے غصہ کو قابو میں رکھیں اور بوقت مناسب۔ بطریق مناسب بمقتضائے عقل اس سے کام لیں تو یہ شجاعت ہے جس کو دلیری اور بہادری بھی کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرنا شجاعت نہیں ہے مثلاً اگر کوئی شخص خونخوار درندوں کی طرح قتل و غارت پر مستعد اور خواہ مخواہ آمادۂ جنگ و جدال رہے۔ بے موقع اور بے عقلی سے غصہ کو استعمال کرے تو یہ قوت غضبی کی افراط ہے۔ ایسا فعل قابل تعریف نہیں ہو سکتا اور نہ اس کو شجاعت کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت غضبی کو جڑ بنیاد سے مٹا دے کبھی غصہ سے کام ہی نہ لے اپنے نفس کی حفاظت اور شریر کی شرارت کو دفع کرنے کے لئے کبھی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائے

ظالم سے کبھی انتقام نہ لے۔ ہمیشہ معافی اور درگذر سے کام تو یہ قوت غضبی کی تفریط ہے۔ یہ فعل بھی اخلاقی حیثیت سے قابل تعریف نہیں ہے اور نہ اس کو شجاعت سے کوئی نسبت ہے کیونکہ اس سے ظلم اور شرارت کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور نیکوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت۔ ضعیفوں کی اعانت۔ مظلوموں کی حمایت قیام امن وامان۔ دفع فتنہ وفساد اور تائید دین وغیرہ نیک مقاصد کے لئے قوت غضبی سے باعتدال کام لینا اور اپنے نفس پر قابو رکھنا اخلاقی خوبی ہے۔ اور اسی کو شجاعت کہتے ہیں۔ یہی اسلامی جہاد کا فلسفہ ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی کل جنگیں دفاعی تھیں اور ان میں یہی مقاصد پیش نظر تھے۔ کتاب تحقیق الجہاد میں جس کو میں نے بزبان اردو شائع کیا ہے قرآن۔ حدیث اور تاریخی واقعات سے اس امر کو ثابت کیا ہے۔

۴۔ عفت کیا چیز ہے؟ | قوت شہوی کے اعتدال سے عفت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اپنی تمام خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور باعتدال انکے کام لینا عفت ہے جس کو پارسائی بھی کہتے ہیں اس کے برخلاف عمل کرنا عفت نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی خواہشوں کو پورا کرنے میں آزاد ہو یعنی ہر خواہش کو بغیر اس خیال کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ حرام ہے یا حلال۔ پورا کرلے۔ تو یہ قوت شہوی کی افراط اور عفت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت شہوی کو مٹا دے اپنی جائز خواہشوں کو بھی پورا نہ کرے۔ جوگیوں کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں بیٹھ کر عبادت کرے۔ جڑی بوٹیاں کھا کر زندگی بسر کرے۔ زن و فرزند کو چھوڑ بیٹھے۔ یا سرے ہی سے ان تعلقات سے منہ موڑ بیٹھے۔ عمر بھر مجرد رہے۔ تو یہ قوت شہوی کی تفریط ہے اور یہ فعل بھی اخلاق سے خارج سمجھا جائے گا۔

۵۔ اصل الاصول اخلاق | قصہ کوتاہ۔ اخلاق ایک ایسے درمیانی طریق عمل کا نام ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک فطری قوت کو اعتدال پر قائم

رکھیں۔ تمام خداداد قوتوں سے بمقتضائے عقل کام لیں اور کسی قوت کو معطل نہ چھوڑیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم خلیق۔ صاحب خلق یا با اخلاق کہلائیں گے۔ ورنہ اخلاق سے گرجائیں گے یہ ہے اخلاق کا اصل الاصول جس کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اب میں انجیل اور قرآن کے اخلاق کا ایک مختصر سا موازنہ پیش کرتا ہوں۔

۶۔ مسئلہ انتقام اور انجیل | عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کل اخلاق کا لب لباب اپنے پہاڑی والے وعظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس وعظ کی ہدایات یہ ہیں :۔

۱۔ "لیکن میں تجھ سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے۔ اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔" (انجیل متی باب ۵ آیات ۳۹-۴۲)

۲۔ "جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے اور جو کوئی تیرا چوغہ لے اس کو کرتا لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو کوئی تیرا مال لے لے اُس سے طلب نہ کر۔" (انجیل لوقا باب ۶ آیات ۲۹-۳۰)

آج دنیا میں اصلی انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ کیا تھے اور آیا آپکا یہی مطلب تھا جو اس عبارت میں ظاہر کیا گیا ہے یا کچھ اور مطلب تھا۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تعلیم فطرت انسانی کے خلاف اور یہ اخلاق بالعموم ناممکن العمل ہیں اگر ظلم اور شرارت کے دفعیہ کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کیجائے اور ظالموں اور شریروں کو آزادانہ اپنے منصوبے پورے کرنے دئے جائیں تو نیکوں اور پارساؤں کی زندگی خطرے میں پڑجائے گی۔ اور آخر کار نظم تمدن باطل اور دنیا کا بہت جلد خاتمہ ہوجائے گا۔

۷۔ انتقام بابت قرآنی تعلیم | اب اس مسئلہ کے مقابلہ میں اسلامی اخلاق کو دیکھئے جو قرآن مجید نے ہم کو سکھایا ہے۔

وجزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا، فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔ انہ لا یحب الظٰلمین ۝ (شوریٰ پ ۲۵)

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے (یعنی جرم کے موافق انتقام لینا) پھر جو شخص معاف کردے اور صلح کرے اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ بے شک خدا ظلم کرنیوالے کو دوست نہیں رکھتا۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ موقع اور محل کے موافق انتقام اور معافی سے کام لو۔ اور انتقام لینا لازمی نہیں ہے اگر مجرم کو مصلحتہً معافی دیدی جائے تو معاف کرنیوالے کو اللہ تعالیٰ اجر دے گا۔ اکثر آیات اور احادیث سے معاف کردینے کی فضیلت ثابت ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اس کی حیرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ آپ نے بدترین دشمنوں کے قصور بھی معاف کئے ہیں۔ مگر انتقام کو یک قلم ترک کردیا جائے تو دنیا میں فتنہ وفساد پھیل جائے بلکہ دنیا تباہ اور برباد ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بقدر واجب انتقام لینے کی اجازت دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عفو اور درگذر کی خوبی بھی جتادی یہ نہیں فرمایا کہ کبھی شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ انتقام کا نام نہ لینا۔ ہمیشہ حلم اور نرمی سے کام لینا۔ یہانتک کہ اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دینا۔ ظالم کی فریاد اور ظلم کی داد خواہی نہ کرنا۔ بلکہ اگر کوئی شخص نالش کرکے تمہارا کرتہ جبرًا لینا چاہے تو اپنا چوغہ بھی خوشی سے اس کے حوالے کردینا۔ وغیرہ وغیرہ کیونکہ ایسے احکام فطرت انسانی کے خلاف اور تکلیف مالایطاق ہیں

۸۔ قرآنی تعلیم کی فوقیت | بہرحال مسئلہ انتقام کی بابت انجیل کی تعلیم جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے اعتدال سے گری ہوئی اور تفریط کی حد انتہائی کو پہنچی ہوئی ہے۔ فطرت انسانی بھی اس کو قبول نہیں کرتی اور عام طور پر اسکی تعمیل بھی نہیں ہوسکتی۔ مگر قرآنی تعلیم جو آنحضرت نے پیش کی ہے۔ بالکل معتدل۔ فطرت انسانی کے مطابق اور ہر حالت میں قابل عمل ہے۔ جس

پر تمام دنیا عمل کر رہی ہے۔ مگر مسیحی تعلیم کو خود مسیحی قوموں نے بالائے طاق رکھدیا ہے۔ حقیقت الامر یہ ہو کہ یہ دلفریب اور شاندار مسیحی اخلاق۔ زینت اوراق کتاب مقدس بنائے جانے کے سوا اور کسی مطلب کا نہیں۔ اور ایک مسیحی مشنری کے لب شیریں سے اُس کی شیرینی میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے مگر عملی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسی سے اسلامی تعلیم اور اخلاق محمدی کی عظمت۔ وقعت اور فوقیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے

۹۔ معاشرتِ زوجین کے متعلق قرآنی احکام | اخلاق کا ایک شعبہ تدبیر منزل ہے یعنی انتظام خانہ داری جو زن وشوہر کے خوشگوار تعلقات پر منحصر ہے۔ اس باب میں بھی اسلام نے نہایت حکیمانہ اصول اور بہترین ہدایات پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر آیات ذیل قابل ملاحظہ ہیں:۔

(۱) وعاشروہن بالمعروف فان کرہتموہن فعسیٰ ان تکرہوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً ۵ (نسا، ۳/۲)

اور اُنکے ساتھ (یعنی اپنی بیبیوں کے ساتھ) حسن سلوک سے رہو۔ پھر اگر (کسی وجہ سے) تم انکو ناپسند کرو تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو۔ اور اللہ اس میں بہت سی خیر (برکت) عطا کرے "

(۲) وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفوراً رحیما (نسا، ۱۸/۲)

اور اگر تم کو (یعنی میاں بیوی آپس میں) صلح کرلو اور (ایک دوسرے کی حق تلفی سے) بچو تو خدا بخشنے والا اور رحیم ہے "

(۳) وان خفتم شقاق بینہما فابعثوا حکماً من اہلہ وحکما من اہلہا ان یریدا اصلاحاً یوفق اللہ بینہما ان اللہ کان علیما خبیرا ۵ (نسا، ۲۹/۵)

اور اگر تم کو انکے درمیان (یعنی میاں بیوی میں) جدائی کا اندیشہ ہو۔ تو ایک پنچ مرد کے کنبے میں سے اور ایک عورت کے کنبے میں سے بھیجو اگر دونوں پنچ اصلاح کا ارادہ کریں گے تو خدا (انکے سمجھانے سے) اُن دونوں میں (یعنی میاں بیوی میں) موافقت کر دیگا۔ بیشک خدا (سبکے دلی ارادوں سے) واقف اور با خبر ہے "

(۴) ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف وللرجال علیہن درجۃ ط واللہ عزیز حکیم ہ (البقرہ پ۲ع۴)	اور جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں پر ہیں ایسے ہی دستور کے مطابق (عورتوں کے حقوق) مردوں پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت ہے"

یہ آیات صاف طور پر ہدایت کرتی ہیں کہ زن و شوہر کو سلوک اور محبت سے رہنا چاہئے اور اگر ان میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس کو رفع کر لیا جائے۔ حسب ضرورت پنچ مقرر کئے جائیں اور صلح و صفائی کرا دیجائے تاکہ فریقین کے خوشگوار تعلقات دوبارہ قائم ہو جائیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ہیں جن کی تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے۔

۱۰۔ طلاق کی بابت قرآن کا حکیمانہ فیصلہ شریعت اسلام نے طلاق یا خلع کے ذریعہ سے زن و شوہر کی جدائی کو بہت ہی ناپسند کیا ہے اور ایسے قواعد و ضوابط مقرر کر دیے ہیں کہ حتی الامکان جدائی کی نوبت نہ آئے۔ (دیکھو سورہ طلاق وغیرہ) اور اگر کبھی ایسی نوبت آجائے اور مصالحت کی کوششیں کارگر ثابت نہ ہوں اور علیحدگی کے سوا چارہ نہ ہو تو ایسی حالت میں فریقین کو عقد ثانی کی اجازت دی گئی ہے۔ تاکہ اُنکی زندگی برباد اور اُنکا اخلاق تباہ نہ ہو۔

۱۱۔ طلاق کے متعلق انجیل کا حکم اب اسکے مقابلہ میں انجیل کو دیکھا جائے تو وہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے انکے شاگردوں نے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تو یہ جواب ملا تھا۔

"اُس نے اُن سے کہا جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اُس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے (انجیل مرقس باب ۱۰ آیات ۱۱-۱۲)

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات زن و شوہر کی ناموافقت کا دفعیہ ممکن نہیں ہوتا اور اُنکا مل کر رہنا فتنہ و فساد کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسکا بہترین علاج یہی ہو سکتا ہے

کہ اُن کو جدا کر دیا جائے اور انکے لئے عقد ثانی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کیجائے جیسا کہ قرآن مجید کا حکم ہے۔ مگر انجیل مقدس کہتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ فریقین کی ناموافقت سے معاشرت میں خواہ کیسی ہی خرابیاں پڑ جائیں انکا اخلاق کیسا ہی برباد ہو جائے۔ سوسائٹی کی حالت کیسی ہی ابتر ہو جائے مگر انکا اکٹھا رہنا لازم۔ اگر جدائی کے بعد کہیں کسی فریق نے عقد ثانی کر لیا تو وہ مرتکب فعل حرام سمجھا جائے گا!

۱۲۔ اس حکم کی دلیل اور حضرت مسیح کی زبانی اور اس کے نتائج حکم کی سختی تو ظاہر ہے مگر اس کی دلیل جو حضرت عیسیٰ کی زبانی بیان کیجاتی ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور وہ اور اس کی بیوی دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے" (انجیل مرقس باب ۱۰ آیات ۹)

اس عبارت سے مفصلہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) عقد کے بعد زن و شوہر حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں دو نہیں رہتے۔

(۲) اگر ان میں جدائی ہوئی تو ایک جسم کٹ جائے گا۔ اور دونوں ٹکڑے (زن و مرد) بیکار ہو جائیں گے۔

(۳) یہ خصوصیت صرف عقد اول میں ہے۔

(۴) عقد اول میں زن و مرد کا جوڑا خدا خود ملاتا ہے اور وہ اپنے اختیار سے عقد نہیں کر سکتے۔

(۵) جدائی کے بعد اگر کوئی فریق عقد ثانی کرلے تو یہ خدائی عقد نہ ہوگا بلکہ انسانی فعل سمجھا جائے گا۔

(۶) پہلا عقد خدا کا باندھا ہوا ہے اس لئے صحیح ہے۔

(۷) دوسرا عقد انسان کا فعل ہے اس لئے باطل ہے

(۸) پہلے عقد سے تنزلی اخلاق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۹) اگر اُس عقد سے تکلیفیں پیش آئیں تو بھی دم نہیں مارنا چاہئے۔ کیونکہ وہ گرہ خدا کے ہاتھ کی باندھی ہوئی ہے۔

(۱۰) دوسرے عقد میں فریقین کے لئے کوئی خوبی نہیں۔ کیونکہ وہ انسانی فعل اور خلاف حکم خدا ہے۔

مگر معاملات خانہ داری کا روزانہ تجربہ ان نتائج کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتا۔ لہذا یہ دلیل ناقابل تسلیم ہے۔

۱۴۔ مسیحی اقوام کا قرآن کیطرف میلان | یہی وجہ ہے کہ جب انجیلی حکم تعمیل سے معاشرت میں طرح طرح کی خرابیاں محسوس ہونے لگیں تو مسیحی قوموں کو اس کو خیر باد کہکر طلاق اور عقد ثانی کے لئے تعلیم انجیل کے برخلاف قانون بنانا اور قرآنی حکم کے آگے سر جھکانا یعنی آنحضرت کی حکیمانہ تعلیم کو قولاً نہ سہی عملاً تسلیم کرنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ انسان فطرت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور جس نے ایسا کیا ہے اس کو کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

مسیحی اقوام دین خدا (فطرت) کی مخالفت پر ایک مدت تک قائم رہیں۔ آخر سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ ع با دین خدا ہر کہ در افتاد بر افتاد

صاحبان بصیرت دیکھیں کہ قرآن کیسی حکمت سے دنیا کو دعوت اسلام دے رہا ہے۔ اپنی صداقت اور افضلیت کا سکہ دلوں پر بٹھار رہا ہے اور اقوام عالم کو سرکار محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے در دولت کیطرف بلا رہا ہے۔ اسلام اپنی روحانی قوت سے دنیا میں پھیل رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا کہ اسلام ہی تمام دنیا کا مذہب ہو جائے گا اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون ٥ (صفحہ ۲۸/۱۰)

وہی (خدا) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اُس دین کو تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو بُرا لگے۔"

۱۴۔ اخلاق محمدی کی جامعیت اور اخلاق عیسوی کے ساتھ اسکا موازنہ

میں نے آنحضرتؐ کی تعلیم اور اخلاق کی عظمت و فوقیت کو چند خاص مثالوں کے ذریعہ سے ثابت کر دیا ہے جس کا کوئی صاحب فہم انکار نہیں کر سکتا۔ اب میں اس مطلب کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی عربیؐ کا اخلاق ہر پہلو سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(الف) اخلاق کی بنیاد انسانی تعلقات پر ہے اور یہ تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں ہمارا ایک تعلق خالق کیساتھ۔ دوسرا تعلق اپنے نفس کے ساتھ اور تیسرا تعلق مخلوقات کیساتھ ہے۔ لہذا ہر انسان کے اخلاقی فرائض تین قسموں میں محدود ہو سکتے ہیں۔

(۱) وہ فرائض جن کا تعلق خدا سے ہے۔

(۲) وہ فرائض جن کا تعلق خود نفس انسان سے ہے

(۳) وہ فرائض جن کا تعلق دیگر مخلوقات سے ہے۔

(ب) اس مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کے ذمے تین قسم کے حقوق ہیں حقوق اللہ حقوق النفس، حقوق المخلوقات۔ ان حقوق و فرائض کی بے شمار شاخیں ہیں جن کا باقاعدہ ادا کرنا ہی حسن اخلاق ہے۔ مختلف درجوں اور مختلف طبقوں کے لوگوں کے ساتھ جس قدر ہمارے تعلقات زیادہ ہونگے اُسی قدر زیادہ ہم کو وسعت اخلاق کی ضرورت ہو گی۔ چونکہ ہمارے پیغمبر (صلعم) کے تعلقات نہایت وسیع تھے۔ اسی لئے آپ کا آپؐ کا اخلاق بھی نہایت وسیع تھا۔ قرآن۔ حدیث اور سیرہ نبوی کے مطالعہ سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نے مختلف حالات میں مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے اخلاقی فرائض کو ایسی خوبی سے ادا کیا ہے۔ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

(ج) آنحضرتؐ کل انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے (دیکھو قرآن مجید سورہ سبا ع۳) اور آپؐ کی کتاب تمام دنیا جہان کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی (دیکھو قرآن مجید سورہ

فرقان ۲۵) اور آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں (دیکھو قرآن مجید سورہ احزاب ۴۰ ۳۳)
ان حالات کے لحاظ سے یہ امر ضروری تھا کہ آپ کی تعلیم عام اور آپ کی کتاب جامع ہو
اور آپ کا اخلاق (جو در اصل قرآنی تعلیم کی عملی صورت ہے) اس قدر وسیع ہو کہ ہر قوم
ہر ملک، ہر حالت، ہر حیثیت، ہر درجہ، ہر طبقہ اور ہر زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے
لئے عمدہ نمونہ ہو۔

(د) اب ہم حضرت مسیحؑ کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ آپ ؑ
ایک ہی قوم کے نبی تھے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ " میں اسرائیل کے گھرانے
کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا " (دیکھو انجیل متی باب ۱۵ آیتہ ۲۴)
اور جب آپ نے اپنے شاگردوں کو منادی کے لئے بھیجا۔ اُس وقت بھی یہی ہدایت کی تھی
کہ صرف بنی اسرائیل کو ہدایت کرنا (دیکھو انجیل متی باب ۱۰ آیات ۵-۶) لہذا ضروری تھا کہ
آپؑ کی تعلیم اور ہدایات بھی مختص القوم۔ مختص الوقت اور مختص المقام ہوں۔ اور آپ کا
اخلاقی نمونہ بھی اسی قوم کی ضروریات اور حالات کے موافق ہو۔ جس کی ہدایت کے لئے
آپ ایک وقتِ خاص تک مامور تھے۔

۱۵۔ آنحضرت کی زندگی کے چار دور اور ہر دور کی جداگانہ خصوصیات

ہم آنحضرتؐ کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ہر حصہ کی اخلاقی خصوصیتیں جداگانہ ہیں۔

(الف) ایک زمانہ وہ ہے کہ آنحضرتؐ فعلاً تبلیغ اسلام کرتے ہیں یعنی اپنے پسندیدہ عادات و اطوار
اور آداب و اخلاق کا بہت عمدہ نمونہ قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر زبان سے نہیں
کہتے کہ میں پیغمبر ہوں اور تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اس زمانے میں ہر فرد بشر
آپؐ کا مداح پایا جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ اخلاق مجسم اور بہمہ صفت موصوف ہیں۔ اور تمام
عرب آپ کو صادق اور امین کے معزز اور ممتاز لقب سے مخاطب کرتا ہے۔ چالیس سال
کی عمر تک یہی کیفیت رہتی ہے۔

(ب) اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور آنحضرتؐ قولاً اور فعلاً دونوں طرح دعوت اسلام دیتے ہیں یعنی زبان سے بھی فرماتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہوں۔ اور آپ کا فعل بھی آپ کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ آپؐ قوم کی دینی و اخلاقی اصلاح میں ہمہ تن مشغول ہیں اس لئے قوم آپ کی دشمن ہو جاتی ہے۔ جو لوگ آپ کو ہمیشہ صادق اور امین سمجھتے رہے وہی اب آپؐ کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ مگر آپؐ صبر و شکر کرتے۔ حلم و درگذر اور رحم و کرم سے کام لیتے ہیں۔ تبلیغ دین میں سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے یہ سخت آزمائش کا زمانہ ہے جو متواتر تیرہ سال تک قائم رہتا ہے۔ اور اسی زمانے میں دشمن آپ کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

(ج) اب تیسرا دور آتا ہے اور آنحضرتؐ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ جیسے پیارے وطن کو مجبوراً چھوڑتے ہیں اور مدینہ منورہ تشریف لیجاتے ہیں مگر دشمن اب بھی آرام نہیں لینے دیتے۔ مدینہ منورہ پر فوج کشی کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو حفاظت اسلام کی غرض سے تلوار کے جواب میں تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ اور بہت سی لڑائیاں پیش آتی ہیں مگر ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ بھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے اور اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کا برتاؤ نہایت شریفانہ ہے اور آپ کا اخلاقی نمونہ ایسا عمدہ ہے جس سے بہتر ایسے حالات میں کوئی شخص اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ ان مصائب کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک برابر جاری رہتا ہے۔

(د) اب آپؐ کی زندگی کا چوتھا اور آخری دور آتا ہے۔ مکہ فتح ہو جاتا ہے۔ دشمن جو متواتر اکیس سال تک سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف آپ کو اور تمام مسلمانوں کو پہنچاتے رہے ہیں۔ سب کے سب مغلوب ہو چکے ہیں۔ اور معافی کے طالب اور رحم کے ملتجی ہو کر آپ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ بجز چند آدمیوں کے جن کے جرائم

کسی طرح قابل معافی نہیں ہوسکتے تھے۔ سب کے قصور معاف کئے جاتے ہیں۔ اور وہ نبی رحمت (جسکا مبارک لقب رحمۃ للعالمین ہے) رحمدلی کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ جس کو دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ الغرض آخری حج سے فارغ ہونے کے بعد جبکہ اسلام کی تکمیل ہوگئی۔ آنحضرتؐ اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف تشریف لیجاتے ہیں۔

بیان مذکور کا نتیجہ اور آنحضرتؐ کی افضلیت کا نظارہ

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔ آنحضرت کی روحانی زندگی کا نہایت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی مبارک زندگی کے ہرایک دور میں اُس دور کے مناسب حال بہترین اخلاقی مثالیں دنیا کے سامنے پیش کیں مگر حضرت عیسیٰؑ کو ایسے مواقع پیش نہیں آئے۔ مثلاً:۔

(۱) نہ کبھی یہودیوں سے آپ کا مقابلہ ہوا۔

(۲) نہ کبھی جنگ وجدال کی نوبت آئی۔

(۳) نہ کبھی آپؑ کے شاگردوں پر ایسے شدید ظلم ہوئے۔

(۴) نہ کبھی اتنی طولانی مدت (۲۱ سال) تک آپ نے دکھ پر دکھ اٹھائے

(۵) نہ آپؑ کے دشمن کبھی مغلوب ہوئے۔

(۶) نہ کبھی ہتھیار ڈال کر آپؑ سے رحم کے ملتجی ہوئے۔

لہذا ایسے مواقع کے مناسب حال آپؑ نے کوئی تعلیم نہیں دی اور نہ کوئی ایسا عملی اخلاق پیش کرسکے جس سے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف افراد اور مختلف اقوام کو ہدایت حاصل ہوسکے۔ آپؑ کے اس قسم کے اقوال کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا" محض وقتی اور عارضی ہدایات ہیں۔ جو ہر موقع پر اور ہر حالت میں مفید نہیں ہوسکتیں۔ مگر خواجۂ عالم۔ فخر بنی آدم احمد مجتبیٰ۔ محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے اپنے قول اور فعل سے خلق کی دائمی ہدایت کا سامان مہیا کر دیا۔ فی الحقیقت قدرت نے یہ ذمہ داری ایسے ذی مرتبہ انسان کے لئے اٹھا رکھی تھی جو تمام پیغمبروں کا سردار بن کر تمام عالم کی ہدایت کے لئے آنے والا تھا جس کی نسبت خود

حضرت عیسیٰؑ نے خبر دی تھی کہ "دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُسکا کچھ نہیں" (انجیل یوحنا باب ۱۴ آیات ۳۰) اور وہ پیغمبر عربی و مکی و مدنی کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟

جواب اعتراضات عیسائی اس باب میں طرح طرح کی بحثیں پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) آنحضرت نے بہت سے نکاح کئے اور حضرت عیسیٰ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

(۲) آنحضرت نے مرد کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی اور حضرت عیسیٰ نے کبھی ایسی اجازت نہیں دی۔

(۳) آنحضرت نے اپنا دین جبر و تعدی سے پھیلایا اور حضرت عیسیٰ نے نرمی و اخلاق کر۔

(۴) آنحضرتؐ نے خونریزی کی مثال قائم کی اور حضرت عیسیٰ نے صلح و امن کی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس مقالہ میں اخلاق کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اصولاً اور ضمناً اس قسم کے اعتراضات کا جواب بھی آگیا ہے۔ اگر مفصل دیکھنا ہو تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں انکا مطالعہ کرنا چاہئے۔

باغی

نگارش قلم: سلمیٰ لاگرلاف

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایکدن جبکہ دھوپ نکلی ہوئی تھی، دونوں باغی انہیں تالابوں میں سے ایک کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے آئے۔ جھاڑیوں میں سے گذر کر وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھ گئے اور وہاں سے انہوں نے اپنے جال پھینکے۔ وہ اُن بڑی بڑی مچھلیوں کو پکڑنا چاہتے تھے جن کی آجکل ان جھیلوں میں بہت کثرت تھی اور جو پانی کے اوپر نیچے تیرتی اور کھیلتی پھر رہی تھیں۔ دونوں باغی دشت وجبل میں عرصہ دراز تک رہنے سے بالکل "فرزندان فطرت" بن گئے تھے۔ "نباتاتی سلطنت" کے ماحول سے انکی روحوں نے پوری وابستگی اور ہم آہنگی پیدا کرلی تھی۔ شمس وقمر کے طلوع وغروب کے ساتھ اُن میں انبساط اور انقباض پیدا ہوتا تھا، اور موسم کے تغیرات کے اشاروں پر انکے قلوب حرکت کرتے تھے! جس کنج میں وہ اسوقت بیٹھے ہوئے تھے وہ ایک ایسی دلکش اور نظر فریب جگہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی نے اس کو "سحر بند" کر دیا ہے! اس وقت وہ بیرونی دنیا میں بالکل منقطع تھے۔ جھاڑیوں اور پودوں میں نرم ہوا کی جنبش سے ایک ترنم ریز موسیقی پیدا تھی "پتوں کی تالیوں" اور "پھولوں کے جھولا جھولنے" کا عجیب سماں تھا! وہ دونوں اپنے پوستینوں میں ملبوس کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی صحرائی پوشش اردگرد کے پتھروں میں اپنی ہم رنگی کی وجہ سے بالکل وصل ہوئی جاتی تھی! دو سنگین مجسموں کی طرح وہ مقابل کناروں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے! سامنے تالاب کے پانی میں قوس قزح کی ہفت الوانی کے مشابہ رنگا رنگ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں شکاریوں کی شستیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں کہ اُن میں یکبارگی ایک جنبش پیدا ہوئی۔ یہ بہت معنی

خیزاور امید افزا علامت تھی لیکن آخر کار وہ انکا ایک فریب نظر ثابت ہوئی۔ ایک بڑا آبی جانور پاس ہی پڑا ہوا تھا۔ جس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا، چنانچہ کانٹوں کی یہ حرکت اس تموج کا نتیجہ تھی جو یہ جانور اپنے بدن کی نقل و حرکت سے پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ ہٹ گیا تو شستیں بدستور ساکن ہوگئیں۔

موقع بڑا ہی دلفریب اور روح پرور تھا اور وہ دونوں اس منظر کی باصرہ نوازی سے سرشار ہو رہے تھے۔ انکو اس بہشتی کنج میں طرح طرح کی صورتیں نظر آتی تھیں۔ جن کی تشریح و تعبیر وہ خود بھی ایک دوسرے سے کرنے سے قاصر تھے۔ مچھلی کا شکار تو برائے نام ہی ہوا، بلکہ سارا وقت اس "خیالستان" کی "خوابوں" کے دیکھنے میں گذر گیا!

اسی اثنا میں یکبارگی کسی کشتی کے پتوار کی آواز جھاڑی کے پیچھے سے سنائی دی دونوں شکاری اپنی "بیداری کی نیند" سے چونک اٹھے۔ چند لمحوں میں کشتی نظر آئی۔ یہ ایک درخت کے تنے میں کاٹکر بنائی گئی تھی۔ اس کو اسے پتواروں سے حرکت دیجا رہی تھی جو چھڑی سے زیادہ موٹے نہ تھے۔ کشتی کی راکب ایک نوخیز لڑکی تھی جو پانی میں ادھر اُدھر کنول توڑ توڑ کر جمع کر رہی تھی۔ اُس کے بال گھونگر والے سیاہ رنگ کے تھے۔ آنکھیں بھی سرگیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ رخساروں پر خون کی سرخی کا برائے نام شائبہ تھا۔ لبہائے لعلین بھی سفید ہو رہے تھے۔ وہ سفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھی۔ کمر میں ایک چرمی پیٹی لگی ہوئی تھی جس کا قفل سونے کا تھا۔ اس کا سایا آسمانی تھا جس میں چوڑی سرخ رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی وہ کشتی چلاتی ہوئی پاس سے گذر گئی اور ان باغیوں پر مطلق اُس کی نظر نہ پڑی۔ یہ لوگ بھی بالکل دم بخود بیٹھے رہتے انکو اپنے دیکھ لئے جانے کا اتنا خوف نہ تھا جتنی یہ بات موجب قلق تھی کہ نوجوان لڑکی ان عجیب الخلقت آدمیوں کو اس ہیئت کذائی سے یہاں بیٹھا دیکھکر ڈر جائے گی۔ جب کشتی چلی گئی تو یہ پتھر کے بت پھر آدمی بن گئے اور مسکرا کر آپس میں یوں ہمکلام ہوئے۔

"ایسی سفید تھی جیسے کہ یہ کنول کے پھول!"، ایک نے کہا،" اور آنکھیں ایسی کالی کالی تھیں جیسا صنوبر کی جڑوں میں ٹھہرا ہوا وہ پانی!"

لڑکی کی کشتی رانی۔ شغل گل چینی، مخصوص علیہ وہیئت، اُس کی بیخودی و خود فراموشی سے دونوں صحرائی ایسے محظوظ ہوئے کہ خوب قہقہہ مار کر ہنسے، ایسا بلند جناتی قہقہہ جس سے تمام دشت دور گونج اٹھے اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پر زور ہوائی تموج سے دیو ہیکل صنوبر کے درخت اکھڑ کر گر پڑیں گے۔

تمہارے خیال میں کیا یہ کوئی حسین لڑکی تھی؟" برگ نے کہا۔

"میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا، وہ گذر بھی جلدی سے گئی، غالباً تھی تو خوبصورت" ٹارڈ نے جواب دیا۔

شاید تم اُس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے" برگ نے کہا، کہیں یہ وہ عجیب الخلقت عکس تو نہ تھی جس کا نصف بدن مچھلی کا اور نصف انسان کا سا ہوتا ہے؟!"

قہقہہ کے ایک ناقابل فہم احساس نے انہیں پھر گدگدایا اور وہ دوبارہ ہنس پڑے!

... .

ٹارڈ نے اپنے بچپن کے زمانے میں ایک آدمی کی لاش کو دیکھا تھا جو سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھی، یہ شخص ڈوب کر مرا تھا۔ یہ منظر کچھ ایسا ہیبت ناک تھا کہ اُس کا خوف ہمیشہ کے لئے ٹارڈ کے دل میں جاگزیں ہو گیا، خاصکر راتوں میں وہ بلا ناغہ کابوسی خواب دیکھا کرتا تھا جن میں ہزار ہا مردے اُس کو سمندر کی لہروں سے نکلتے ہوئے نظر آتے تھے جن سے ایک ایک جزیرہ اور ایک ایک چٹان پٹ جاتی تھی، لاشوں کا یہ انبار خود اس کے قدموں میں بھی، جبکہ ؤ ساحل بحر پر کھڑا ہوتا تھا، جمع ہو جاتا تھا، اور عالم خواب کے یہ دہشت ناک تماشے اُس کو بُری طرح خوفزدہ کرتے تھے۔

ٹارڈ کے یہی تصوّرات و توہمات اسوقت بحالت بیداری عود کر آئے! اور آئندہ سے اُس

کے خوابوں کے مناظر میں اس پراسرار صحرائی لڑکی کی سیر دریا کی تصویر کا اور اضافہ ہوگیا! کوہستانی کنجوں کی مختلف خوابگاہوں میں اس کی اس لڑکی سے ملاقاتیں ہوئیں جہاں اس کو بغور دیکھنے سے اُس نے فیصلہ کیا کہ واقعی وہ حسین ہے! وہ یہ خواب بھی دیکھا کرتا تھا کہ عین جھیل کے وسط میں کھڑے ہوئے ایک صنوبر کی جڑوں پر وہ بیٹھا ہوا ہے جہاں پانی کی لہریں اس کو جھولا جھلا رہی ہیں، اور اسی حالت میں اس کو یہ لڑکی بھی نظر آتی ہے جو ایک ننھے سے جزیرے پر استادہ ہے اور ٹارڈ کو دیکھکر مسکرا رہی ہے! ایک رات کی خواب میں تو بالکل "معراج" ہی ہوگئی یعنی اُس نے دیکھا کہ لڑکی نے اُسکا بوسہ لے لیا! مگر "رویائے صادقہ" یعنی صبح بھی ہوگئی تھی اور برگ پرشور و کرخت آوازوں میں ٹارڈ کو جگا رہا تھا۔ فریب خوردہ خواب نے اپنی آنکھیں غنودگی کے عالم میں ارادۃً خوب ہی بند کرلیں تاکہ اس لذت انگیز خواب میں جہاں تک ممکن ہو طوالت پیدا کرے! مگر صد حیف کہ آخرکار نیند کی اس "سعی بے حاصل" کو اُسے ترک ہی کرنا پڑا۔

یہ عین لطف میں ہم کو جگا دیا کس نے ابھی تھے خواب میں انکو گلے لگائے ہوئے!

ٹارڈ اُٹھ بیٹھا مگر دن بھر اُس پر ایک سرشاری اور وارفتگی کا عالم رہا، لڑکی کے تصور میں وہ عملاً اب بھی محو خواب تھا! شام کے قریب اُس کے دل میں ایک خاص خیال آیا اور اُس نے برگ سے پوچھا:

"آپ اُس کا نام جانتے ہیں؟"

برگ نے تیز نگاہوں سے ٹارڈ کیطرف دیکھا۔ اور پھر فوراً بولا: "ہاں بہتر ہے کہ تم کو اُسکا نام جلد بتا دیا جائے، اُسکا نام اَن ہے، یہ ہماری رشتہ دار ہوتی ہے!"

معاً ٹارڈ کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی لڑکی ہے جو بالواسطہ برگ کی جلاوطنی اور صحرانوردی کی ذمہ دار ہے! پھر اس نے فوراً اپنے حافظے کے ذخیرہ کا جائزہ لینا شروع کیا اور جو کچھ چرچے اس لڑکی اَن کے متعلق وہ سنتا رہا تھا بیک وقت سامنے آگئے:۔

اُن ایک شریف کسان کی چہیتی لڑکی تھی اُس کی ماں مرچکی تھی اور والدہ کی وفات کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر کی حکمرانِ مطلق تھی۔ آزادی و خود مختاری کی یہ زندگی اُس کے مذاق کا عین مطالبہ تھا، چنانچہ اس نے عہد کرلیا تھا کہ کبھی شادی نہ کرے گی۔ برگ اور اَن رشتے کے بھائی بہن ہوتے تھے اور تمام آبادی میں معاملہ "افسانہ و بزم و انجمن" تھا کہ برگ کو اَن اور اس کی سہیلیوں سے ملنے جلنے میں خاص دلچسپی ہے اور بمشکل وہ اپنے مکان پر موجود رہتا ہے آخر میلادِ مسیح کی سالانہ ضیافت کا موقع آیا جس میں منجملہ دیگر مہمانوں کے برگ کی بیوی نے ایک راہب کو بھی مدعو کیا جس کے بلانے کی خاص غرض یہ تھی کہ اپنے خاوند سے اس کی زبانی اپنی سفارش کرائے اور اس کو جتائے کہ یہ کس قدر نازیبا بات ہے کہ برگ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک دوسری دوشیزہ پر نظر رکھتا ہے!

برگ اس راہب سے بہت نفرت کرتا تھا، برگ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے احساسات کا بھی اس شخص کے بارے میں یہی حال تھا۔ وہ ایک کریہہ المنظر آدمی تھا اگرچہ بہت توانا اور تنومند تھا، اُسکا قریبًا گنجا سر، کھوپڑی کے گرداگرد کا بالوں کا حلقہ، ابرو، بدن کے بال، ساری جلد، بدن یہانتک کہ اُس کا لباس بھی سب سفید ہی سفید تھے۔ ان سب چیزوں نے اسے بہت بدہیئت بنا دیا تھا۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ راہب ایک بیباک اور بے لاگ آدمی تھا اُس نے برگ کو نصیحت کرنی چاہی اور بہت پرزور قسم کی سرزنش۔ یہ سمجھکر کہ اگر علانیہ اس فعل پر تنبیہہ کیجائے تو زیادہ موثر ہوگی۔ اُس نے وہیں کھڑے ہوکر سارے جلسہ سے اس موضوع پر خطاب کرنا شروع کردیا۔

"حضرات! لوگ کوئل کو "سب سے شریر پرندہ" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے بچوں کو دوسری چڑیوں کے آشیانوں میں فریب کاری سے پرورش کراتی ہے، لیکن اس مجمع میں اسی طور طریق کا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس نے اپنے اہل و عیال کو اسی طرح توکل پر چھوڑ دیا

ہے اور خود اپنی ضیافت طبع کا سامان، ایک غیر محرم عورت کی ہم نشینی سے حاصل کرتا ہے! میں اس کو "سب سے زیادہ شریر انسان" کے خطاب سے پکارنا چاہتا ہوں!"

برگ ساکت وصامت بیٹھا رہا، لیکن اَن تلملا کر اُٹھ کھڑی ہوئی! اس نے کہا: "برگ! اس تقریر کے مشاق ایسے تم ہو اور ہیں! لیکن خیر میں تو یہاں بے یار و مددگار ہوں، میرا باپ حاضر نہیں ہے جو اس وقت میرے نام و ناموس کی حمایت کرتا، مگر سچ یہ ہے کہ میری ایسی ذلت آج تک نہیں کی گئی تھی" یہ کہکر وہ چل کھڑی ہوئی! برگ اُس کے پیچھے دوڑا!

"تم وہیں رہو اور میرے درپے نہ ہو، میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ سے تم کو نہ دیکھونگی!"

لیکن بہرحال برگ نے لڑکی کو برآمدہ میں جا پکڑا اور اُس سے کہا:

تم ذرا ٹھہرو تو، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری عزت وحرمت کو قائم رکھنے کے لئے مجھکو کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اس وقت تمہارا کیا فرض ہے!" اَن نے قہر آلود نظروں اور خون آشام آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

برگ وہیں سے پلٹا اور ہال میں آکر راہب کو قتل کر دیا!!

... .

یہ ساری گذشتہ داستان ایک لمعۂ برق کی طرح ٹارڈ کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ برگ اور ٹارڈ دونوں کے دماغ تھوڑی دیر کے لئے ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو گئے۔ اُس کے بعد برگ نے کہا:-

"غالباً جس وقت وہ راہب میرا چابک کھا کر گرا ہے تم وہاں موجود تھے اور اس واردات کے وقت اُن کو بھی تم نے دیکھا ہو گا۔ میری بیوی نے اپنے بچوں کو اپنے گرد سمیٹ لیا تھا اور اَن کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ایک بچے سے اُن کو پہچنوایا تھا، گویا وہ چاہتی تھی کہ جس عورت کی بدولت اس کا باپ قاتل بنا اس کی صورت سے آشنا ہو جائیں! اور ہمیشہ اس

کو یاد رکھیں! مگر اُنہ کمال بے پروائی اور وقار کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اور اُس وقت اس کے سراپا سے وہ شان جمال و جلال ہویدا تھی کہ لوگ دیکھکر مرعوب ہو گئے! اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں فوراً جنگل کو بھاگ جاؤں، لیکن اس آوارہ گردی کی زندگی میں قزاقی کے پیشہ پر نہ اتر آؤں، البتہ اپنا دہ چاقو اپنے پاس ضرور رکھوں اور اگر کبھی اسی قسم کے جائز انتقام کا موقع آئے تو اُس کے استعمال کرنے سے کبھی نہ چوکوں!"

"آپ کے اس بہادرانہ اور دفاکیشانہ عمل نے اس کی نطرت میں غالباً ایک رفعت پیدا کر دی!" ٹارڈ نے کہا:

"مگر برگ نے "حدیث دلبر" کو ٹارڈ ایسی حقیر ہستی کے سامنے دہرانے کے بعد پھر ایک سبکی اور بدمزگی محسوس کی! ٹارڈ ایک لامذہب وحشی تھا بلکہ اس کے دل و دماغ کی حالت اس درجے سے بھی فروتر تھی! وہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں کوئی تمیز نہ جانتا تھا، وہ انسان کے اعمال کے لئے کسی اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہ رکھتا تھا، جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا، اُس کے لئے گذشتہ افعال پر کسی ندامت کا خیال ایک بے معنی سی بات تھی! اگرچہ وہ خدا سے واقف تھا، مسیح سے بھی بے خبر نہ تھا، اولیا و بزرگان دین سے بھی قدرے آشنا تھا لیکن محض یہ نام ہی اُس کے گوش زد ہوئے تھے اور اس کے آگے وہ کورا تھا۔ دراصل اپنے وطن یعنی جزائر شیرن کے بھوت پریت اس کے خدا تھے اسکی ماں ایک پکی جادوگرنی تھی اور اُسنے ٹارڈ کو مردوں کی ارواح ہی پر ایمان لانے کی تلقین کی تھی۔

برگ سے ایک ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تھی لیکن ٹارڈ اس کے عیب و صواب کو سمجھنے کا بالکل نااہل تھا۔ برگ نے اس کندۂ ناتراش کی آنکھیں کھولیں اور خدا کے قہر و جلال سے اس کے دماغ کو آشنا کرنا چاہا۔ اُس نے بتایا کہ خدا ایک قادر مطلق ہستی، ایک احکم الحاکمین ذات ہے۔ بُرے افعال کے مرتکبین اور ریاکار گناہگاروں کو وہ جہنم کے دائمی عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔ پھر برگ نے اُس کو حضرت مسیح اور انکی مقدس والدہ کنواری مریم کی محبت اور عظمت کی تبلیغ

کی، اور اُن تمام اولیا، انبیا، کا ذکر کیا جو خدائے ذوالجلال کے تخت کبریائی کے سامنے سربسجود رہتے ہیں اور خطا کاروں کی بخشش کے لئے شفاعت کرتے رہتے ہیں۔ اس نے وہ تمام آداب و مناسک بتائے جو نوع بشر کو خدا کی آتش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تعلیم کئے گئے ہیں۔ اس نے مقامات مقدسہ کو جوق جوق جانیوالے اُن حجاج کا ذکر کیا جو ہمیشہ وہاں کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔ اُس نے اُن استغفار کرنیوالوں کے بھی تذکرے سنائے جو اشک ندامت سے اپنے دامن کو تر کرتے رہتے ہیں اور اُن پاکباز اور خدا پرست بزرگوں کا بھی ذکر خیر کیا جنہوں نے اپنے تقوے کے سلسلے میں ساری لذائذ دنیوی کو خیرباد کہدیا ہے۔

ٹارڈ کا چہرہ ان ترہیبوں اور وعیدوں سے زرد ہوا جاتا تھا۔ خوف و خشیت کی اس حالت میں اُس کو اُسکی خیالی تصویروں کے مناظر پھر نظر آنے لگے۔ برگ اپنے وعظ کو اب ختم کر دیا لیکن وہ اپنے خیالات کی رو میں بے اختیار بہا چلا جا رہا تھا۔ اسی ذکر و فکر میں رات کا سیاہ پردہ پڑ گیا اور وہ اس تغیر وقت سے قریبًا بے خبر رہے۔ جنگل کی کالی رات تھی جس کے ہولناک سکوت کو اُلو کی عفریتی بولی وقتًا فوقتًا توڑتی رہتی تھی! اس پر ہیبت فضا میں اُنکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خدا بالکل اُنکے قریب آگیا ہے، اُس کے تخت جلال نے ستاروں کو ماند کر دیا ہے، اور آسمان کے انتقامی فرشتے کوہستان کی بلندیوں پر نازل ہو رہے ہیں! پہاڑ کے میدانی دامن میں بھی نشیب کے رہنے والوں کی آتش گاہوں کے شعلے اوپر کی طرف لپکتے ہیں اور مجرموں کی اس تنہا جائے پناہ کو بھی جلا ڈالنا چاہتے ہیں!!

. . .   .

خزاں آئی اور اس کے ساتھ طوفان۔ ٹارڈ تنہا جنگل میں گیا تاکہ شکار کے جالوں کو ٹھیک کر کے بچھا دے۔ برگ گھر ہی پر رہا اور اپنے لباس وغیرہ کی مرمت کرتا رہا۔ ٹارڈ کا راستہ ایک سلامی دار پہاڑی پر سے تھا جس پر خزاں زدہ درختوں کی پتیوں کا فرش تھا جو ہوا کی گردش سے ایک مدور حلقے میں چکر کھا رہی تھیں۔ بار بار ٹارڈ کو یہ واہمہ گزرتا تھا کہ کوئی اُس کے پیچھے آرہا ہے

وہ کئی دفعہ مڑا لیکن جب دیکھا کہ صرف ہوا ہے اور کچھ نہیں، تو پھر آگے بڑھا۔ جب پے در پے کھٹکا ہوتا تو بعض دفعہ وہ اکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ڈرانیوالے خس و خاشاک کو گھونسہ تانکر ڈانٹتا! لیکن اس کی وہمی صورتوں نے اُسکا تعاقب نہ چھوڑا۔ چنانچہ اُس نے دیکھا کہ ایک اژدہا اُس کے پیچھے جھپٹا ہوا آرہا ہے، اور اُسی کے پہلو میں ایک بلند قد خونخوار بھیڑیا ہے جو اس موقع کا منتظر ہے کہ ذرا ٹارڈ کی آنکھ جھپکے اور وہ تڑپکر اُسکی گردن دبائے! ٹارڈ نے جلدی جلدی قدم اٹھانا شروع کیا لیکن ساتھ ہی ان موذیوں نے بھی اپنی رفتار تیز کی! جب اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل اُس کے سر پر آگئے ہیں۔ تو وہ کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا، لیکن وہاں سوائے خواب و خیال کے اور کیا تھا؟! آخر وہ سر راہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس مسلسل وہشت اور تھکاوٹ سے تھوڑا آرام لینا چاہا۔ درختوں کی پتیاں ہوا کی جنبش سے اب بھی اس کے قدموں میں مصروفِ رقص تھیں۔ سارے جنگل پر خزاں کی ہمہ گیری سے ایک عالم فنا طاری تھا۔ سوکھے پتوں اور خشک گھاس کی جڑوں کے انبار در انبار تھے۔

"تم سب گناہگار ہو، سُنا!" ٹارڈ نے خزاں کی تاراج شدہ اس ساری مخلوق کو خطاب کر کے کہا "اور ہم انسان بھی سب گناہگار ہیں! کوئی شئے خدا کی نظر میں معصوم نہیں کوئی وجود اتنی پاکی نہیں رکھتا جو آسمانی معیار کو پورا کر سکے! تم بھی خدا کے غصے کی آگ میں جلا دی گئی ہو!"

ٹارڈ آگے بڑھا۔ اگرچہ بظاہر کچھ معلوم نہ ہوتا تھا لیکن سارا جنگل اس کے سامعہ کو ایک طوفانی سمندر کی طرح موجیں مارتا سنائی دیتا تھا۔ اس نے اب کچھ ایسی آوازیں سنیں جن سے اس سے قبل اس کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے! تمام جنگل آوازوں سے پرشور تھا! کبھی کچھ سرگوشیاں سی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ایک خفیف درد خیز نالہ سا سنائی دیتا تھا، کبھی ایک زبردست ڈانٹ ہوتی تھی اور کبھی ایک قہر آلود گرج! کبھی قہقہے تھے اور کبھی کراہنے کی آوازیں! سینکڑوں ہزاروں گلے آوازیں پیدا کرتے معلوم ہوتے تھے! یہ پُر اسرار اور

ناقابلِ فہم شور و شر ٹارڈ کو دیوانہ بنائے دیتا تھا! اس کا ہر بن مو کانپنے لگا! غیر مرئی تعاقب کرنیوالوں کی ہنگامہ خیزی سے سارے جنگل میں ایک غوغا بپا تھا! شاخوں کا ٹوٹنا، آدمیوں کے قدموں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکار اور انکی وحشیانہ اور خونخوارانہ چیخ پکار سے ٹارڈ کی روح فنا ہوئی جاتی تھی!

صرف ایک طوفان ہی نہ تھا جو ٹارڈ کے گرد قیامت برپا کر رہا تھا بلکہ ایک شے اور بھی تھی یعنی ایسی عجیب وغریب آوازیں اس کے گوش زد ہو رہی تھیں جن کی تعبیر اس کے لئے بالکل ناممکن تھی اور یہ بات اس کی دہشت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اس نے اس سے قبل بڑے بڑے محشر سامان طوفان دیکھے تھے، لیکن اس نے کبھی بادِ صرصر کو اس طرح سینکڑوں تاروں اور پردوں پر ساز نوازی کرتے نہ سنا تھا! ہر شجر اپنے برگ وبار میں ایک زبانِ تکلم رکھتا تھا، ہر وادی ایک خاص نغمہ سے ترنم ریز تھی، اور مختلف آوازیں اور شور، پہاڑ کی سنگین دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی صدائے بازگشت الگ پیدا کر رہے تھے! بیرونی دنیا کے اس شور ستان نے ٹارڈ کے دماغ کے اندر بھی ایک سخت تلاطم پیدا کر دیا تھا!

صحرا کی تاریکی اور تنہائی میں اس کو ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا۔ وہ صاف وشفاف سطح بحر اور کوہستان کی برہنہ چوٹیوں سے ایک محبت اور عقیدت رکھتا تھا، ایسی فضا میں اس کو بھوتوں اور روحوں کے سائے ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس وقت اس کے تخیلہ نے محسوس کیا کہ شورش آواز اور طوفان تکلم کی اس تمام ہنگامہ آرائی میں خود خدا اپنی جلالی گفتگو کر رہا ہے، وہی خدائے منتقم اور مالک یوم الحساب جس کی ذات وصفات کا تھوڑے دن پیشتر برگ نے اس کے دل ودماغ کو تعارف کرایا تھا یقیناً خدا ہی اس کے تعاقب میں ہے اور گناہ اسکا یہ ہے کہ وہ برگ ایسے سیاہکار کا ہمدم ودمساز ہے۔ شاید خدائے قہار کی مرضی اس امر کی تقاضا کر رہی ہے کہ وہ ایک مقدس راہب کے قاتل کی رفاقت کو ترک کر دے تاکہ تنہا اصلی ملزم ہی اس کے عتاب کا

ہدف بنے!

چنانچہ ٹارڈ بلند آواز سے اس معنی خیز طوفان سے خطاب کر کے گفتگو کرنے لگا۔ اُس نے خدا سے عرض کی کہ وہ اس کے نشا کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہے لیکن عمل کے میدان میں وہ اپنے کو بہت معذور پا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ "میں نے بارہا یہ جرأت کرنی چاہی ہے کہ برگ کو تنبیہ کروں کہ وہ اپنے خدا سے اپنا معاملہ صاف کرے، لیکن مناسب الفاظ کی تلاش میں میری زبان پیچ و تاب کھا کے رہ گئی اور مجھ پر ایک اضطراب و انتشار نے غلبہ کر لیا۔ جب سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دنیا پر ایک خدائے عادل کی حکومت ہے اُس وقت سے میں سمجھ چکا ہوں کہ اس برگ کی خیر نہیں۔ میں نے اپنے اس محبوب دوست کے بُرے حشر کو یاد کر کر کے ساری ساری راتیں نالہ و فریاد کرنے میں گزار دی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہیں جا کر چھپے خدائے علیم و خبیر کی نظر سے کوئی جائے پناہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتی۔ لیکن مجھ میں اُس کے سامنے تاب گفتگو نہیں۔ اس کی محبت میری زبان کو گُنگ کر دیتی ہے۔ پس اے خدائے رحیم مجھکو اس فریضہ سے بری کر دے کہ اس معاملہ میں میں اپنی زبان کو اُس کی اصلاح حال کی دعوت کے لئے کھولوں۔ اس حقیر و ناچیز سے یہ عزم و ہمت قطعًا ناممکن ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میدان کی پست سطح بلند ہو کر کوہستان کی چوٹی تک پہنچ سکے؟!"

ٹارڈ اتنا کہکر خاموش ہو گیا۔ ساتھ ہی طوفان پر بھی جس میں خدا کی زبان گویا تھی ایک عالم خموشی طاری ہو گیا۔ ہوا یکبارگی ساکن ہو گئی اور فی الفور آفتاب نکل آیا! ادھر کشتی کے تیواروں کی آواز آنے لگی، اور جھاڑیوں میں سے ایک ملائم سرسراہٹ سنائی دی۔ لطیف و شیریں آوازوں نے پیدا ہو کر پیاری اُن کی یاد کو تازہ کر دیا!

اب طوفان پھر شروع ہوا اور اب کی دفعہ تازہ شدت سے ٹارڈ نے قدموں کی آوازیں اپنے عقب میں سنیں۔ اُسکا دل سینہ میں تڑپنے لگا!! اس مرتبہ اس کو قطعًا ہمت نہ ہوئی

کہ پیچھے مڑکر دیکھے کیونکہ اس کو از روئے یقین محسوس ہونے لگا کہ خود وہ شہید یعنی سفید پوش راہب ہی اُس کے تعاقب میں ہے! وہ برگ کے ہاں کے ایوان ضیافت سے آرہا ہے، پیشانی پر تبر کا زخم ہے اور سارا بدن خون میں چور نگ ہے! اور ٹارڈ کو یہ آواز سنائی دی کہ "قاتل کا پتہ بتادو، اس کو حوالہ کردو، اور اپنی روح کو بچالو!"

ٹارڈ بھاگ کھڑا ہوا! اب دہشت وہیبت کی انتہا نہ رہی تھی۔ لیکن اُس نے اپنے پیچھے ایک خوفناک تعاقب دیکھا۔ خدائے ذوالجلال کی آواز مصروف تنبیہہ تھی، اور مجرم کی حوالگی کا مطالبہ کررہی تھی۔ ٹارڈ کو اپنی اعانتِ مجرمانہ کی سنگین حقیقت بڑی شدت وخشیت سے محسوس ہونے لگی۔ کیوں نہ ہو! ایک معصوم بندۂ خدا قتل کیا گیا تھا۔ کلیسا کے ایک مقدس خادم کے فولاد سے ٹکڑے کردئے گئے تھے! اور پھر غضب یہ کہ یہ جانستان قاتل زندہ سلامت پھر رہا تھا اور ہنوز اپنے گناہ کی پاداش کو نہ پہنچا تھا۔ وہ آفتاب کی روشنی، کرۂ باد کی ہوا، زمین کے باغوں کے پھلوں، ان ساری نعمتوں سے برابر متمتع ہورہا تھا حالانکہ ناکردہ گناہ راہب خاک و خون میں تڑپا دیا گیا تھا! آخر ٹارڈ کے قدم رُک گئے، اس کی مٹھیاں سختی سے بند ہوگئیں، اور وہ ایک ایسی آواز سے چیخ اٹھا جس میں خوف اور دھمکی کا لہجہ ملا ہوا تھا۔ اور ایک لمحہ ٹھر کر وہ پھر سر پر پاؤں رکھکر فرار ہوا اور آخر کار خوفناک جنگل کی اُس وادی ہلاکت سے نکل گیا!

جب ٹارڈ اپنے غار میں واپس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ برگ پتھر کی میز پر بیٹھا ہوا اپنا کپڑا سی رہا ہے۔ آگ کی روشنی دُھندلی ہورہی تھی اور برگ کو سوئی کے اس کام میں دقت محسوس رہی تھی۔ برگ کو دیکھکر ٹارڈ کا سینہ رحم سے لبریز ہوگیا۔ یہ دیو ہیکل اب اس کو ایک حقیر، ناشاد، اور بد انجام ہستی معلوم ہوتا تھا!

"کیوں، کیسے حال ہیں؟! کچھ طبیعت ٹھیک نہیں؟ یا کہیں ڈر گئے ہو؟" برگ نے پوچھا۔

پہلی دفعہ ٹارڈ نے اپنے روحانی دغدغہ کا اظہار کیا، اُس نے کہا :-

" آج جنگل میں میں نے عجیب ماجرے دیکھے ہیں، روحیں دیکھیں، اُنکے آواز سنے، اور اُس سفید راہب کو دیکھا! "

" کیا کہہ رہا ہے ؟ لڑکے! "

" اجی نہیں! انہوں نے سارے راستے میرا تعاقب کیا ہے، اور شور و غوغا تکلم و نغمہ نے قدم قدم پر مجھکو پریشان کیا ہے۔ میں بار بار اپنی جان لیکر بھاگا لیکن وہ ایک بلائے مبرم کی طرح ہر دم میرے سر پر سوار رہیں، میرے پاس کیا چارہ تھا ؟ "

" کچھ پاگل ہو گئے ہو آج ؟! " برگ بولا -

ٹارڈ اب بے دھڑک ہوکر بولا، اور اُس نے مطلق اس بات کی پروانہ کی کہ کیا لفظ اُس کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ اسکا تکلف و حجاب سب جاتا رہا اور اس کی تقریر میں خود بخود روانی آگئی۔ اس نے کہا:

" سنئے! مجھکو کوئی فریب حواس نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا کچھ خواب اور افسانہ نہیں تھا۔ روحیں فی الواقع موجود تھیں اور وہ سب اُس راہب کی ہم رنگ و ہم لباس تھیں! اُن سب کے کپڑے بھی خون سے داغدار تھے۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنے سروں کے ساتھ گھونگھٹ سے کر رکھے تھے لیکن پھر بھی ہر ایک کی پیشانی پر سرخ زخم نمایاں تھا! تبر کا یہ زخم ایسا ہویدا اور کچھ ایسا فراخ منہ رکھتا تھا کہ کسی پردے کے پیچھے چھپائے چھپتا نظر نہ آتا تھا!

برگ زرد پڑ گیا، اور کچھ سوچنے لگا!

" ٹارڈ " اُس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا، " مقدس اولیا ہی اس بات کو بہتر جانتے ہیں کہ تم کو یہ زخم تبر کے زخم کیوں نظر آئے! میں نے تو راہب کو چاقو سے مارا تھا! "

ٹارڈ کھڑا ہوا ہے اور اپنے تخیلات سے خود ہی کانپ رہا ہے۔ آخر وہ کہتا ہے:

" آپ سنتے ہیں! وہ مجھ سے آپ کو طلب کرتے ہیں! اور غالباً وہ مجھکو مجبور کر دیں گے

کہیں آپ کا راز فاش کر دوں!"

"کون؟ راہب لوگ؟"

"جی ہاں راہب۔ وہ مجھکو طرح طرح کی صورتیں دکھاتے ہیں، انہوں نے مجھکو کئی بار اُن کی صورت بھی دکھائی ہے۔ وہ مجھکو وسیع سمندر کا نظارہ دکھاتے ہیں، وہ مجھکو ماہی گیروں کی قیامگاہیں دکھاتے ہیں جہاں ناچ کود اور جشن و خوشی ہوتا نظر آتا ہے۔ میں ان مناظر کی دہشت انگیزی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں لیکن وہ برابر میری چشم تخیل کے سامنے رہتے ہیں۔ میں ان سے التجا کرتا ہوں کہ للہ مجھے معاف کر دو! بیشک میرا دوست قتل کا مرتکب ہوا ہے لیکن وہ آدمی برا نہیں ہے، اگر آپ مجھے اس تعاقب سے آزاد چھوڑ دیں گے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے قصور پر نادم ہو اور اپنے گناہ کا کوئی کفارہ کرے۔ وہ اپنے جرم کا ضرور معترف ہو جائے گا اور اپنا نامہ اعمال دھونے کے لئے بیت المقدس کی زیارت کر آئیگا"

"اچھا پھر اس پر راہبوں نے کچھ جواب دیا؟" برگ نے پوچھا "غالباً وہ مجھے معاف کرنا نہیں چاہتے، وہ مجھکو بہت عذاب انگیز سزا دینا چاہتے ہیں اور مجھکو زندہ آگ میں جھونکدینے کی نیت رکھتے ہیں!"

ٹارڈ بطور خود اس موقع پر یہ گفتگو شروع کرتا ہے:

"ایں! کیا میں اپنے دوست کیساتھ غداری کروں گا؟! وہ روئے زمین پر میری تنہا دولت ہے! اس نے مجھکو ریچھ کے حملے سے اُس وقت بچایا ہے جبکہ اُس خونخوار درندے نے اپنے پنجے میرے گلے پر رکھدئے تھے! ہم دونوں نے اس صحرائی زندگی کی سرد و گرم کو ساتھ ساتھ چکھا ہے۔ جب میں بیمار ہوا تھا تو اس نے خاص اپنے کپڑوں سے میرے لئے بستر تیار کیا تھا! ہاں میں نے بھی کس محبت اور خلوص سے اُس کی خدمتیں کی ہیں! میں اُس کے لئے ایندھن اور پانی لایا ہوں، میں نے راتوں اُس کے بستر خواب پر پہرہ دیا ہے! اُس کے دشمنوں نے جب اسکا تجسس اور تعاقب کرنا چاہا ہے تو میں نے انکو غلط راستہ پر ڈال ڈال دیا ہے اور

اُس کا سراغ لگانے سے انکو باز رکھا ہے۔ اُن کو کیونکر یہ گمان ہو سکا کہ مجھسے اپنے ایسے محبوب اور محترم دوست کے خلاف خیانت کرنا ممکن ہے؟! ہاں میرا دوست خود ہی پادری کے پاس چلا نہ جائے گا، اپنے گناہ کا اُس کے سامنے اعتراف کرے گا، اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ نجات و مغفرت حاصل کرلیں گے!،،

برگ نے غور و تامل سے ٹارڈ کی تقریر کو سنا، وہ اُس کے چہرے کا بڑی تجسسانہ نظروں سے جائزہ لے رہا تھا!

بہتر یہ ہوگا کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ اور اُس سے سارا واقعہ سچ سچ بیان کردو ہاں اچھا ہے کہ نوع بشری میں تم واپس چلے جاؤ۔

اکیلے میرے جانے سے بھلا کیا ہوگا؟ میں یہاں سے تنہا کہیں نکلتا ہوں تو مردوں کی روحیں محض آپ کی رفاقت و حمایت کیوجہ سے بُری طرح میرا تعاقب کرتی ہیں، اور کچھ اس طرح میرے درپے اور مجھ سے دست و گریباں ہوتی ہیں کہ جب میں انکے زغے سے چھوٹکر یہاں آپ کے سامنے آتا ہوں تو میرے سارے بدن پر رعشہ ہوتا ہے! تم نے بھی تو غضب کیا ہے! تم نے گویا خود خدا پر ہاتھ اٹھایا ہے! تمہارے گناہ سے بڑھکر کون گناہ کبیرہ ہوگا؟! میں جو تم سے اس وقت یہ مواخذہ کر رہا ہوں یہ تمہاری ہی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے۔ تم نے خدا کے عدل و انصاف اور اُس کے انتقام و سزا کا حال مجھ سے کیوں بیان کیا؟ آج تم ہی ہو کہ مجھکو اپنے سے بیوفائی اور بے مروتی کرنے پر مجبور کر رہے ہو! مجھے معاف کرنا اگر میں ایسا کام کر گزروں! تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ!،، ٹارڈ یہ تقریر ختم کرکے برگ کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

مجرم قاتل نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور بغور اس کی طرف دیکھا! وہ اپنے اس رفیق کے جوش و خروش اور خوف و خشیت کو اپنے جرم کی سنگینی کا معیار و میزان سمجھ رہا تھا اور اب ٹارڈ پر اس قسم کے آثار بہت ہی شدید و عمیق ہوگئے تھے! برگ نے محسوس کیا کہ وہ واقعی

خدا کا باغی ہے۔ وہ غم و حسرت سے لبریز ہوگیا!

"حیف ہے مجھپر کہ میرے ہاتھ سے یہ فعل صادر ہوا! اور یہ کس قدر کوفت اور کلفت کی زندگی ہے جو میں یہاں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں شب و روز کی دہشت اور دغدغہ میں بسر کر رہا ہوں! کیا اس وحشی زندگی کی یہ ساری مصیبتیں اور بے سروسامانیاں میری طرف سے کافی کفارہ گناہ نہیں ہیں؟! کیا میرے ہاتھ سے اپنا گھر بار اور ساری دولت نہ گئی؟ کیا میں اپنے دوستوں کی صحبت سے ہمیشہ کے لئے منقطع نہیں ہوگیا؟ کیا زندگی کی اُن ساری مسرتوں کا دروازہ مجھپر بند نہیں ہوگیا جن کی وجہ سے زندگی زندگی ہوتی ہے؟! مجھ سے اب اور کیا چاہا جاتا ہے؟!"

ٹارڈ یکبارگی اچھل کھڑا ہوا۔ "اچھا! تم کو بھی ندامت ہونے لگی! میرے لفظوں نے آخر کار تمہارے دل میں بھی رقت پیدا کی! اچھا، آؤ میرے ساتھ چلو، ہاں چلو کہ ابھی وقت ہے!"

برگ وحشت زدہ ہوکر اٹھ کھڑا ہوا! "ایں یہ لوگ کیسے؟! ٹارڈ! یہ کام۔ تم نے کیا؟"

"ہاں، ہاں میں نے! یہ میں نے ہی تمہارے ساتھ دغا کی ہے! لیکن اب بھاگ چلو! تمہاری گرفتاری اور سزایابی کی اب ضرورت نہیں ہے جبکہ تم کو اپنے کام پر نادم ہونیکی توفیق پیدا ہوگئی ہے! ہاں ہم کو ضرور بھاگ جانا چاہئے اور ہم نکل بھی سکتے ہیں۔"

قاتل برگ زمین پر اس جگہ جھکا جہاں اُسکا آبائی تبر پڑا ہوا تھا۔ "چور کے بچے!" اُس نے زیر لب آواز میں کہا، "میں نے تجھپر اعتبار کیا! تجھ سے محبت کی!"

ٹارڈ نے برگ کی مخدوش حرکت کو بھانپا! اس نے سمجھ لیا کہ پہلا وار میرے ہی اوپر ہے! چنانچہ جلدی سے اس نے بھی اپنا خنجر کمر سے کھینچ لیا اور قبل اس کے کہ برگ کھڑا ہو اُس کو اُسکے جسم میں پیوست کردیا! دیوہیکل برگ فوراً زمین پر آرہا اور غار کے دہانے سے خون کا ایک چشمہ بہنہ نکلا! برگ کی گردن پر اُلجھے ہوئے بالوں کے نیچے ٹارڈ کو ایک گہرا زخم منہ کھولے نظر آنے لگا!

اتنے میں دیہاتیوں نے زرغہ کرکے اُنکا محاصرہ کرلیا۔ انہوں نے ٹارڈ کی اُس کی کارگذاری پر بہت تعریف کی اور اس سے کہا کہ اُس نے اپنے قصور کی معافی کا حق حاصل کرلیا ہے۔

ٹارڈ کو اپنی قید و بند کے دہشت ناک خواب آنے لگے۔ اُس کے قدیم توہمات اس وقت پھر تازہ ہوگئے، اور جنگل کے پُر اسرار طوفان میں اس نے جو جو عجائب و غرائب دیکھے تھے اور جو جو ناقابل فہم آوازیں اور نغمے سنے تھے اس ساری واردات کی طرف اُس کا دماغ منتقل ہوگیا۔ سارے شجر و حجر پھر اس سے گفتگو کرتے نظر آنے لگے اور وہ کل حیرت خیز داستان اپنے کو پھر دُہرانے لگی۔

ٹارڈ برگ کی لاش کے سامنے بیٹھکر زار و قطار رونے لگا۔ وہ اس سے بیتاب ہوکر التجائیں کرنے لگا کہ وہ اپنی موت کی نیند سے اُٹھ کھڑا ہو۔ دیہاتیوں نے اپنے نیزوں سے ایک ٹھٹری سی بنائی اور اس پر ڈالکر مقتول قاتل کو لیجانا چاہا۔ خوفناک برگ کی لاش کو اٹھاتے ہوئے انکے دل مرعوب ہوگئے اور انکے واہمہ نے اُس کے اعضا میں زندگی کی حرکت دیکھی! جب جنازہ اٹھایا گیا، ٹارڈ کے منہ سے نکلا:

"خدا بہت بڑا ہے!"

رخصتی کے وقت ٹارڈ نے لرزتی ہوئی آواز میں مجمع کو یہ پیام دیا:

"اُن سے کہدینا، اُس اَن سے جس نے برگ کو قاتل بنا کر دیس نکالا دلوایا تھا، کہ برگ کو ٹارڈ نے، اُس ٹارڈ نے جس کا باپ طوفان زدہ جہازوں کے مسافروں کو لوٹنے کا پیشہ کرتا ہے اور جس کی ماں ایک جادوگرنی ہے قتل کر دیا، کیونکہ برگ ہی نے ٹارڈ کو یہ بتایا تھا کہ عدل و انتقام خدائے ذوالجلال کے زمین و آسمان کا سنگ بنیاد ہے!"

غزل

از حضرت دَرد کاکوروی

آہ کروں تو کس طرح ضبطِ فغاں سے کام ہے
عشق کی اصطلاح میں صبر اسی کا نام ہے

یہ تو دلِ حزیں ترا عشق پہ اتّہام ہے
دید ہو کس طرح تجھے شوق ہی ناتمام ہے

مردمِ چشمِ حق ہے جو جلوہ نما ہے ہم میں وہ
ہے یہ وہی کرشمہ ساز، روح اُسی کا نام ہے

شوق جو ہو صفات کا دہر یہ ہو فریفتہ
ذات کا ہو جو شیفتہ اس کو طلب حرام ہے

خلوتِ دل میں میری جاں میرے سوا کوئی نہیں
تارِ نفس پہ آیا آج، یار کا یہ پیام ہے

یار ہے تیرے جلوہ کی، جب نہیں کوئی انتہا
حسنِ وصال بھی ترا، جلوۂ ناتمام ہے

مستوں میں تیرے آجکل بیخودی اس بلا کی ہے
ہوش نثارِ شیشہ ہے، عقل فدائے جام ہے

حسنِ ازل کے ناز اٹھا قیدِ مجاز سے نکل
عشق کی یہ تو بوالہوس منزلِ ناتمام ہے

عاشقِ خستہ قلب کا حسن کی بارگاہ میں
جذبۂ دل سلام ہے، آہِ رسا پیام ہے

مے کی کسے ہے جستجو، جام کی کس کو ہے ہوس
ساقی کی ہر نگاہ خود گردشِ دورِ جام ہے

دَرد جگر کی ہر کھٹک جاذبۂ وصال ہو
جلوۂ حسن یار سے عشق کا یہ پیام ہے

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے

متاعِ[1] حسن عیش جاوداں معلوم ہوتی ہے
تری رونق بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

زبانِ عشق چپ ہے راز الفت آشکارا ہے
خموشی ترجمانِ بے زباں معلوم ہوتی ہے

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن
حیاتِ غم، حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

کبھی جو آرزو نقش و نگارِ صفحۂ دل تھی
وہی سینہ پہ اب سنگ گراں معلوم ہوتی ہے

یہ ڈر ہے رازِ دل افشا نہ ہو جائے کہیں یا رب
نگاہِ دوست اب کچھ مہرباں معلوم ہوتی ہے

ابھی ہے دور سرحد لذتِ دردِ نہانی کی
ابھی تو لذتِ دردِ نہاں معلوم ہوتی ہے

بھرے آتے ہیں آنسو سن کے حالِ گریۂ بلبل
ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

خدا معلوم کتنے اور کیسے غم اٹھائے ہیں
ہنسی بھی دردمندوں کی فغاں معلوم ہوتی ہے

ہجومِ غم کی دل پر آج کل ایسی کشاکش ہے
متاعِ زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے

غمِ دنیا و دیں سے دل کو اس نے کر دیا فارغ
تری الفت انیسِ بیکساں معلوم ہوتی ہے

زباں پر حالِ دل آئے جلیل اسکی ضرورت کیا
مری ہستی مجسم داستاں معلوم ہوتی ہے

---

(۱) کیٹس کے مشہور شعر:-

A thing of beauty is a joy for ever:
——————————; it will never
Pass into nothingness ; ——————

کو ذہن میں رکھئے (قدوائی)

تنقید و تبصرہ

کتب :- سیرۃ الرسول ۔ مترجمات ۔ زرگل

سیرۃ الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) | جامعہ کی کتابوں میں سے جو سب سے زیادہ مقبول ہوئیں تاریخ الامت کا پہلا حصہ سیرۃ الرسول بھی ہے۔ یہ کتاب دراصل طلبہ کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھی لیکن ملک میں اس قدر مشہور ہوئی کہ عام مسلمانوں نے طلبہ سے زیادہ اسکا مطالعہ کیا اور اسی لئے اس کے کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ گذشتہ سال یہ کتاب بہت سے اسلامی مدارس اور گورنمنٹ کالجوں کے نصاب میں داخل ہوگئی تھی اس لئے اب اس کا سائز چھوٹا کرکے نیا ایڈیشن طبع کرانا پڑا ہے۔ قیمت بھی بجائے عہ کے ۱۲ر کردی گئی ہے۔ نیا ایڈیشن بعد ترمیم اور تصحیح شائع ہوا ہے، ہم یہ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سیرۃ الرسول طلبہ اور عام مسلمانوں کے کام کی کتاب ہے۔ اور اب جب کہ مکتبہ جامعہ نے قیمت میں بھی تخفیف کردی ہے یہ بہت آسان ہوگیا ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔ مکتبہ جامعہ نے سیرۃ الرسول پر بچوں کے لئے جو مفید سلسلہ شائع کیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ تمام مدارس کے نصاب میں داخل ہو کہ طلبہ کا بھی اس میں فائدہ اور مکتبہ جامعہ کی بھی ہمت افزائی ہے۔

مترجمات | جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی نے اپنے مختلف مضامین کو جو ملک کے علمی و ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں مرتب صورت میں شائع کرنیکی توجہ فرمائی ہے مترجمات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں انہوں نے اپنے تمام مختصر علمی تراجم کو جمع کر دیا ہے ان میں سے اکثر مضامین مرحوم رسالہ زبان منگلور میں مترجمات کے زیر عنوان شائع ہو چکے ہیں مضامین اکثر و بیشتر علمی ہیں اور ان کا مطالعہ اردو داں حضرات کے لئے ہر نہج مفید ہے۔ قاضی صاحب کو ترجمہ

کا اچھا سلیقہ ہے اس کتاب سے اُنکی یہ مہارت آشکارا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر کچھ فروگذاشتیں ہوگئیں جو چنداں قابل لحاظ نہیں مثلاً صفحہ ۴۹ کچھ عرصے کے پہلے صفحہ ۵۰ بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے مطالبہ کا اسقدر انکار کیا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جگہ پیداوار کی جگہ پیداواروں لکھدی ہے۔ اسی طرح کے دو چار رسامحات اور بھی ہیں ہمیں توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان تمام خرابیوں کو دور کردیا جائے گا۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۷ صفحے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی

(زرگل) یہ قاضی احمد میاں صاحب کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر آگرہ کے مشہور ادبی رسالہ مرحوم نقاد میں شائع ہوچکے ہیں، قاضی صاحب کا ادبی مذاق بہت ستھرا ہے ان مضامین میں انہوں نے سلیم المذاقی کا پورا ثبوت دیا ہے یوں تو اس رسالہ کا ہر مضمون مطالعہ کے لائق ہے مگر " افسانہ قمر "، " عورت سے "، " کہاں ہے ہندوستان "، " دبستان حیات "، " خیالات کالیداس " یہ مضامین خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۸۴ کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت غالباً ۶ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

شذرات

پچھلے مہینے کے پرچے میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ امیر جامعہ بھوپال حیدرآباد اور میسور کے دورے پر تشریف لے گئے ہیں تاکہ ان مقامات پر اپنے احباب کے حلقے میں جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ پرچہ چھپنے کے لئے مطبع میں جا چکا تھا اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ممدوح کیساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے علاوہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب سابق شیخ الجامعہ بھی تشریف لے گئے ہیں۔ ہم جس طرح ڈاکٹر انصاری صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بہت مالی نقصان برداشت کر کے اور بڑی زحمت اٹھا کر جامعہ ملیہ کی خدمت کے لئے ایک مہینے کا وقت نکالا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے بھی ممنون احسان ہیں کہ وہ سال بھر کی محنت کے بعد تعطیل کے زمانے میں آرام کرنیکے بجائے جنوبی ہند میں جامعہ کا پیام پہنچانے تشریف لے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کو جامعہ ملیہ سے جتنی محبت ہے اور اس کے مقاصد کی جتنی قدر انکے دل میں ہے اسکا اندازہ ناواقف لوگ مشکل سے کر سکتے ہیں۔ موصوف نے کئی سال سے اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے سبب سے سیاسی جدوجہد سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی ہے لیکن ملک و قوم کی تعلیمی ترقی سے انکی دلچسپی بدستور باقی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گی۔

وسط ستمبر میں وہ المناک سانحہ پیش آیا جس کا مدت سے خوف تھا یعنی جتندرناتھ داس نے لاہور کی جیل میں مسلسل فاقہ کشی کے صدمے سے جان دے دی۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس جواں مرگ کا ماتم سارے ملک میں کیا گیا۔ تقریباً ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں نے اس حسرتناک موت پر آنسو بہائے۔ اکثر شہروں میں دن بھر دکانیں بند رہیں، ماتمی جلوس نکالے گئے تعزیتی جلسے کئے گئے۔ غرض جن طریقوں سے مجروح دل کے دردِ نہاں کا تھوڑا بہت اظہار ہو سکتا ہے سب اختیار کئے گئے۔

مگر ملک کے تمام ذمہ دار رہنماؤں نے سوائے معدودے چند شعلہ مزاجوں کے ایسے شدید صدمے کی حالت میں بھی اپنا فرض سمجھا کہ تشدد آمیز انقلابی تحریک سے جس کی بدولت وطن پرست بنگالی نوجوان کی جان گئی بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کر دیں۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ جتندرناتھ داس جو اپنے ملک کی محبت میں موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس کے ساتھی جو ابھی تک نیم جانی کے منجدھار میں ہیں حب وطن، خلوص اور ایثار کے مجسّمے ہیں لیکن افسوس ہے کہ جوانی کے جوش نے ان لوگوں کو اس راہ پر ڈال دیا جس میں انکے ملک کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔

ان لوگوں کا خیال ہے اور بالکل بجا ہے کہ شہیدوں کے خون سے قوموں کی آزادی کا قصر تعمیر ہوتا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ شہادت کے شرائط کتنے سخت ہیں۔ سیاسی شہادت کیلئے یہ کافی نہیں کہ انسان عارضی جوشِ ضد یا غصے میں جان دیدے خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقصد کے لئے کیوں نہ ہو بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ پہلے وہ اس کا اطمینان کرلے کہ اسکی قربانی واقعی ملک کے لئے مفید ہوگی اور پھر خالص نیت، پاک ارادے اور بے لوث دامن کے ساتھ ہلاکت کے دریا میں کود پڑے۔ محبت کی دیوانگی میں بے سوچے سمجھے جان دیدینا بیشک بڑی ہمت کا کام ہے لیکن جب انسانوں کے اعمال اعلیٰ اخلاقی اصول کی میزان پر تولے جاتے ہیں تو اسکا پلہ کچھ بہت بھاری نہیں رہتا۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ داس جیسے منچلے ہونہار نوجوانوں کے یوں مفت میں جان کھو دینے کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کی فضا آج کل سیاسی بےچینی سے معمور ہے۔ ہندوستانیوں کے دل میں غلامی کی شرم اور آزادی کی آرزو نے ایک شورش برپا کردی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ نوجوانوں اور خصوصًا طالب علموں میں جن کی طبیعت میں یوں بھی ہیجان و تلاطم رہتا ہے یہ شورش ہنگامۂ محشر بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگر ان نوجوانوں کے نگران یعنی مدرسوں کے منتظمین ملک و قوم کے خیر خواہ ہوں اور تھوڑی سی عقل بھی رکھتے ہوں تو وہ نوجوانوں کے اس جائز اور مبارک جوش کو سیدھی راہ پر لگانے کی تدبیریں کریں انہیں قومی رہنماؤں سے خلوص و عقیدت کا اظہار کرنے قومی گیت گانے قومی جشن منانے کی اجازت دیں تاکہ انکا حب وطن کا طوفان دریا کے کناروں سے گذر کر آس پاس کی زمین کو برباد نہ کرے بلکہ قعر دریا کو اور گہرا کاٹ کر آگے بہتا چلا جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ حب وطن کے جذبے کو سودا سمجھ کر دبانیکی کوشش کیجاتی ہے، طالب علموں کو قومی مباحث پر گفتگو کرنے بلکہ کہیں کہیں کھدر پہننے تک کی ممانعت کیجاتی ہے ظاہر ہے کہ انہیں ضد پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ بڑھتی جاتی ہے جن کی قوت ارادی کمزور ہے وہ قہر درویش برجان درویش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں مگر جن میں ولولہ حوصلہ اور قوت عمل ہے وہ انقلابی تحریکوں میں شریک ہوکر داس کی طرح جنون الفت کی بدولت دنیا سے ناکام و نامراد گذر جاتے ہیں۔

نوجوانوں میں اس قدر تلخی اور ضد پیدا ہونیکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں ملک و قوم کی حالت دیکھ کر مایوسی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ انکے خون میں گرمی ہوتی ہے اس لئے یہ مایوسی غصے کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان، ہندو اور ہندو، مسلمان اور مسلمان بےشرمی سے ادنیٰ اغراض پر لڑتے ہیں، قومی رہنما بےحمیتی سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دست و گریباں ہوئے جاتے ہیں تو انکے دل میں امید مرجھا جاتی ہے اور ناامیدی جو خودکشی

کا پیش خیمہ ہی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

اس تاریکی میں ایک روشنی نوجوانوں کی کانفرنس کی بدولت نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرکز قائم ہو رہا ہے جہاں نوجوان اپنے جوش کو مفید قومی کام میں لگانیکی کوشش کرتے ہیں، اپنے بڑوں کے باہمی جھگڑوں سے الگ رہ کر اتحاد و محبت کے جذبے کی پرورش کرنا چاہتے ہیں اور ضبط و انضباط کی عادت ڈال کر آزادی کی جنگ کے لئے تیار ہونے میں مصروف ہیں۔

مگر ان لوگوں کی راہ میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر انہوں نے اپنے مقاصد میں کسی سیاسی عقیدہ کو خواہ وہ اشتراکی حکومت ہو یا نراجی مکمل آزادی ہو یا مشروط، داخل کر لیا تو ان میں بھی آپس میں پھوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اور انکی ساری ترقیوں کو روک دیگی۔ عملی سیاست اس قدر ہیجان انگیز چیز ہے کہ جب تک انسان کے دل و دماغ میں انتہائی پختگی پیدا نہ ہو جائے، اسے اس کے قریب نہ جانا چاہئے، نوجوانوں کو چاہئے کہ اپنی پیشرو نسل کی خام کاریوں سے سبق لیں اور گریبان چاک کرنے سے پہلے پختہ مغز جنون بننے کی کوشش کریں۔

اعلان

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اعلان کیا تھا کہ "جرمنی سے دیوان غالب کے پانچہزار نسخے آرہے ہیں۔ یہ نسخے جیسے ہی بمبئی پہنچے کچھ عرصے کے لئے قسم اول کی مقررہ قیمت پر ۲۵ فیصدی اور قسم دوم کی مقررہ قیمت پر ۳۲ فیصدی رعایت کا عام اعلان کر دیا جائیگا" چنانچہ خدا کا شکر ہے

پورے پانچہزار نسخے بمبئی پہنچ گئے ہیں

جو صاحب یکم جنوری سنہ ۳۳ء تک طلب فرمائینگے ان سے قسم اول کی قیمت صرف سے؁ اور قسم دوم کی صرف ۶؍ لیجائے گی۔ اور جو

تاجران کتب

پانچ یا پانچ سے زیادہ نسخے منگائیں گے ان سے پچاس فیصدی کی رعایت کی جائے گی۔

یہ دیوان غالب وہی مشہور معروف، خوبصورت جلد۔ سرخ کیس اور پاکٹ سائز والا شرکت کاویانی (برلین) کا دیوان غالب ہے جو اس سے پہلے بھی دو بار ہم جرمنی سے منگواکر ہزاروں کی تعداد میں فروخت کر چکے ہیں قسم اول اور قسم دوم [illegible] قسم اول کا کنارہ سونے کا ہے اور قسم دوم کا معمولی [illegible] رنگ کا۔

یہ یقین رہے

کہ یہ اعلان ہم عام بازاری کتب فروشوں کی طرح نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کے زندہ جاوید شاعر کی یاد ایک بار پھر تازہ کریں اور دلدادگان غالب کو موقع دیں کہ وہ اس نادر رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھاکر اردو کا بہترین چھپا ہوا دیوان خرید سکیں اور ہماری محنت کی داد دیں۔

یقیناً

(۱) یکم جنوری سنہ ۳۳ء کے بعد دیوان غالب قسم اول کی قیمت پھر للعہ؍ اور قسم دوم کی ۳؍ ہو جائے گی۔
(۲) یکم جنوری سنہ ۳۳ء کے بعد تاجروں کو حسب سابق ۱۲½ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

اسلئے اب موقع ہے کہ ہر تاجر کتب اور ہر شخص فائدہ اٹھائے۔ کیا پانچ نسخے بیچ کر دس روپیہ کمانا مشکل ہوگا؟

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

The Cultural Side Of Islam

Madras Lecture on Islam

(NO. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madrasin January 1929.

CONTENTS:

Price 1/8/
Bound 2/-

To be had of:—

National Muslim Univesity Book Depot

KAROL BAGH,

DELHI

رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۳
بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء
نمبر ۴
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

عرب شمالی و وسطی کی حکومتیں

عہد نبوی سے پیشتر

سنہ ۱۹۰۹ء میں قاہرہ کی سرکاری یونیورسٹی میں مشہور اطالوی مستشرق گویدی (Ign Guidi) نے عرب قبل اسلام پر چار بیش بہا لکچر دئے تھے جو سنہ ۱۹۲۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں L'Arabie Antéislamique۔

ہم جامعہ ملیہ کی اُردو اکادمی کے لئے ان لکچروں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انشاء اللہ عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ فی الحال ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں اُس کتاب کے باب اول کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہو کہ بہ نظر پسندیدگی و دلچسپی دیکھا جائیگا۔

(سید حسن برنی)

جب اہل عرب کا تذکرہ ہوتا ہے، تو ہمارا خیال خود بخود بانی اسلام، عہد خلافت کی ابتدائی فتوحات، اور خود خلافت کی طرف جاتا ہے، جو اہل شرق و اہل مغرب دونوں کے نزدیک عروج و شوکت کا ایک خواب پیش کرتے ہیں۔ ہم عرب قبل اسلام کو بآسانی فراموش کر جاتے ہیں، اور یہ ہماری غلطی ہو۔ جنوبی عرب کے تمدن کا جس کا زمانہ کتبات کے رو سے مسیح سے آٹھ سو برس پہلے تک پہنچتا ہی، ذکر چھوڑ کر، وہ حکومتیں جو صحرا کے کناروں پر قائم ہوئی تھیں، اور شمال و مشرق اور جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں واقع تھیں، اور جہاں عرب کی قوم کو استقلال و نشو و نما حاصل ہوا، اسلام کی شاندار تاریخ میں حقیر تصور کئے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ سپٹی میوس اودیناتوس (Septimus Odenatus) جس نے سنہ ۲۶۰ء میں شاپور اول کو مغلوب کیا تھا، اور جو کہ شہنشاہ گالین (Gallion) کا شریک سلطنت تھا، رومۃ الکبریٰ کے قیاصرہ میں شمار ہوتا اور کسی نہ کسی طریق پر رومۃ الکبریٰ کی تاریخ

میں حصہ رکھتا ہے، لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ ایک بہادر عرب سردار تھا جو کہ خالد بن ولید ثلثی اور عمرو بن العاص کا پیش رو تھا جنہوں نے چشم زدن میں جرار لشکروں کو شکستیں دیکر سلطنتہائے ساسانی و بائز نطینی کے ایک بڑے حصے کو فتح کر ڈالا۔ اُسکا اصلی عربی نام اُذینہ تھا، اور اُس کی بیوی مشہور "زینوبیا" کا نام عربی اسم زینب کی مسخ شدہ شکل ہے۔ عرب کی روایت میں اُس عورت کا نام زبّا آتا ہے، لیکن وہ دراصل اذینہ کے ایک سپہ سالار کا نام ہے۔ اذینہ اور زینب کے لڑکے وارث کا نام اوتھینوڈور (Othenodore) یعنی عطائے اتھینیا (دیبی) تھا، جو کہ فی الواقع اس کے اصلی عربی نام وہب علات یعنی عطائے علات (وہب بمعنی ہبہ) کا ترجمہ ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس لڑکے کو علات نے اُس کے والدین کو بخشا تھا۔ علات کی پرستش بطور ایک معبود کے عرب میں بکثرت متداول تھی۔

قدیم عرب کی تاریخ پر، جیسا کہ عام طور پر تمام دیگر ممالک کی تواریخ کا حال ہے۔ اُس کی جغرافیائی ہیئت کا بہت اثر پڑا ہے۔ عظیم صحراؤں نے جو کہ شمال و جنوب میں اس جزیرہ نما کو شام و بابل سے علیحدہ کرتے ہیں اُس کے باشندوں کو دشمنوں کے حملوں اور اُن کی زبان اور قومی خصائل کو تبدیلیوں سے محفوظ رکھا۔ کلدانیہ کی زبان، جیسا کہ ہم اُسے اُن تحریرات کے ذریعے سے جو شاید مسیح سے چار ہزار برس پہلے ہیں، جانتے ہیں، باوجود اس قدر قدامت کے سامی زبان کی قدیم شکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بعض اہم تبدیلیاں اختیار کر چکی ہے، حالانکہ عربی زبان نے چھٹی صدی عیسوی میں بھی اپنی نحوی ہیئت کے بعض حصوں مثلاً فعل میں قدیم زبان سے بہت کم بُعد حاصل کیا ہے اسکا باعث عربوں کی علیحدگی اور آزادی ہے۔ جب سے اسلام کے بعد عربوں کا دوسری قوموں سے واسطہ پڑا، اُن کی زبان میں بھی کم و بیش بعض اہم تبدیلیاں وقوع میں آئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آشوریا کے تاریخی کتبات میں سناشرب، اَسَرحدان، اَسَرنی پال اور بخت نصر کی فتوحات کا ذکر ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان آشوری اور کلدانی سرکاری بیانات کو پورے طور پر اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہرحال یہ فتوحات محض حملوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان حملہ آوروں کی حکومت محض

زبان نہ ہو، لیکن بول چال کی زبان ضرور تھی۔ یہ تحریرات بجائے کتبات ہونے کے محض چند کندہ الفاظ کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، جنہیں بعض چرواہوں نے نقش کر دیا تھا۔ ایسے ہی کندہ کئے ہوئے الفاظ سینا کے وادی مکتب میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان نقوش سے تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہے، لیکن وہ زبان کے نقطۂ نظر سے قیمتی ہیں۔ یہ زبان شمال کی اصلی عربی معلوم ہوتی ہے، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ چند قسم کی زبانیں مروج تھیں، جو ایک طرف تو نبطی بولتے تھے اور دوسری طرف اہل عرب۔ ان زبانوں کی تین قسمیں ہیں صنعائی لحیانی، اور ثمودی۔ سب سے اخیر قسم اُس مشہور جماعت میں متداول تھی، جنہیں اہل عرب آل ثمود لکھتے ہیں۔ ایک مختصر کتبہ جو ثمودی زبان میں لکھا ہوا ہے، اور حال ہی میں دستیاب ہوا ہے سب سے پہلا کتبہ ہے جس میں تاریخ دی گئی ہے۔ یونانی و رومی مصنفوں کے ذریعہ سے بھی ہم آل ثمود کے متعلق کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ رومیوں کی عربی فوج میں ثمودیوں کا ایک خاص دستہ ملازم تھا، جسے رومی Equites Saraceni Thamudeni یعنی "لشکر سواری ثمودی" کہتے تھے۔

اس شمالی قسم زبان کی ایک خاص خصوصیت حرف "اَل" کی شکل ہے، عبرانی زبان میں "ال" کی جگہ "ھا" آتا ہے "فرس" (گھوڑا) حرف معرفہ شامل کرکے "ہافرس" ہوگا۔ ان کتبات میں سے ایک کتبہ جو صنعائی زبان میں ہے بتاتا ہے کہ حال بن سلام نامی ایک شخص نے ایک گھوڑا ایک دوسرے شخص حنّائی نامی سے پانچ مینا میں خریدا

"اَعْذَمِ حَنَّائی ہا فَرَسْ نجمۃ اُمْنِی (امانی ؟)"۔ ایک اور شخص انعم بن قاحش اس مال غنیمت کا تذکرہ کرتا ہے جو اُس نے جنگ نبط کے سنہ میں حاصل کیا تھا۔

"وَغَنِمَ سنت حَرْب نَبَطْ"

یہ کتبہ اُس سنہ کی وجہ سے جو اُس میں پایا جاتا ہے اہم ہے۔ یہ تاریخ اغلباً (شہنشاہ) تراجن کے عہد میں ۱۰۶ء سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتبے اکثر ان الفاظ پر ختم ہوتے ہیں:-

(غلطی سے صفحہ ۲۵۳ کو ۲۵۲ کے بعد ان صفحوں پر ۲۵۳ لکھ دیا گیا ہے)

برائے نام تھی، اور بہت تھوڑے دنوں تک رہی، برخلاف اس کے رومیوں نے جنہوں نے کہ اپنے زمانے کی ساری دنیا کو جو انہیں معلوم تھی، منظم کرنے کی کوشش کی، عرب کو فتح کرنے کی صرف ایک کوشش قیصر اغسطس کے زمانے میں کی اور اس میں بھی وہ سراسر ناکام رہے۔ آئی لیوس گالوس (Aelius Gallus) نے جو کہ عرب کے جنوبی حصوں تک پہنچ گیا تھا، " مریابا" (مارب) کا محاصرہ کر لیا، لیکن بالآخر اسے اس محاصرہ کو چھوڑ دینا پڑا، اور ایک لشکر جرار میں سے جس کا پورا اہتمام کیا گیا تھا، وہ صرف معدودے چند افراد کو مصر واپس لے کر پہنچ سکا۔

جس چیز کا شمال کے عربوں پر اثر پڑا وہ ایک آہستہ، لیکن واقعی حملہ تھا، یہ حملہ مذہبی خیالات اور ہمسایہ ممالک یعنی مغرب میں بازنطینی سلطنت اور مشرق میں ساسانی سلطنت کے برتر تمدن کا تھا۔ ایک زمانے میں جسے گذرے ہوے مدتیں ہو چکی تھیں، اُن حکومتوں پر بھی جو کہ یمن میں قائم تھیں، ان سلطنتوں کے ایسے ہی اثرات پڑے تھے۔ اپنی حکومتوں کی بنیاد پڑ جانے پر شمال و جنوب کے عربوں نے ایک نظم و نسق قائم کر لیا تھا، لیکن اُس سے انہیں اپنی آئندہ ترقی میں بڑی مدد ملی۔ یہ حکومتیں حیرہ اور غسان اور وسط جزیرہ نما میں کندہ کی تھیں ہم مختصر طور پر ان حکومتوں کی تاریخ کے اہم واقعات ان روایتوں سے اخذ کر کے جو ششم صدی مسیحی کی ابتدا سے شعرا و مورخین عرب کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں پیش کرینگے۔ عربی زبان کے قدیم ترین تحریری اسناد اس صدی کے آغاز سے پیشتر کی نہیں ملتیں۔ اور یہ زمانہ بقول رینان (Renan) ہنوز عربوں کا "عہد رزمیہ" ہے

یہیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم اب ایسی عربی زبان سے بھی واقف ہیں جو اشعار جاہلیت سے زیادہ قدیم کہی جا سکتی ہے۔ حوران میں جو دمشق کے جنوب و مشرق میں واقع ہے، و نیز حجاز کے شمالی اقطاع تک اخیر صدی عیسوی کے نصف دوم میں بعض ایسے کتبات دستیاب ہوئے ہیں جو اس قدیم عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عربی زبان ادبی

" فو ہا (خا) علات سلام "

ان الفاظ کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے " علات کے روبرو سلام " ان الفاظ میں علات نامی معبود کبیر کا ذکر ہے ۔ لیکن جو چیز توجہ کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتبات ایک ایسے رسم الخط میں کندہ کئے گئے ہیں ، جو کہ جنوبی عرب کے حروف سے وابستہ ہے ، نہ کہ آرامی حروف سے جو کہ پنجم صدی قبل مسیح سے دریائے فرات کے تمام اقطاع میں مروج تھے یہ معمولی واقعہ ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے سنہ مسیحی کے ابتدائی زمانے میں عرب کے تمدن کا خاص گڑھا جنوب یعنی یمن میں تھا اور اسکا اثر عرب کی شمالی آبادی تک پہنچا ہوا تھا ۔

اب ہم اُن حکومتوں کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو عرب کے شمال میں قائم ہوئی تھیں ، بالخصوص حیرہ

حیرہ دراصل ایک سریانی لفظ ہے ، جس کے معنی " محدود قطعۂ زمین " یا " فوجی کیمپ " کے ہیں ۔ اسکا تلفظ بجائے حِیرہ (بالکسرہ) حَیرہ (بالفتح) تھا ۔ وہ محل وقوع کے لحاظ سے اچھے مقامات میں سمجھا جاتا تھا اور اُس کی ہوا اتنی عمدہ تصور کیجاتی تھی ، کہ ایک مثل مشہور تھی کہ حیرہ میں ایک دن گذارنا ، سال بھر دوائیں کھانے سے بہتر ہے ۔ ان عمدہ حالات کیوجہ سے حیرہ میں کثیر اور مرفہ الحال آبادی جمع ہوگئی تھی ، جس میں سب سے زیادہ قبیلہ تنوخ کے عرب تھے جو خیموں میں رہتے تھے ۔ انکے بعد عباد تھے جو مختلف عیسائی قبائل سے تعلق رکھتے اور زیادہ تر شہر کی اصلی آبادی میں رہتے تھے ۔ انکے علاوہ اور بعض قبائل تھے جو ان سے اتحاد رکھتے تھے عباد کے معنی " بندگان " ہیں ۔ پورا نام شاید عباد اللہ " یا ممکن ہے " عباد المسیح " یعنی غلامان مسیح ہوگا ۔ یہ نام غالباً انہوں نے خود ہی اختیار کیا تھا ، تاکہ اُس کے ذریعے سے وہ بددین اور بت پرست آبادی پر جو اُنکے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اپنا تفوق جتائیں ۔

ہم حکومت حیرہ کے عہد اولی کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں جانتے ۔ حسب معمول اس کی ابتدا کے متعلق بھی دیگر حکومتوں اور شہروں کی طرح بجائے تاریخ کے افسانہ سے سابقہ پڑتا ہے

عدی بن ربیعہ کا عشق رقاش کے ساتھ جو کہ شاہ جذیمۃ الابرش کی بہن تھی، جذیمہ کی اس سے ناراضگی اور بعد ازاں اُس کی اپنے بھتیجے عمرو بن رقاش سے محبت اور ماہ وش زبّہ سے جسے متقدمین "زینوبیا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ سب افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ازاں جملہ اُن تاریخی واقعات کو جو اُن میں مخلوط ہو کر رہ گئے ہیں، علٰحدہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ پھر بھی بجز خاندان لخمیہ یا بنو نصر کے ہم حیرہ کی تاریخ سے بہتر طور پر واقف ہیں۔ حیرہ کے شاہی خاندان کی ابتدا تیسری صدی عیسوی کے نصف دویم میں قرار دیجا سکتی ہے۔ لیکن پہلا بادشاہ جو ہمارے زمانے تک کسی قدر شہرت رکھتا ہے، امرا القیس اول ہے۔ اس لئے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی جانب اس کتبہ کو منسوب کیا جا سکتا ہے جو کہ علاقہ صنعاء (واقع وسط شام) میں موسیو دی سو (M. Dissaud) کو تھوڑا عرصہ ہوا دستیاب ہوا ہے۔ یہ کتبہ جو کہ عجائب خانہ لودر (Louvre) واقع پیرس (فرانس) کے عظیم الشان ذخیرہ میں شامل ہو چکا ہے، دو قسم کی اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخی و لسانی۔ یہ کتبہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:-

"تی نَفسُ مَرَلقیس بَر عَمرُ مَلِکَ العَرَب کُلّہا"

یعنی "یہ مُرلقیس (امرالقیس) پسر عمر بادشاہ جملہ عرب کی قبر ہے"، یہ عبارت قدیم عربی زبان میں ہے، لیکن اس میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفس بمعنی سنگِ مزار (یا لوح) بر (بجائے بن) بمعنی پسر۔ لیکن یہ الفاظ اس عہد اور اس ملک کی بول چال کی زبان کی بجائے ادبی اور نیز تحریری زبان کو پیش کرتے ہیں جو کہ ہمیشہ آرامی زبان کے زیر اثر رہی۔ ایک ہی قوم کے لکھنے اور بولنے کی زبان میں اس قسم کا فرق پایا جانا تعجب انگیز نہیں ہے۔ یہی کیفیت نبطیوں کی ہے، جو کہ عرب قوم سے تھے چونکہ اُن کی مادری زبان اُس وقت لکھی نہیں جاتی تھی اس وجہ سے اُنکے کتبات ایک طرح کی آرامی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن اُس میں جا بجا عربی زبان مخلوط ہے۔
شاہ امرالقیس یا مرالقیس جس کے مزار پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا، اپنے آپ کو تمام عرب کا بادشاہ بتاتا ہے۔ وہ مشہور قبائل اسد نزار اور انکے امراء نیز قبیلہ مذحج کا پادشاہ تھا۔ اس نے "شامر" کے

شہر نجران کا محاصرہ کیا تھا سنین کی مطابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شامر سے مراد "سبا" کا بادشاہ شامر یُہرعش ہے جس نے اپنے باپ کے ساتھ ۲۷۰ء سے اور تنہا ۲۸۱ء سے حکومت کی تھی۔ نجران عرب جنوبی کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس کتبہ کی تحریر نبطی خط میں ہے، لیکن اس میں بعض قابل غور خصوصیتیں پائی جاتی ہیں مثلاً لام الف جو کہ عربی کے لام الف (لا) سے قطعاً مطابق ہے جس چیز سے اس کتبہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے وہ اُس کی تاریخ ہے جو اس میں درج ہے اس کتبہ کے دستیاب ہونے سے قبل بعض فضلا مثلاً آئش ہورن (E. Chhorn) اور کوسین دے پیرسیوال نے امرءالقیس اول کا عہد حکومت چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں قرار دیا تھا، اور عربی روایتوں میں متفقہ طور پر اُسے عمرو کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے تاریخ حیرہ کے متعلق یہ امور مسلم سمجھنے چاہئیں کہ نمارہ (Namara) کے کتبہ میں جس مرءالقیس کا ذکر ہے وہ عربی روایات کا بادشاہ امرءالقیس ہے، اور اُس کی وفات کی یقینی تاریخ ۷ دسمبر ۳۲۸ء شاہان حیرہ کے سنین کو متعین کرنے کے لئے ایک نہایت اہم نقطۂ آغاز ہے۔

امرءالقیس اول کے پرپوتے نعمان اول نے بہت زیادہ شہرت پائی۔ یہاں تک کہ عرب کی شاعری اور کم و بیش فسانہ آمیز نوعیت کی تاریخ میں اسکا نام بہت کچھ زندہ اور رائج رہا۔ اُس کے ماتحت سواروں کے دو دستے تھے جن میں سے ایک تو "دوسر" اور دوسرا "الشہبا" کہلاتا تھا۔ نعمان کے لئے ان منتخب دستوں کی اہمیت اُن لڑائیوں میں جو ہمسایہ قبائل عرب سے ہوئیں اور جن میں سواروں کا ممتاز حصہ ہوتا تھا محتاج بیان نہیں ہے۔

حیرہ کی بادشاہی یقینی طور پر ساسانیوں کے زیر اقتدار تھی، حتّٰی کہ یزدجرد اول (۳۹۹ء–۴۲۰ء) نے اپنے بیٹے بہرام (گور) کو تربیت کے لئے نعمان کے سپرد کیا تھا۔ قصر خَوَرْنَق و "قصر سدیر" کی تعمیر سے جو نعمان نے بنوائے تھے، اُس کی حکومت کو اور بھی عزّ امتیاز حاصل ہو گیا۔ خورنق یقینی طور پر ایرانی زبان کا لفظ ہے اور اُس لفظ کی اصلی صورت "ہُوَرْنَق" ہے جس کے معنی

ہیں" وہ چیز جو اچھی طرح ڈھکتی یا محفوظ رکھتی ہو"۔ یہ محل فن تعمیر کے عجائبات میں سے تھا جسے ایک رومی (یونانی) معمار "سنمار" نامی نے بنایا تھا۔ روایت ہو کہ اس محل کے بالائی بام پر جہاں نعمان اپنے اقبال و عیش کے خواب دیکھ رہا تھا، یکایک اُس کے دل میں ایک اندوہناک خیال پیدا ہوا، اور وہ یہ تھا کہ " یہ جو کچھ بھی ہے آج تو سب میرا ہے، لیکن کل یہ سب دوسرے کا ہوگا" اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے دنیا کو ترک کر دینے کا تہیہ کر لیا، اور اپنی بقیہ زندگی خلوت و عبادت میں گذاری۔ نام آور بادشاہوں کے قصے، جن میں معًا دنیا چھوڑ دیتے اور گوشہ نشینی اختیار کر لینے کا ذکر ہو، اور بھی بکثرت مشہور ہیں، مثلاً نعمان کی طرح حبش کے بادشاہ "کالب" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یمن کے بادشاہ کو مغلوب کرنے اور کمال عروج کو پہنچ جانیکے بعد وہ راہب ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں عرب مصنفین تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ سقراط و افلاطون بھی اخیر عمر میں زاہدانہ گوشہ نشین بن گئے تھے۔

نعمان بت پرست تھا، اُس نے مذہب عیسوی کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا، اور عربوں کو شمعون نامی ولی (S. Simeon) کے پاس جانے اور اُس کا وعظ سننے کی ممانعت کر دی۔ لیکن وہ ولی اُسے خواب میں نظر آیا، اور اُس کو سخت کلمات سے یاد کیا، اور کئی بار عصا سے مارا۔ نعمان نے بالآخر حیرہ میں عیسائیوں کو اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کی اجازت دیدی۔ اس کی تائید عرب مصنفوں کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی ایک اور بھی اہمیت ہو، وہ یہ کہ مذہب عیسوی کا استحکام اس بات کو ظاہر کرتا ہو کہ عباد نے جو کہ حیرہ کی مسیحی آبادی تھے، منتخب اور سربرآوردہ عربوں پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

نعمان کا جانشین تقریبًا ۵۱۴ء میں منذر اول اس کا بیٹا ہوا، جو کہ تقریبًا ۵۶۲ء تک حکمراں رہا۔ یونانی (رومی) و سریانی مصنفین اُسے الاموندار دس (Alamoindaros.) منذر (بالفتح ذال) لکھتے ہیں، لیکن عرب ہمیشہ سے اس کے نام کو اسم فاعل المنذر کی شکل میں لکھتے رہے ہیں۔ نعمان میں بعض غیر معمولی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور اُس کے عہد میں حیرہ کی حکومت

نے اس وقت کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نے موبدان ایران کو بہرام گور مذکرہ بالا کو تاج شاہی پہنانے پر مجبور کیا حالانکہ انہوں نے بہرام گور کو نظر انداز کر کے اور ساسانی شاہزادہ کو تخت نشین کر دیا تھا۔ بعض عرب مصنفوں نے لکھا ہے کہ بہرام گور کے تخت شاہی حاصل کرنے میں منذر کے باپ نعمان نے مدد دی تھی۔ اس طرح اس واقعہ کی دو مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن تواریخ کی مطابقت کی رو سے دوسری روایت صحیح نہیں ہے منذر نے بہرام گور کی مدد اس کامیاب جنگ میں بھی کی تھی جو کہ بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ لیکن منذر کی فوج پر معاً ہراس غالب آگیا، اور انہیں یہ خوف ہوا کہ وہ گھر گئے ہیں۔ اس خوف سے وہ دریا میں جا گھسے، اور اُن میں سے اکثر دریائے فرات میں ڈوب کے مر گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۴۲۱ء میں پیش آیا۔

حیرہ کے بادشاہ اُس کے بعد سے ساسانیوں اور بازنطینیوں (رومیوں) کی لڑائیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ نعمان ثانی منذر کا پوتا، سنہ ۵۰۳ء میں جنگ خبور (Khabur) میں جو کہ بمقام سرسیوم (Carcesium) ہوئی تھی مارا گیا۔ حیرہ کے بادشاہوں میں بلاشبہ سب سے زیادہ ممتاز منذر ثالث تھا، جو سنہ ۵۵۴ء میں پچاس برس حکومت کرنیکے بعد مرا۔

پروکوپ (Procope) نے لکھا ہے کہ وہ نہایت ذہین اور بڑا زبردست سپہ سالار تھا۔ جسٹن (Justin) (سنہ ۵۱۸ء) کے عہد کو چھوڑ کر ساسانیوں اور بازنطینیوں میں صلح بہت کم رہی، اور منذر سوم جنگ میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیتا رہا۔ اُس نے دو سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ تو جسٹن نے حیرہ کے چھوٹے سے بادشاہ کے پاس اپنے سفیر بھیجنے میں اپنی بے عزتی نہ سمجھی، اور اس سے بلاشبہ اس کا منشا یہی تھا کہ اُس کے دونوں سپہ سالار رہا ہو جائیں اُسی زمانے میں منذر کے پاس یمن کی سفارت بھی آئی تھی۔ قباد کے زمانہ میں بھی منذر نے جنگ میں خاص طور پر نمایاں حصہ لیا، رومیوں کی سلطنت میں کئی بار لشکر کشی کی، لیکن ہمیشہ ان کے تعاقب سے بچ کر نکل آیا۔

اُسی زمانے میں سلطنت بازنطینی کی سرحد پر ایک دوسری عرب حکومت نے اتنی قوت حاصل کرلی تھی کہ وہ حیرہ کی حکومت کی حریف بن سکے، اور ساسانیوں اور اُنکے زبردست لخمیوں کے مقابلہ میں سلطنت بازنطینی کی مدد کرے۔ یہ غسان کی حکومت تھی۔ اس حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ حیرہ کے ابتدائی تاریخ کی طرح افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غسانی جنوبی عرب سے آکر بصری کے علاقہ میں مقیم ہوئے تھے۔ وہاں انہیں دیگر عرب قبائل پہلے سے آباد ملے اور کچھ مدت تک وہ اُن قبائل کے مطیع و منقاد رہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اواسط میں ثعلبہ بن عمرو کو سلطنت بازنطینی کی طرف سے اس علاقہ کی امارت سپرد ہوئی، جو آگے چلکر غسان کی پادشاہت ہوگئی۔ یہ اختیارات بعد میں خاندان جفنہ کے امرار کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے لیکن یہ بات چہارم صدی عیسوی کے نصف اخیر میں حاصل ہوئی کہ تاریخ میں غسانی بطور سلطنت بازنطینی کے معاونین کے نظر آتے ہیں۔ ۳۷۳ء میں غالبًا شاہ حارث دوم کی وفات کے بعد اُس کی بیوی ماریہ یا ماویہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ایک روایت کی روسے اُس جنگجو اور فتحمند ملکہ نے سلطنت بازنطینی کو مجبور کردیا کہ وہ اُس ملکہ سے صلح کی جویا ہو ماریہ اس شرط پر صلح کے لئے راضی ہوئی کہ موسٰی نامی ایک مسیحی ولی بطور بڑے پادری کے اُس کے ملک میں بھیجدیا جائے گا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب عیسوی نے اس ملک کے عربوں میں کتنی ترقی پیدا کرلی تھی۔ لیز عرب کس حد تک رفتہ رفتہ بت پرستی سے ہٹ کر برتر مذہب قبول کرنیکی طرف مائل ہو رہے تھے۔

بعض شاہان حیرہ و غسان، بالخصوص "جفنہ ثانی" کا ایک انوکھا لقب "محرّق" تھا۔ اس نام کے معنی وہی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان کی روسے ہوتے ہیں، یعنی "ایک ایسا شخص جو کہ تیز آگ میں جلاتا ہے"۔ بعض شاہان حیرہ کے متعلق جن کا یہ لقب ہے، ایسی حکایت بھی بیان کیجاتی ہے جس سے اس اسم کی توجیہہ ہوجائے۔ لیکن ان حکایات کا ماخذ فی الواقع لفظ محرّق اور اس کے معنی ہیں۔ اسی طرح "معلقات" کے لفظ سے جو لہ سات مشہور نظموں

کے لئے مخصوص ہر ...ہ روایتیں ماخوذ ہیں، جن کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ یہ نظمیں کعبہ میں آویزاں تھیں لیکن علامت معرفہ "ال" کی عدم موجودگی سے واضح ہوتا ہے کہ محرق اسم علم ہے اور غالباً کسی دینی پیشوا یا کسی افسانہ کے سورما (ہیرو) کا نام ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی مدت میں غسان کی حکومت نے سب سے زیادہ شوکت حاصل کرلی۔ یہی زمانہ حکومت حیرہ کے اقبال کا بھی تھا۔ اس کے بعد سے دونوں حکومتوں میں تصادم ہونا ناگزیر ہوگیا۔ دو حریف سلطنتوں، یعنی ایران و روم الصغرے کے ماتحت ہونے کی وجہ سے وہ اس پر مجبور تھیں کہ وہ بعض اوقات باوجود چند روزہ ظاہری صلح کے ایک دوسرے سے اظہار نفرت کریں۔ جبکہ ثالت یا حارث الاکبر کی منذر ثالث سے جنگ ہوتی رہی جس میں جبلہ مغلوب ہوا۔ اسی جبلہ کی بیوی مریم تھی، جس کے کان کے بندوں میں دو اتنے بڑے موتی جڑے تھے کہ ہر ایک کبوتر کے انڈے کی برابر تھا۔ لیکن غسان کا سب سے بڑا بادشاہ اور حیرہ کا سب سے بیدرد دشمن حارث پنجم تھا، جو کہ حارث الاکبر اور مریم کا بیٹا تھا۔ قیصر جسٹینین (Justinien. نے اسے بطریق بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے بلند ترین مرتبہ حاصل ہوگیا تھا اور معاصرین اُسے بادشاہ (Basilios) کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ یہ لقب کبھی کبھی ماتحت امراء کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا جسٹینین نے سرحد کے پاس کے عربوں کی قیادت بھی حارث کے ہاتھوں میں دیدی تھی، اور اس طرح حیرہ کے بادشاہوں کے جو کہ سلطنت ایران کے رعایا تھے مقابلہ میں ایک قوت قائم کردی تھی۔

حارث خامس، اور منذر ثالث دو ایسی شخصیتیں ہیں، جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کی تاریخ میں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں۔ منذر اپنے حریف (حارث) پر اکثر فتحیاب رہا ۵۴۴ھ میں اس نے حارث کے بیٹے کو جنگ میں گرفتار کر کے عزّےٰ پر قربانی چڑھا دیا۔ ایسے معاملات میں وہ بالکل وحشی تھا۔ لیکن دس برس بعد وہ مغلوب ہوگیا۔ عربوں کی روایت میں اس جنگ کے دوران میں تین سخت لڑائیاں پیش آئیں، یعنی جنگہائے عین اُباغ، وحیار، وحلیمہ ان میں سے پہلی لڑائی بہت عرصہ بعد وقوع میں آئی۔ منذر (جون ۵۵۴ء میں) عین اُباغ میں نہیں بلکہ

حیار میں جو کہ قنیسرین (Kinesrin) کے قریب حلب سے دو دن کے فاصلہ پر ہے فوت ہو گیا۔ جنگ حلیمہ وہی جنگ معلوم ہوتی ہے جو حیار کی لڑائی بتائی جاتی ہے۔ حلیمہ حارث کی بیٹی کا نام معلوم ہوتا ہے، جسے اُس کے باپ نے حکم دیا تھا کہ وہ عطر "خلوق" سو چیدہ بہادروں کے جسموں پر مل دے۔ "وادی حلیمہ" یا "مرج حلیمہ" کا ذکر قدیم شعرا کے کلام میں، جو اکثر اس کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں" آتا ہے۔ "الشعر دیوان العرب" اشعار اہل عرب کا محافظ خانہ ہیں۔ ایک شاعر ابن ابی الرعلہ (؟) غسان کے بادشاہوں اور دیگر بہادر مقتولان جنگ کی اس طرح مدح کرتا ہے :-

"جو مر گئے اور خاموش ہیں وہ مرے ہوئے نہیں، بلکہ اصلی مرے ہوئے وہ لوگ ہیں جو باوجود زندہ ہونے کے مردہ ہیں :-

لیس من مات فاستراح بمیت انما المیت میت الاحیار

۵۶۳ء میں اپنے حریف کی موت سے بارہ برس بعد حارث قسطنطنیہ گیا، اور اس عرب سردار کا نظارہ رومیوں پر اثر ڈالنے والا ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رومی نے جسٹینین کو ڈرانے کے لئے کہا "ہوشیار ہو جا! حارث آتا ہے!"

چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر حکومتہائے حیرہ و غسان کا زوال شروع ہوا۔ عمرو بن منذر ثالث اپنے باپ کی جگہ ۵۶۲ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ مستعد لیکن وحشی تھا۔ شعرا نے بھی اُسے بُرا لکھا ہے۔ چبھتی ہوئی ہجو میں اکثر انہوں نے اسے "محرق" یعنی تیز آگ میں جلنے والے کا لقب دیا ہے۔ مشہور شاعر طرفہ اس کے ظلم کا شکار ہوا۔ ایک متداول روایت کی رو سے بادشاہ نے اُسے اور اُس کے چچا متلمس کو عمان بھیجا، اور وہاں کے عامل کو ایک خط لکھا، جو ہومر Homer کے اشعار کے دو کلموں سے شروع ہوتا تھا، اور اُس میں اُن دونوں کے قتل کر ڈالنے کا حکم درج تھا۔ متلمس نے اُس خط کا مضمون پڑھ لیا اور اپنی جان بچا لے گیا، لیکن طرفہ مارا گیا۔ عمرو بن منذر نے اپنی مستعدی کا ثبوت قیصر روم کے مقابلہ میں دیا۔ یہ امر شبہ سے خالی ہے کہ قیاصرہ روم الصغر نے

شاہان حیرہ کو باضابطہ ایک رقم ادا کرتے تھے اور اُس کے بدلے میں شاہان حیرہ کی دوستی، یا وقتاً فوقتاً ساسانیوں کے مقابلے میں لڑائیوں کے موقعوں پر خیر خواہانہ جانبداری مطلوب تھی جسٹن (Justin) اس ندامت بخش طریقہ کو دور کر دینا چاہتا تھا لیکن عمرو نے فوراً بازنطینی ماتحت رعایا "غسانیاں" کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ بالآخر عمرو کی کوتاہ نظری اُس کی موت کا باعث ہوئی۔ اُس نے ایک معلقہ کے مشہور مصنف عمرو بن کلثوم کی توہین کی تھی۔ اس نے عمرو کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ مشہور تغلیبی شاعر اخطل اپنے چچاؤں کی اس طرح مدح کرتا ہے

"یہ وہ ہیں جنہوں نے بادشاہوں کو قتل کیا، اور اپنی بیڑیوں کو توڑ ڈالا"

عمرو کا جانشین قابوس یا قابوسیس Combus or Combigze ہوا، جو باوجود اپنی بہادری کے جس کا بلاشبہ بعض عرب مصنفوں نے انکار کیا ہے غسانیوں کے خلاف جنگجوئی میں ناکام رہا۔ سنہ ۵۸۰ء میں نعمان ثالث ابو قابوس تخت نشین ہوا۔ اکثر شعرائے عرب نے اُس کا ذکر کیا ہے، اور وہ حیرہ کا سب سے مشہور بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ سب سے بہتر نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائی اسود کے مقابلہ میں عدی بن زید کی مدد سے جو کہ خسرو پرویز کے دربار میں نہایت ذی اقتدار شخص تھا تخت نشین ہوا۔ نعمان کے بعد اپنے محسن کے خلاف اُسے شبہات پیدا ہو گئے اور اُس نے اُسے قتل کر ڈالا۔ لیکن فوراً ہی خسرو کا اعتماد اُس پر سے اُٹھ گیا، اور خسرو نعمان کو ایک دشمن نہ کہ رعایا کی نظر سے دیکھنے لگا۔ خسرو نے نعمان کو گرفتار کر لیا اور سبت (Sabat) میں مرنے تک مقید رہا۔ اُس کی موت کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ طاعون میں مرا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اُسے زہر دیا گیا، تیسری روایت ہے کہ ہاتھی کے پیروں میں کچلوا دیا گیا۔ خسرو اپنے دشمنوں کو اکثر یہ سزا دیتا تھا۔ شاعر سلمہ بن جندل کہتا ہے:- نعمان نے عرصہ تک خوشنما قبوں کے نیچے پناہ پائی، لیکن اپنی زندگی ایک ایسی چھت کے نیچے گزاری جو ہاتھیوں کے لئے بنی تھی۔ اس طرح خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اُس کا جانشین ایاس بن قبیصہ قبیلہ لخم سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ وہ طے کے

قبیلہ سے وابستہ تھا۔ یا یہ کہئے کہ اُس حکومت ہی کا خاتمہ تھا، اس لئے کہ ایاس کے ساتھ ایک اعلیٰ ایرانی عہدہ دار مقرر ہوا، جو اُس کی حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ بہرحال منذر ثالث کا شاندار اور اچھا زمانہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اور حیرہ صرف ایک ساسانی صوبہ بن کر رہ گیا۔

نعمان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد ۶۱۰ء میں ذوقار کی جنگ ہوئی جس میں عربوں بالخصوص بکر بن وائل نے ایرانی فوج کو شکست دی اس لڑائی نے عربوں کے لئے گویا اُن عظیم الشان فتوحات کا جو انہیں ایرانیوں کے مقابلہ میں بعد میں حاصل ہوئیں دروازہ کھول دیا۔

غسانیوں کا زوال حیرہ کی طرح جلد ہی شروع ہوگیا۔ حارث ششم نے جو کہ حارث اعظم (حارث پنجم) کا جانشین تھا، ۵۸۳ء کے قریب زمانہ میں عین اباغ کی جنگ میں منذر چہارم کے مقابلے میں چند بار کامیابی حاصل کی، لیکن غسانیوں کی یہ چھوٹی سی حکومت خود بھی تباہ ہوگئی۔ عمرو چہارم اُن بڑے شاعروں کی بدولت جو کہ اُس کے دربار میں باریاب ہوتے تھے اور جنہوں نے بادشاہ عمرو کے جانشینوں کی مدح سرائی بھی کی ہے، زیادہ مشہور ہے۔ عمرو چہارم کے جانشینوں کے نام اس قدر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں کہ انہیں دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض معاصر ہیں، اور ایسے حکمراں نہیں ہیں جن کے تحت سارا رقبۂ ملک تھا۔ ان بادشاہوں کا لقب ہنوز "خیر الفتیان" یعنی "بہترین مردمان" ہے۔ جلد ہی وہ ایسے لوگوں سے جو بظاہر اُن سے زیادہ حقیر لیکن فی الواقع زیادہ قوی تھے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں غسانیوں کی بادشاہت ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم چند کلمات اُس تیسری حکومت کے متعلق اور کہنا چاہتے ہیں جس کا تذکرہ ہم نے اوپر حیرہ اور غسانیوں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کندہ ہے، جو پانچویں صدی عیسوی کے اخیر اور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں قائم ہوئی، اور جس کے بادشاہوں میں مشہور شاعر امرء القیس شامل ہے۔

حجرہ اکل المرار اس حکومت کا بانی بتایا جاتا ہے۔ وہ جنوب کے رہنے والے حمیری

کے قریب ہونیکی وجہ سے اُنکے اثر سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کندہ کا محل وقوع حمیر کے روبرو بالکل ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ لخمیوں کا ساسانیوں کے اور غسانیوں کا رومۃ الصغریٰ کے روبرو تھا لیکن کندہ کا ایک زبردست حریف حیرہ تھا۔ کندہ کے ایک بادشاہ حارث بن عمرو نے جو کہ نہایت بہادر تھا حیرہ کے ایک حصہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ وہ گاہے حیرہ اور گاہے انبار میں رہا کرتا تھا۔ لیکن منذر نے جلد بالادستی حاصل کر لی۔ ۵۲۹ء میں اُس نے حارث پر حملہ کر کے اُسے بھگا دیا۔ اور محض فتح پر اکتفا نہیں کی، بلکہ کندہ کے بعض امرا اور سرداروں کو جو کہ جنگ میں قید ہو گئے تھے۔ ذبح کرا دیا۔ یہ وحشیانہ فعل امرالقیس کے حسب ذیل اشعار جمیلہ کا محرک ہوا۔ امرالقیس اپنے باپ کی کامیابی و ناکامی کو کبھی نہیں بھولا:۔

الا یا عین بکی لی شنینا — وبکی لی الملوک الذاہبینا

اے میری آنکھ جلتے ہوئے آنسو بہا — اور شاہان رفتہ کے لئے رو

ملوکا من بنی حجر بن عمرو — یساقون العشیۃ یقتلونا

وہ بادشاہ جو کہ حجر بن عمر کی اولاد سے تھے — اور جو قتل ہو کر رات کے آغوش میں پہنچ گئے ہیں

فلو فی یوم معرکۃ اُصیبوا — ولکن فی دیار بنی مرینا

یہ صحیح ہو کہ وہ میدان جنگ میں مارے گئے — لیکن (ہائے کہاں؟) دیار بنو مرینا میں (جو کہ دشمن ہیں)

تظل الطیر عاکفۃ علیہم — وتنتزع الحواجب والعیونا

پرند اُن (کی نعشوں پر) ہر وقت سایہ کر رہے ہیں اور اُنکے ابرو اور آنکھوں کو اُن سے علیحدہ کر رہے ہیں (یعنی کھائے جاتے ہیں)

کندہ کی بادشاہت بھی جلد ہی تباہ ہو گئی۔ حارث کے لڑکوں سلام اور شراحبیل میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ شراحبیل کلاب میں مارا گیا۔ اس کے پس پردہ متعدد قبائل کی عداوت پوشیدہ تھی۔ ان قبائل نے اسلام سے پیشتر ایام جاہلیت کی مشہور ترین جنگیں اور لڑائیاں چھیڑ دیں۔ امرالقیس نے اپنے اجداد کا انتقام لینے اور کندہ کی بادشاہت کو واپس لینے کی کوشش کی۔ وہ قیصر جسٹینین

(Justinian) کی مدد حاصل کرنے کے لئے قسطنطنیہ بھی گیا۔ اُسے امید تھی کہ حیرہ کا حریف ہونے کے باعث رومۃ الصغریٰ کا قیصر اُسے مہربانی کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ کندہ کی بادشاہت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی

باوجود اپنی چندروزہ میعاد حیات کے یہ بادشاہت عربوں کے مستقبل کے لئے غیر اہم ثابت نہیں ہوئی۔ آکل المرار کے عصائے حکومت کے نیچے اتنے قبائل عرب کا مجتمع ہو جانا ہمارے خیال میں جزیرہ نما کے وسطی قبائل کے ایک ہی سردار کے ماتحت مجتمع ہونے کی پہلی مثال ہے۔ یہ اُس تحریک کی تمہید نظر آتی ہے، جو کہ ایک صدی بعد بانی اسلام کے زیر اثر مختلف قبائل کے مجتمع ہونے کا باعث ہوئی۔ البتہ ہنوز وہ مذہبی پہلو مفقود تھا، جس نے اسلام کو ایسی عظیم الشان قوت بخشی۔ کندہ کی حکومت محمد صلعم کی وفات کے بعد قبائل عرب کی "ردت" کے زمانہ میں ختم ہو گئی۔ کندہ کی تباہی تو بہر حال نہ رکتی۔ لیکن اُس کے حالات پر غور کرنے سے یہ ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک صدی میں عربوں نے حکومت کا نظام قائم کرنے میں کس حد تک ترقی کر لی تھی۔

حیرہ کے شمال میں اس طرح تین حکومتیں تھیں جنہوں نے عرب کی حکمرانی بانٹ رکھی تھی جن قبائل نے کہ ان حکومتوں کے قائم کرنے میں حصہ لیا وہ اکثر جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اُنکے خروج کی وجہ سے اُنکے ہمراہ تمدن کے اصول جن سے کہ شمال کے بادیہ گرد کم و بیش بیخبر تھے اشاعت پذیر ہو گئے۔ عرب بالخصوص حیرہ و غسان کے عرب ایران و رومۃ الصغریٰ کی جنگوں میں شریک رہتے تھے۔ اُنہوں نے قریب رہ کر ان دونوں سلطنتوں کے تمدنوں کو دیکھا۔ انہوں نے جنگی تجارب حاصل کئے اور اپنے زمانے کے فن حرب کے بہترین اساتذہ سے جنگی تعلیم حاصل کی۔ اس کی عربوں کے لئے جو اہمیت آگے چل کر ثابت ہوئی۔ اُسکا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ایک طرح کی بیداری تھی، جو کہ آغاز اسلام کی

فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی - یہ خیال کہ خالد اور مثنیٰ جاہل یا نیم وحشی تھے یا اُنکے لشکر چشم زدن میں اور یک روز بادیہ گردوں کی حالت سے باقاعدہ سپاہیوں کی جماعت میں بدل گئے بالکل غلط ہے - عربوں کی ترقی اُن کی مادی اور ادبی تمدن میں بھی، جیسا کہ ہم اگلے لکچر میں دکھلائیں گے، یکساں نمایاں تھی -

---

مَن کی موج

(۱)

کل میرے ایک دوست نے کہا "دیکھو یہ پھول کتنا خوبصورت ہے۔" میں نے سنا اور نفرت سے منہ پھیر لیا، پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک آدمی دکھایا اور کہا "یہ بڑا نیک ہے۔" میں پھر ادھر سے پلٹ گیا۔ لوگ خوبصورت، نیک، اچھا، بُرا اور اسی قسم کے لفظ بولتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ میں انھیں سنتا ہوں تو رنجیدہ ہوتا ہوں۔ جیسے ہی میرے کانوں میں "خوبصورت" کی آواز آتی ہے، ویسے ہی اندر والا کہتا ہے کہ "پھر بدصورت بھی ہوگا!" جیسے ہی میں "نیک" سنتا ہوں، اندر والا پوچھتا ہے "پھر تو بد بھی کہیں ضرور ہوگا۔" اگر میں پرندہ ہوتا تو نیک، بد، حسین، کریہہ غرضکہ سب اسماء صفات کی سطح سے اوپر اُڑ جاتا............

میرے ایک دوست نے کہا "پاک اور عقلمند بنو، تو دنیا کو دس گنا زیادہ فائدہ پہونچے۔" میں نے کہا "تو پاکی کو دور کر دے اور عقل مندی کو ہٹا دے تو دنیا کو بیس گنا زیادہ فائدہ پہونچے۔" وہ خفا ہوگیا۔ وہی اسمائے صفات! کل میں ایک دکان پر گیا، وہاں دیکھا کہ ہر چیز پر رنگ برنگ کی چِٹھیاں لگی ہوئی ہیں، جن پر قیمتیں لکھی ہیں۔ کیا انسانوں پر بھی چِٹھیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ پھر اسمائے صفات کیوں؟ اچھا کیوں؟ برا کیوں؟ نیکی کیوں؟ بدی کیوں؟ ایمانداری، بے ایمانی، فیاضی، کنجوسی، یہ سب کس لئے؟

میں نے ایک فقیر سے کہا: "لوگ فیاض نہوتے تو اچھا تھا!" اس نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر میں نے ایک امیر سے کہا: "لوگ فیاضی کی تعریف نہ کرتے، تو اچھا تھا۔" اُس نے

مجھے اپنے مکان سے نکلوا دیا - وہی اسمائے صفات! نیکی پہلے کی گئی، پھر نیکی کہلائی؛ بہادری پہلے دکھائی گئی، پھر صفت بنی؛ فیاضی، ہمدردی، احسان، ظلم، کنجوسی، سب پہلے پیدا ہوئے، پھران کو نام دئے گئے - دریا سیدھا بہتا ہو، دیواریں کھڑی کردو تو بہاؤ بدل جائے گا - اسی طرح دیواریں کھڑی کرتے جاؤ، تو دریا پانی کی بھول بھلیاں بن جائے گا - وہی نام کا پھیرا صفت بندی، درجہ بندی، اسم بندی، سب دراصل دیوار بندیاں ہیں - سیدھے راستے سے بہت کم لوگ بھٹکتے ہیں - کسی کو نیک مت کہو، کوئی بُرا نہ ہو گا - کسی کو سخی مت کہو، کوئی کنجوس نہ ہو گا - نفع کی خواہش چھوڑ دو، مکانوں سے پہرا ہٹالو، چور ڈاکو غائب ہو جائیں گے - بہادری مٹا دو، بزدلی بھی مٹ جائے گی - حکم اُٹھالو، عدول حکمی نہ ہو گی، اچھی صفتیں اُٹھالو، بُری صفتیں آپ جاتی رہیں گی - دنیا ان دیواروں کو کیوں پسند کرتی ہے ؟

من کی روشنی! یہ بڑی چیز ہے - میں اندھیری رات بھی ہو تو من کی روشنی میں سیدھا اپنے گھر چلا جاتا ہوں - میرے دوست کے گھوڑے کا بھی یہی حال ہے - کل میں نے گلی میں رنگ برنگ کی قندیلیں روشن کیں، فوراً پرچھائیں پڑنے لگی، اور گھوڑا بدکنے لگا - رنگین روشنیاں نہ ہوتیں تو رنگین پرچھائیاں بھی نہ ہوتیں - دوست نے پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا، "اسمائے صفات پیدا کرتا ہوں، نتیجہ تم دیکھ لو" رنگین قندیلیں اچھی صفتیں ہیں، پرچھائیاں بُری صفتیں - اُس کا نام مٹا دو تو اس کا نام بھی نہ رہے - من کی صاف، سفید روشنی سنسار کے ہیر پھیر کے لئے کافی ہے - دیکھیں اس پہیلی کو کون بوجھتا ہے ؟

---

(۲)

"دنیا بدل رہی ہے"

کل اتفاقاً یہ الفاظ مجھے سنائی دئے - میں حسب دستور اپنے مکان کے دروازے پر

بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک نئی عمارت بن رہی ہے۔ مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا اونچا مچان بنایا ہے۔ دو دو تین تین بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے اس مچان پر چڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا .... میں سوچ رہا تھا "کہ کیا اس مکان، اس مچان، ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بناتے ہیں؟ ...... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اڑتے ہیں کہ نیچے والے ہمیں دیکھکر خوش ہوں؟ ...." اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:

"دنیا بدل رہی ہے"

میں نے مڑکر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا، آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک سپنے میں ہنستے ہیں ــــ کہنے لگا:- "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا۔ ولایت کے گانے، امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دینگی ــــ دنیا بدل رہی ہے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں جب کبھی "بیسویں صدی" "نیا زمانہ" "نئی دنیا" "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں، میں نے جواب دیا "ہاں! پرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پرانے چھلکے پر نیا چھلکا نکل رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانے سے پہلے تھا۔" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا "تم نے تو دنیا تج دی ہے، جگ کے الٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا، تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری دھرتی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں۔" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا ــــ

میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں؟ ایک جیب میں ولایتی سونا ہے، دوسرے میں دیسی کسوٹی۔ اسے اس پر کستے ہیں، زرد لکیر دیکھکر اسے کندن سمجھتے ہیں

اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے! میں پھر مکان، مچان اور مزدوروں کی دھن میں لگ گیا۔ یہ دو ہاتھ دو پانوں کے پتلے، اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ نیچے سے اوپر لے جا رہے تھے!

آج میرا دوست مجھے دن بھر شہر میں اِدھر اُدھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں، پرانے اینٹ پتھر کے نئے استھان! پرانی آتما کے نئے چولے!! "یہ نئی سڑک ہے، اس پر ٹریم چلے گی"....... "یہ نیا بنک گھر ہے" "یہ نئی دوکان ہے" "یہ نئے قسم کا مدرسہ ہے" ...... خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا، اور باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا، جیسے لڑکیاں ہنس ہنسکر اپنی سہیلیوں سکھیوں کو پرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں، کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی لیکن اندر والا گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا "اب بھی قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی پور بدل رہا ہے، دنیا بدل رہی ہے" میں ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا ـــ

سامنے ایک حلوائی کی دکان تھی، ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گیا۔ حلوائی سے کہا:

"لالہ! دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا۔ کہا "ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مانتے......." پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا، میں نے کہا "اپنا گز نہیں بدل دیتے" اس نے منہ پھیر لیا........

راستے میں ایک سپاہی ملا، اُس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتکڑی، آنکھ میں شرافت! میں نے کہا "جمعدار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے؟" کہنے لگا: "اس نے اپنے بھوکے بچوں کے لئے آٹا چرایا ہے" میں نے کہا "کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا؟" وہ مجھے بُری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا ـــ سچا بول اندرائن کا پھل ہوتا ہے!

تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہونچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "سیٹھ اشرفی مل کا پُن خانہ" ہزاروں اپاہج اور نکمے جمع تھے۔ زبردستی کے اپاہج! کام کے نکمے!! میں نے داروغہ سے پوچھا "بھائی! انہیں خیرات کیوں دیتے ہو؟" کہنے لگا "نیک کام ہے، سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے" نیک کام! دیا!! فیاضی!!! سب وہی پرانے سانچے، کیا واقعی دنیا بدل رہی ہے۔

پرانے باٹ، پرانا گز، پرانا قانونی معیار، پرانا اخلاقی معیار! دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی! اور اندر سے آتما کی وہی پُرانی گھڑی کی سی ٹک ٹک "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" ــــ میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اُس نے آہستہ سے کہا "معلوم ہوگیا، اب لوٹ چلو۔"

دھرتی آئے دن نیا سونا اُگلتی ہے، سنسار اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے، پُرانے باٹ گھس گئے، پُرانے گز چھوٹے ہوگئے، بہت سے پُرانے جرم ہلکے ہوگئے، پُرانی نیکیاں، بدیاں بنیں، پُرانی بدیاں نئے سانچوں میں ڈھلیں، پھر دنیا انہیں کیوں نہیں بدلتی؟ بالکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کلیجے سے کیوں لگائے ہوئے ہے؟ ست جگ کے ست کو کلجگ میں بھی ست کیوں جانتی ہے؟ ایک پُن خانہ بنا کر دس کی بنیاد کیوں رکھتی ہے؟ آج سانپ کی رکھشا کرکے کل نیولا کیوں پالتی ہے؟......... نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں ڈھونڈھتی؟ وہی حلوائی کی بات:

"گاہک نہیں مانتے"

اب میرا دوست دھرتی کی کروٹ کا قائل نہیں رہا، میں اُس سے کبھی کبھی ہنسی سے پوچھتا ہوں "دنیا کب بدلے گی؟" اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو، وہ بہت دھیمی

آواز سے جواب دیتا ہے:

"جب گاہک مانیں گے"

(باقی آیندہ)

غزل

جناب دل شاہجہانپوری

جویائے حقیقت ہوں عالم سے جداگانہ
دل مائل کعبہ ہے رُخ جانب بتخانہ

تاثیر بیاں بھر دے اے گردش پیمانہ
ساقی کو سنانا ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرّے میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اے اہل نظر دیکھو خاکستر پروانہ

پردے سے عیاں ہو کر پردے میں نہاں ہو جا
چھا جائیگی خود حیرت اے جلوہ جانانہ

ہے مشرب رنداں میں انداز طلب یہ بھی
ہر گردش ساغر پر اک نعرہ مستانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جاننا منزل کی
چل وادیٔ ایمن تک سن طور کا افسانہ

یوں جل کے سر محفل تصویر وفا کھینچی
پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازی پروانہ

حالات الم کہکر بیمار نے دم توڑا
آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل افسانہ

کیا جانئے کہاں موجیں کھینچے لیجاتی ہیں
پہنچا ہیں ساحل تک اے ہمت مردانہ

دنیا رحقیقت میں آزاد تعین ہیں
ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بت خانہ

اک مست ابھی اے دلؔ کہتا ہوا گذرا ہے
صد زہد بیک جرعہ نذر رہے ومیخانہ

*

ڈراما کیا چیز ہے؟

میں ہندوستانی اکادمی کی فرمایش سے برنارڈ شا کے ناٹک سینٹ جون کا ترجمہ کر رہا ہوں
اور اس پر مقدمہ بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ اس مقدمہ کا پہلا خاکہ ہے جو مکرمی جناب ڈاکٹر
تارا چند صاحب سکرٹری ہندوستانی اکادمی کی اجازت سے جامعہ میں شائع کیا
جاتا ہے۔

(۱)

آرٹ کی تعریف | قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ
آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال
ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ
دو مختلف معانی پر حاوی ہے

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیا اور ذہنی تصورات کی تشکیل
اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں، یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن
پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مشاہدہ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے تسکین دیتی ہیں۔
مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ
دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن
میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد
افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لئے

یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کر دے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب، اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجئے۔ اُس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈھتے ہیں اور جس سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا مشاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اسکا موضوع انسان کی زندگی اُس کے جذبات، اُس کے خیالات، اُس کی آرزوئیں اور اُس کے کام ہوتے ہیں۔ بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر، ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ نہاں ہوتی ہے کہ ان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے

لہروں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اُس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آنا آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈراما میں ہوتا ہے۔

(۲)

ڈراما بحیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے | ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اسکا مصدر δραω ہے جس کے معنی ہیں کرکے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنف کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کرکے دکھائے جاسکیں۔ ڈراما میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر انکی گفتگو اور انکے کاموں کو دہرائیں تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہوسکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگذشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کی جذبات، انکے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جاسکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو

ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دے جائیں اُس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے مگر ڈراما میں قصے کا زمانہ وقوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہی۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کراتا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا سکتے ہیں مگر ڈراما میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانا پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول کے ڈراما میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہی۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈراما لکھتا ہی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے۔ اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہی کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلو کو آسانی سے پر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آجائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کے لئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل، انہیں دونوں چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اُس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، اُنکے جذبات و خیالات اُنکے اغراض و مقاصد، اُن کے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش، ان کی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ کھینچنا ہی۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً متوجہ کرلیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو ان کا ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اُس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اُس کے

عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کے لئے ابھی ایک شرط باقی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے اس لئے جس ناٹک کا ذکر اوپر کی مثال میں ہے وہ کامیاب اس وقت کہلائے گا جب اس میں اکبر اور اس کے ساتھیوں کے حالات اس طرح دکھائے جائیں کہ دیکھنے والے پر زندگی کے گہرے راز جو اکبر میں اور نوع انسانی کے ہر فرد میں مشترک ہیں کھل جائیں۔

ابتک ہم نے ڈراما پر بہ حیثیت آرٹ کے ایک شعبے نظر ڈالی ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذوق مشاہدہ کو انسانی زندگی کا دلکش جلوہ دکھا کر تسکین دے۔ اس سے ضمنی طور پر کسی خاص اخلاقی، سیاسی، معاشی نظرئے کی تبلیغ، یا عام اصلاح اور تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لئے کھلی ہوئی کوشش نہ کیجائے بلکہ وہ تماشے کے لطف کے ساتھ پردے پردے میں حاصل ہو جائے۔ اگر اصلاحی یا تعلیمی رنگ غالب آگیا تو پھر ڈراما ڈراما نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی قصہ بن جاتا ہے اور خالص آرٹ کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳)

ڈراما کے بنیادی عناصر | ڈراما دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے جو مساوی اہمیت رکھتے ہیں (۱) قصہ (۲) اشخاص۔

ڈراما کے قصے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے واقعات بہت موثر اور جاذب نظر ہوں، ہر چیز کر کے دکھائی جا سکے، کوئی جزو ایسا نہ ہو کہ مصنف کو الفاظ میں سمجھانے یا بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ قصے کے کچھ اجزا خصوصاً ایسے حصے جن کے دیکھنے سے کراہت ہو اگر عمل کے ذریعے سے نہ دکھائے جائیں بلکہ اشخاص کی گفتگو میں انکا ذکر آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن ایسے حصے ڈراما میں جتنے کم ہوں اچھا ہے، کیونکہ جب کوئی ناٹک تھیٹر میں دکھلایا

جاتا ہے تو دیکھنے والے سارے قصے کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس کا بیان کانوں سے سن کر انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔

قصے کو زیادہ دلچسپ اور دلنشیں بنانے کے لئے ضروری ہو کہ واقعات کا رخ بالکل سیدھا اور یک رنگ نہ ہو بلکہ اُن کا رجحان کم سے کم دو مختلف سمتوں میں ہو، تاکہ دیکھنے والے کو آخری سین تک یہ اشتیاق رہے کہ انجام کیا ہوگا۔ اس اثر کو گہرا کرنے کے لئے ڈراما میں دو یا زیادہ قوتوں کی باہمی نزاع اور کشمکش دکھائی جاتی ہے خواہ یہ مجرد قوتیں مثلاً تقدیر، وتدبیر نیکی اور بدی وغیرہ ہوں یا اشخاص اور جماعتیں ہوں۔

سب سے اہم بات جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہے کہ قصے کے واقعات سے عمومیت ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ زندگی کے جو نشیب و فراز، قصے کے اشخاص کو پیش آئے ہیں وہ دنیا میں سب کو پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ڈراما محض تھوڑی دیر کے لئے ہمیں متوجہ کر سکے گا اور ہمارے دل پر اس کا کوئی گہرا نقش نہ بیٹھنے پائے گا۔

اشخاص کی اہمیت ڈراما میں ناول سے اور افسانے کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مرقع کی مرکزی تصویر انسان کی ذات ہو اور خارجی دنیا محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ عالم فطرت کے جلوے دکھائے جاتے ہیں انکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آئینے کے لئے زنگار کا کام دیں۔ اور چونکہ ڈراما کو فوری اور قوی اثر پیدا کرنے کے لئے ہر نقش میں گہرا رنگ بھرنے کی ضرورت ہو اس لئے اشخاص کی سیرت میں بھی تازگی اور زندگی پیدا کرنے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ڈراما نگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذب نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہو اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اُسے اس کی اجازت نہیں کہ ناول لکھنے والوں کی طرح کسی شخص کی نفسی کیفیات کی تحلیل اپنی طرف سے کر سکے۔ اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لئے مناسب موقعے پیدا کرنا ایک دوسرے سی

مشابہ اور متضاد اشخاص کو اس طرح جمع کرنا کہ ان کی گفتگو سے ہر ایک کے دل کی گہرائی پر روشنی پڑے، ان میں باہمی کشمکش پیدا کرنا تاکہ ان کی خصوصیات اچھی طرح ابھر آئیں یہی ڈراما نگاری کا کمال ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ اشخاص میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو اُن کی ناگزیر صفت ہے ایک طرح کی عمومیت پیدا کیجائے۔ شخص یا کیرکٹر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سیرت میں جداگانہ اور مخصوص صفات رکھتا ہو جو اُسے دوسروں سے ممتاز کریں۔ ڈراما نویس مجبور ہے کہ اکثر صورتوں میں اس شان کو قائم رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس سے یہ بھی توقع کیجاتی ہے کہ وہ اپنے قصے کے اہم اشخاص کو کسی طبقے، کسی جماعت یا پوری نوع انسانی کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرے تاکہ اُس کی مثال دوسروں پر بھی صادق آسکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اوپر کے صفحوں میں ڈراما کے بنیادی عناصر کا عام حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈراما کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم میں یہ عناصر ایک خاص صورت اختیار کرتے ہیں اس لئے ان سے کسی قدر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقسام ڈراما کے ذکر کے سلسلے میں ان پر جدا جدا نظر ڈالی جائے۔

(۴)

ڈراما کی قسمیں ڈراما کے قصے کا پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے احساس و جذبات پر جو عام اثر پڑتا ہے اُس کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) المیہ (۲) فرحیہ۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ڈراما میں جذبات پر بہت گہرا اثر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ تھوڑی سی دیر میں دیکھنے والے کا احساس و مشاہدہ کافی لطف اندوز ہو سکے۔ جس طرح انسان کے سارے جذبات میں احساس کی دو بنیادی کیفیتوں راحت و الم میں سے کوئی کیفیت ضرور موجود ہوتی ہے اُسی طرح ڈراما کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی راحت یا الم کا

رنگ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی ڈراما زندگی کا المناک پہلو دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے دل پر لطف مشاہدہ کے ساتھ حسرت والم کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کبھی فرحناک پہلو کا منظر دکھاتا ہے اور انسان کو محظوظ ہی نہیں بلکہ مسرور بھی کرتا ہے۔ یوں تو ہر ڈرامے میں یہ دونوں رنگ موجود ہوتے ہیں لیکن کسی میں ایک غالب ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا جس ڈرامے میں الم کا رنگ زیادہ گہرا ہو وہ المیہ کہلاتا ہے جس میں راحت کا ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ بعض وقت المناک اور فرحناک عناصر کا پلہ برابر ہوتا ہے۔ ایسے ڈراما کو ہم المفرحیہ کہہ سکتے ہیں اور اسے ایک تیسری قسم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ رواج ڈراما کی دو ہی قسموں نے پایا ہے۔ اس لئے ہم صرف انہیں ذکر کرینگے۔

المیہ | جو شخص مشاہدہ نفس سے کام لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ الم کا جذبہ راحت سے زیادہ قوی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ راحت و مسرت سے انسان کے جسم و روح پر ایک مستی سے چھا جاتی ہے ایک نشہ سا مسلط ہو جاتا ہے اس لئے اس کا احساس کسی قدر کند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتہائی خوشی کے عالم میں انسان کو اپنی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اور جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو اسے ہوش آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا خوش تھا۔ بہ خلاف اس کے الم حس اور ادراک کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ انسان کو اس کی ہر خلش، ہر کسک، صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی جسمانی یا روحانی کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا احساس ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے۔ کسی دوسرے احساس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما کی دو خاص قسموں میں سے المیہ اثر کے لحاظ سے فرحیئے سے بہت بڑھا ہوا ہے چنانچہ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈراما کا اصل آرٹ المیئے میں ظاہر ہوتا ہے اور فرحیہ محض ایک دل بہلانے کا کھلونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال مبالغے پر مبنی تھا اور جدید زمانے میں غالباً شیکسپیر کے فرحیوں کے دیکھنے کے بعد اہل نظر سے بدلنے پر مجبور ہوئے لیکن اس میں اب بھی اسی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ہر زبان میں بہترین ناٹک تقریباً سب کے سب المیئے ہیں۔

المیے کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو کیفیت لوگوں کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اس میں

سب سے نمایاں حسرت والم کے جذبات ہیں لیکن انکے ساتھ خوف وعبرت، ہمدردی اور تعریف بھی ملی جلی ہوتی ہے۔ جو ڈراما محض رنج ومصیبت کی تصویر ہو جس کے دیکھنے سے سوائے غم اور اندوہ افسوس اور رقت کے اور کوئی اثر دل پر نہ ہو وہ المیہ نہیں بلکہ میلوڈراما (رقت انگیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ کسی شرابی کا شراب خوری کی بدولت، تباہ ہو جانا، کسی جواری کا قمار بازی کے پیچھے گھر بار لٹا دینا، ایسے واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر رنج ہوتا ہے تکلیف پہنچتی ہے لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کی طبیعت میں غیر معمولی درد ہو کسی کو ان بدنصیبوں سے ہمدردی نہیں ہوتی اس لئے یہ واقعات میلوڈراما کے موضوع ہو سکتے ہیں مگر المیے کے نہیں۔ کسی بیمار کے جسمانی یا دماغی آلام، کسی مفلس کی فاقہ کشی کی مصیبت دیکھنے والوں کے دل میں افسوس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے لیکن بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں اس لئے جو قصہ محض ان چیزوں کے ذکر پر مبنی ہو اس میں المیئے کا رنگ پیدا نہ ہوگا۔ المیے کی شان یہ ہے کہ اُس کا ہیرو بلند ہمت اور بلند سیرت ہو اُس پر کوئی ایسی مصیبت پڑے جو دل میں رعب اور دہشت پیدا کرتی ہو، جس میں خود ہیرو کا قصور نہ ہو یا ہو بھی تو نیک نیتی سے، وہ ہمت اور شجاعت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے۔ مگر آخر میں مغلوب ہو کر ہلاک یا تباہ ہو جائے۔ مثال کے لئے شیکسپیر کا المیہ آتھیلو لے لیجئے۔ آتھیلو ایک عرب نسل کا سپاہی ہے جو وینس کی جمہوری ریاست میں سپہ سالاری کی خدمت پر مامور ہے۔ وینس کے ایک امیر کی لڑکی ڈیسڈیمونا اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور آتھیلو بھی اس کی محبت میں دارفتہ ہو جاتا ہے۔ باوجود ڈیسڈیمونا کے باپ کی مخالفت کے وینس کے فرمان رواڈیوک کے حکم سے ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ آتھیلو کا ایک بدنفس ماتحت ایاگو کچھ کینہ پروری سے اور کچھ مقتضائے طبیعت سے اُس کے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ڈیسڈیمونا ایک اور فوجی افسر کیسیو سے ناجائز محبت رکھتی ہے۔ ایاگو کی شیطانی چالوں سے آتھیلو کا یہ شبہ یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ ڈیسڈیمونا کو قتل کر دیتا ہے اور اس کے بعد خود بھی جان دیدیتا ہے۔

اس ڈراما کو پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ آتھیلو کی بہادری، بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سادگی

اور ڈیسڈیمونا کا حسن، اُس کا بھولاپن اُس کی محبت عصمت وعفت وفاداری، ہمارے دل کو ابتدا سے موہ لیتی ہیں اور ہم ہیرو اور ہیروئن سے سچی محبت اور انکا سچا احترام کرنے لگتے ہیں۔ پھر رقابت کا جذبہ جو آتھیلو کے سینے میں جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور اس کے جسم و روح کو جلائے ڈالتا ہے ہماری طبیعت میں ایسی گہری دہشت پیدا کرتا ہے جو شائد سخت سے سخت جسمانی اذیت کا منظر دیکھ کر بھی نہ پیدا ہوتی۔ آتھیلو جس جوانمردی اور عالی ظرفی سے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں، مگر آخر میں جب ہم پر یہ دردناک حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں اتھیلو کا سا ہیرو غصے اور غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے ڈیسڈیمونا کی سی ہیروئن اپنے چہیتے اور چاہنے والے شوہر کے ہاتھوں بےگناہ قتل ہوتی ہے تو ہم رنج والم، افسوس اور ہمدردی کے جوش سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک پراسرار رعب چھا جاتا ہے، ایک گہری عبرت طاری ہو جاتی ہے اور یہی المیے کی جان ہے۔

المیہ لکھنے میں یہ اثر مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے کبھی اس کا ہیرو باوجود اپنی اعلیٰ سیرت کے کسی خلقی کمزوری یا غلط فہمی کے سبب سے خود اپنی تباہی کا باعث ہوتا ہے، کبھی وہ مافوق الافراد یا مافوق الفطرت قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ہلاک ہوتا ہے اور کبھی اس کے پیش نظر دو متضاد مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن میں سے وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ڈراما کا ایک بڑا اہم عنصر عمومیت ہی یعنی قصے کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک خاص شخص کی زندگی پر عام انسانی زندگی کا قیاس کیا جا سکے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ڈراما لکھنے والے بہت سی ذرائع اختیار کرتے ہیں، ایک ذریعہ یہ ہے کہ قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی اور بلند مرتبہ شخص بنایا جائے جس کا انجام ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر ڈالے اور سارے انسانوں کے لئے سرمایہ عبرت ہو یا پھر اس کی ذات ایک علامت

(Scapegoat) ہو جس سے پوری نوع انسانی یا ایک پوری قوم مراد لی جا سکے۔ مثلاً ٹیگور کے ڈرامے پوسٹ آفس کا ہیرو امال مشرقی انسان کی روح کی علامت مجسم ہے اور اس کی تمنائے آزادی نوع انسان کی اس ابدی آرزو کی علامت ہے کہ وہ عالم مجاز سے نجات پا کر عالم حقیقت تک پہنچے۔

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ قصے کے ہیرو پر جو مصیبت آئے اس کا ذمہ دار مافوق الفطرت قوتوں مثلاً تقدیر کو یا دیوتاؤں کو یا شیطانی روحوں کو قرار دیا جائے۔ اس سے قصے کے پڑھنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان قوتوں نے جن کا اثر سب انسانوں پر عام ہے جو ایک شخص کے ساتھ کیا وہی سب کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ جدید زمانے میں لوگ ان چیزوں کے قائل نہیں اس لئے ڈراما نویس عموماً ان کی جگہ وراثت سے کام لیتے ہیں یعنی کسی شخص کی مصیبتوں کا ذمہ دار اس کے اسلاف کے موروثی اثر کو قرار دیتے جیسے ابسن کے ڈرا "خبیث روحیں" کے ہیرو کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ اس روگ کی بدولت ہوا جو اس نے اپنے باپ سے ترکے میں پایا تھا۔

تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ ڈراما کے اصل قصے میں ڈراما نویس ایک ضمنی قصہ بھی داخل کر دیتا ہے اس میں وہی افسوسناک واقعات جو اصل قصے میں پیش آئے تھے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں مثلاً شیکسپیر کے کنگ لیر میں جو ناشکر گذاری کا برتاؤ لیر کی بیٹیاں لیر کے ساتھ کرتی ہیں وہی گلوسٹر کے بیٹے گلوسٹر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس تکرار کا اثر دیکھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ نیکی کا بیج بونا اور بدی کا پھل پانا کچھ لیر ہی کے لئے نہ تھا بلکہ دنیا میں سبھی کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسے کے قصے کی یہ عمومیت عبرت کے اثر کو بڑھاتی ہے مگر رنج والم کے اثر کو گھٹا دیتی ہے۔ مصیبت کا کوئی منظر دیکھتے وقت اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ حالت زندگی میں ہر شخص پر گذرتی ہے تو نیش الم کی کھٹک بہت کچھ کم ہو جاتی ہے اور آرٹ کے نقطہ نظر سے ایسے میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ آرٹ جو کیفیت دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس کی

گنجایش نہیں کہ کوئی جذبہ خواہ رنج والم ہو یا راحت ومسرت حد سے بڑھ جائے کیونکہ پھر احساس میں جمالیاتی رنگ نہیں رہتا جس کے لئے تناسب اور موزونیت لازمی ہے۔ اگر فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ نالہ پابند نے نہیں ہے تو وہ فریاد اور وہ نالہ چاہے آرٹ سے بڑھ کر ہو مگر آرٹ نہیں کیونکہ وہ سننے والے کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تو ہے مگر اس طرح کہ ان سے ہم آہنگ نغموں کی جگہ بے سری صدائیں نکلتی ہیں۔

اسی وجہ سے باکمال المیہ نویس مصیبت اور تکلیف کے مناظر بہت بڑھا کر یا بہت دیر تک نہیں دکھاتے اور جو کچھ دکھاتے بھی ہیں اس کے المناک اثر کو کم کرنے کے لئے یا تو عمومیت سے کام لیتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے یا بیرونی عظمت اور شجاعت پر زور دے کر ایک تسکین کا پہلو نکالتے ہیں یا طرز بیان میں تشبیہ واستعارے کی لطافت وندرت اور دوسری شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں تاکہ خیال کسی قدر بٹ جائے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ المیہ لکھنے کے لئے بہ مقابلہ نثر کے نظم زیادہ مناسب ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ عہد قدیم میں المیہ ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا۔ جب سے نثر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا اسی وقت سے ادب میں المیے کا معیار بھی کم ہونے لگا چنانچہ نثر میں اعلیٰ درجے کے فرحیے بہت کثرت سے ہیں مگر المیے معدودے چند ہی ہیں ان میں سے غالباً سب سے بلند درجہ گوئٹے کے فاؤسٹ کا ہے۔ گوئٹے نے اپنے زمانے کے مذاق سے متاثر ہو کر فاوسٹ کو نثر میں لکھا لیکن اس میں گیتوں اور سنگتوں کے نام سے نظم کا حصہ بہت کافی ہے اور خصوصاً زیادہ المناک ٹکڑے۔ سب کے سب نظم میں ہیں اور جتنے اچھے المیے نثر میں ہیں ان کا مقصد زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ جمالیاتی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ (باقی)

دلّی کا انوکھا پن اور بھبن

میر باقر علی صاحب مرحوم دلی کے آخری داستان گو تھے۔ سات مہینے ہوئے
انکا انتقال ہوگیا۔ جن لوگوں نے انکی داستان سنی ہے۔ ان کا دل اب تک دلی
کی اصلی زبان کی گھلاوٹ اور حلاوت کے مزے لیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اُن کا
سارا کمال تقریر میں تھا تحریر میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن تقریر تو مرحوم کے
ساتھ گئی اب تو جو کچھ ہے تحریر ہی ہے۔

یہ مضمون میر صاحب مرحوم نے ہمدرد مرحوم میں شائع ہونے کے لئے دیا تھا
مگر کسی وجہ سے چھپ نہ سکا ہم اسے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔
ممکن ہو کہ بہت پڑھے لکھے حضرات میر صاحب کی زبان میں مین میکھ نکالیں یا ان کے
فلسفے پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے مرحوم کی زبان پر
حرف گیری کی تو انکی روح جنت سے کہے گی "یہ ہماری زبان ہے پیارے" اور اگر
انکے فلسفیانہ مسائل پر معترض ہوئے تو جواب ملے گا "شعرم را بہ مدرسہ کہ برد"

میں دلی کا رہنے والا ہوں بچپن سے بڑھاپا آیا لیکن میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ دلی
کی مڑک کیا ہو۔ شہر تو سبھی بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں۔ بن گئے بن گئے بگڑ گئے بگڑ گئے
مگر واہ ری دلی تیری ادائیں کہ سبھی قوموں نے تیرے چکر کاٹے پتھورا نے برکما کی مسلمانوں
نے طواف کئے اب انگریزوں نے بپ تسما دیا تو ذرا چین سے کونے میں گھونگھٹ نکالکر
بیٹھیں لیکن بیٹھنا کیسا اب پھر اپنے بناؤ میں لگی ہوئی ہیں اور کیوں نہ بناؤ کریں کہ دلی کی
جوانی بڑھاپا اپنے ہاتھ ہے جب بڑھاپے سے جی گھبرایا اور اکتایا پھر نئے سرے سے جوانی
نکالی اور کسی وضع دار کی تلاش شروع کی لیکن دلی کی اب کی دفعہ اس کو خدا نظر بد سے بچائے

جوانی پھبکی ہے اور جوبن پھٹا پڑتا ہی۔ ہیں کسی عاشق کی چھاتی پر بال جو دلی کی نکیلی چھاتیاں جواب
ابھر آئی ہیں انکی طرف نگاہ اٹھاکر بھی دیکھے۔ دلی ہمیشہ بسکر بنی اور اب کی بار تو بکر بسی ہے۔ ورنہ
اس ست خصمی اور ہرجائی نے طرح طرح کے نام اپنے رکھے پتھورا کے زمانے میں کچھ بھر سیری
تغلق آباد، عادل آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، پرانا قلعہ، شاہجہاں آباد غرض طرح طرح کے ناموں
سے پکاری گئی اور اب کے تو کمال ہی کیا ہے چونکہ نئی نویلی ہیں تو نام بھی نئی دلی رکھا گیا ہے۔
ایک دفعہ دنیا کی تارک ہوکر سو دو سو برس تک ایسی لاپتہ ہوئیں کہ کوئی مورخ بھی پتہ نہ لگا سکا
اور ۵۷ء کے بعد سے جو مجھ جیسے دلی میں آباد ہیں انہوں نے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ سو دو سو برس
کے واسطے ہم دلی والے بھی ایسی گمنام زندگی بسر کریں کہ کوئی ہمارا نام بھی نہ جانے کہ دلی میں
کون کون آباد تھے۔ خیر جو چاہیں سو کریں دلی والے ہیں اپنے افعال کے مختار ہیں۔ لیکن ایسوں کے
واسطے دلی نے بھی کہدیا ہے کہ تم جیسا میں چاہتی ہوں ویسے نہ بنو تو میں بھی تمہارا نام نہ بدل دوں
تو مجھے دلی نہ کہنا۔ ورنہ دلی نے بادشاہ پیدا کئے عالم بنائے خلیق بہادر سچے ایماندار کاریگر نمک خوار،
اگر اس زمانے کے واقعات لکھوں تو مضموں کا طومار ہو جائے گا۔ صرف ایک نمکخوار کا تذکرہ
پیش کرتا ہوں ناظرین اندازہ فرمالیں گے۔ شاہجہاں نے جب لال قلعہ بنانیکا ارادہ کیا تو اُوستا
حامد مستری کو بلاکر نقشہ دیا اور فرمایا کہ جلد یہاں قلعہ بنا دو۔ اُوستا حامد مستری نے عرض کی بہتر۔ اب
یہ حال عرض کروں کہ آج کل علما اور مشاہیر عالم نے تو قلعہ کے واسطے تال کٹورا انتخاب فرمایا اور
شاہجہاں کا دماغ تو ماتا ہوا ہے یہ جمنا کے کنارے کیوں ڈوبا یہ بحث نہایت فلسفیانہ ہے مگر طویل
اور نہایت دلچسپ کہ شاہجہاں نے یہی جگہ کیوں پسند کی کیا اس وقت تال کٹورہ نہ تھا؟ بات یہ
ہے کہ دلی گرم جگہ ہے اور یہاں کی زمین شور ہے شاہجہاں نے وہ جگہ پسند کی جہاں سے جمنا
سیکڑموں برس سے شورہ دھو دھو کرلے گئی گو زمین نمناک ہی لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شاہجہاں
کے قلعہ کو تین سو برس گذرے اور پتھر بھی سنگ سرخ لگا ہے کہ جو جلد لونی لگ کر برباد ہو جاتا ہے
لیکن شاہجہاں کا قلعہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوا نہ کوئی پتھر چٹخا نہ لونی لگی اور

آج کل کی نئی عمارتیں کہ جن کو بنے ہوئے جما جما آٹھ دن ہوئے ان میں لونی شروع ہو گئی اُس
زمانے میں کوئی مشین ایسی نہ تھی کہ پتھر کو ٹھوک بجا کر کان سے لیتی ۔ اب سنئے کہ تمام قلعہ کا پتھر آگیا
اور اوستا حامد غائب ۔ دو برس گذر گئے اور اوستا حامد کا پتہ نہ لگا تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ دوسری
بنیادیں کھود و جب بنیادیں کھدنی شروع ہوئیں تو اوستا حامد نے حاضر ہو کر آداب بجایا بادشاہ نے
فرمایا کہ تم کہاں تھے تو اوستا حامد نے دست بستہ عرض کی کہ حضور کا شوق تو مقتضی اس امر کا تھا کہ
قلعہ شام تک بن جائے اور نمکخوار بنا دیتا لیکن سو دو سو برس کے بعد دیواریں شق ہوتیں ۔ بال پڑتے
تو اس وقت کے لوگ کہتے کہ بادشاہوں کے ایسے نمک حرام نوکر تھے کہ اپنے فائدے کے واسطے
جلد از جلد ایسی بودی عمارت بنائی اب خادم نے نیو کو چھوڑا برساتیں پڑیں پانی بھرا جہاں سے
نیو کو جھومنا تھا جھومی دبنا تھا دبی اور یہ پتھر دو برس تک برسات میں بھیگے جاڑے میں سکڑے
گرمی میں پھیلے جس کو ٹوٹنا تھا ٹوٹا تو نی لگنی تھی لونی لگی اب نمکخوار شام تک قلعہ بنا دیتا ہے ۔
یا تو دلی والے ایسے تھے اور اب جو مجھ جیسے آکر آباد ہوئے تو انہوں نے ایمانداری انصاف
خدا ترسی کاریگری وغیرہ کو پرانا سمجھ کر اور یہ کہکر چھوڑ دیا کہ پُرانی باتوں کو کیوں کام میں لائیں وہ
اگر معاملے کے صاف تھے تو ہم معاملہ کیوں صاف رکھیں ۔ جو جو واقعات میں دیکھ رہا ہوں
اگر دو چار واقعات بھی لکھوں تو طول ہوگا ۔ غرض دلی یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی ہے ۔ اسی
طرح سے دلی کی اللہ بخشے ایک بہنیلی تھیں اور انکی بھی تمام عادتیں قریب قریب ایسی ہی تھیں جیسے
دلی کی ۔ اب یہ جوان ہوئیں تو انکی شادی ہوئی اللہ نے فرزند نرینہ عطا فرمایا یہ اپنے بچہ کی محبت
میں دموں دیوانی تھیں بعض انسان بعض حیوانوں میں اولاد کی محبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے
اتفاق سے بچہ کا باپ مرگیا اب جو بُرے کو آیا اُس نے افسوس کیا کہ افسوس اس سن میں اور یتیمی
اس نیک بخت کو بچہ کا یتیم بنا ناگوار گذرا اس نے عدت کے اندر ہی نکاح کر لیا وہ خاوند بھی قضائے
الہی سے فوت ہو گیا اب کی دفعہ اس نے پھولوں کے دوسرے ہی دن نکاح کیا اور اس خاوند
کی موجودگی میں اوروں سے بھی ساز باز رکھا غرض وہ بھی مرا اسی طرح اس نیک بخت نے سات

نکاح کئے جب ساتواں خاوند بھی جاں بحق ہوا تو اس نے رو رو کر کہا کہ واہ اللہ میاں اب کی بد بختی تو یاد رہے گی لیکن میں اپنے بچہ کو یتیم کہواؤں یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ دلی کی انوکھی اداؤں کا لکھنا تو مشکل ہے۔ دلی نے اردو زبان بنائی اور اس میں بھی تمام زبانوں سے انوکھا پن رکھا وہ کیا دنیا میں جتنی زبانیں بنیں وہ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرنیکے واسطے اصوات بسیطہ سے جملے بنائے انکا نام زبان ہوگیا لیکن دلی نے اردو کے گوہر سخن کے واسطے دو دریائے ذخارا ور ناپیدا کنار تلاش کئے اور وہ دونوں دریا کونسے دریا ہیں ایک سنسکرت اور دوسرا عربی اور یہ دونوں دریا وہ دریا ہیں کہ جن سے تمام دنیا کی زبانیں سیراب ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو کسی زبان سے پیچھے رہنے والی نہیں معلوم ہوتی علاوہ اس خوبی کے یہ زبان امانت دار ایسی ہے کہ جس زبان کا جو لفظ لیتی ہے اس کو اپنے گھر میں ایسا اچھوتا رکھتی ہے کہ اس کی شکل وصورت میں کوئی خرابی نہیں آنے دیتی۔ جیسا وہ لفظ اپنے گھر میں تھا اسی طرح سے اردو میں رہتا ہے اور لفظوں ہی پر کیا موقوف دلی میں جو آیا اس کو دلی نے ایسا آرام وآسایش سے رکھا کہ دنیا کے کاموں سے اس کو کوئی غرض ہی نہ رہی لیکن ایسا کیوں ہوا آپ غور فرمائیں کہ ہندوستان مثلث نما ملک ہے اگر بفرض محال آپ ہندوستان کو کاٹ چھانٹ کر گول سمجھ لیں تو دلی قریب قریب مرکز ثابت ہوگی اور اور مرکز کو گو ہم کسی متحرک جگہ بیٹھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم ساکن ہیں مگر کیا سکون ہوگا ہرگز نہیں۔

اور دلی میں تو مرکز ہونے کی وجہ سے حقیقی سکون ہے یہاں جو آیا ایسا ساکن ہوا کہ دنیا نے اس کے نام کو بھی حرکت نہ دی کہ دلی میں فلاں فلاں آباد تھے ۔ دلی نے بہت سے نکاح کئے لیکن اس شرط پر کہ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گی ۔ اگر دلی کے نئے دولہا کو پرانی سیج گوارا نہ ہوئی تو دلی ذرا کھسکیں اور کہا بس چنانچہ اب کی دفعہ بھی بنے بنائے گھر کو چھوڑا . .

. . . . . . لال حویلی ہر طرح کے آرام کا ٹھیا تھی اور کیسی عمارت جو سونے کے پانی سے گندھی ہوئی اور جواہر کے ریزوں سے چنی ہوئی ۔ اور ہر نگینہ جواہر کا جہاں جڑا ہوا تھا اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ معمار قدرت نے اس نگینہ کو یہیں کے واسطے بنایا ہے مثلاً ایک پتہ کسی بیل یا بوٹیکا بنانا

ہے اور یہ دکھاتا ہے کہ وہ پتہ درخت میں لگا ہوا مڑ گیا ہے تو جہاں سے مڑا ہے کچھ خشک سا ہو گیا ہے
اور بدرنگ ہے اور آدھا تر و تازہ ہے مگر ایک ہی نگینے میں یہ دونوں حالتیں دکھائی ہیں جوڑ نہیں
ہے علاوہ اس خوبی کے ہر بیل ہر بوٹے کا رو ربل نوک پلک کا لطف جاننے والا ہی کہہ سکتا ہے
اور اس کے منہ سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ عقب حمام جتنی خوبیاں حمام میں ہونی مناسب
ہیں سب موجود حمام کشادہ ہو روشن ہو، معتدل ہو پرانا ہو اور گنبد کے بیچ میں سے کبھی کبھی
ٹھنڈی بوند پانی کی ٹپکے لیکن ایک حمام سب مزاجوں کے موافق نہیں ہوتا ہر شخص کے مزاج
کے موافق بنایا جاتا ہے حمام کا فرش دیواریں نہ ٹھنڈی ہوں نہ گرم حوض کا پانی اتنا گرم ہو جو بدن
پر سیال نہ معلوم ہو چنانچہ اس حمام کا پانی آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی یکساں رہتا تھا دیوان خاص
کی تو ایسی خوبی تھی کہ جس کے بیان سے زبان قاصر۔ کسی شاعر نے مجبور ہو کر لکھ دیا کہ۔ شعر۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

تخت طاؤس اپنی خوبیاں اپنے منہ سے بول رہا تھا ایران میں جو اُس کی درد سا ہوئی یہ تخت
اپنی اُس عزت کو جو دلی میں تھی اُس کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے دونوں آنکھوں سے
ساون کی جھڑی اور بھادوں کی بھرن ہے کہ برس رہی ہیں برسات میں مور کو مستی ہوتی ہے
اور پر نکل آتے ہیں لیکن یہ بیچارہ ٹنڈ مُنڈ پر نُچا دلی کی طرف ٹڈیاں بھرتا ہے تو چوٹ کھاتا ہے
اس وقت یہ دوہا بصد حسرت و یاس زبان سے نکل جاتا ہے۔ دوہا۔ نا مورے پنکھ نہ پاؤں
بل میں اپنکھ پیا دور۔ اُڑ نہ سکوں گر گر پڑوں رہوں بسور بسور۔ اور کبھی کہتا ہے اُڑ کے پہنچوں
لیکن۔ بے پر و بال اڑا نہیں جاتا۔ میزان عدالت اب بھی یہ کہہ رہی ہے کہ یہاں کسی
زمانے میں عدالت تھی اور نہر سعادت خاں اسی کے نیچے بہہ کر یہ بتا رہی ہے کہ یہ وہ جگہ ہے
جہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، جھروکہ جس میں بادشاہ بیٹھ کر جمنا کی موجیں اور
سرسبز میدانوں کا ملاحظہ فرماتا تھا۔ دیوان عام موتی مسجد مہتاب باغ جل محل ساون بھادوں
نقار خانہ، بنجاری کنواں۔ یہ کنواں اس وقت بنا تھا کہ جب دلی یہاں آباد نہ تھی بلکہ اُس زمانے

کی دلی کا دروازہ جو دہلی دروازہ کے سامنے دہلی جیل کے مشرقی سمت اور سڑک کے کنارے دلی کو آباد اور اپنے کو برباد لکھ کر شرم سے زمین میں دھنسا جاتا ہے یہاں دلی آباد تھی اُس زمانے میں بنجارے ناج وغیرہ لایا کرتے تھے اور جہاں لال قلعہ اس وقت ہے یہ بنجاروں کا پڑاؤ تھا یہاں کنواں نہ تھا ایک بنجارے نے کنواں کھدوادیا اس وجہ سے بنجاری کنواں کہتے ہیں۔اب کی دفعہ دلی نے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں کیونکہ ہر دفعہ کی بربادی سے دلی کا بھی دل اُکتا گیا ہے اور مدت کی پیشین گوئی کا خیال آگیا۔کسی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ۔نو دلی دس بادلی قلعہ وزیر آباد۔آٹھ دلیاں تو میں نے گنوائی ہیں اب نویں دلی کی بنیاد ہمارے شہنشاہ نے رکھی لیکن یہ بنیاد بدلی اور اب دسویں دلی رائے سینا میں آباد ہو رہی ہے بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو لیکن بادشاہ ہے، شاہی بنیاد یہاں سے بدلی اب کچھ اسباب اس پیشین گوئی کے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ قلعہ وزیر آباد آباد ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیر آباد نشیب میں واقع ہوا ہے اور نشیب کی آب و ہوا مرطوب اور دلی کی عادت شمال کی طرف کھسکنے کی ہے اور دلی ہی بیچاری پر کیا موقوف ہے فیصدی پچانوے شہر شمال کی طرف بڑھ رہے ہیں وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمال ٹھنڈا روح گرم اس وجہ سے طبیعت شمال کی طرف جاتی ہے۔ہونیوالی بات کو خدا ہی جانتا ہے لیکن پیشین گوئی یہ خبر دیتی ہے کہ وزیر آباد آباد ہوا اور اُس کی آبادی کو قیام ودوام ہو دلی کئی دفعہ بدلی اور آباد ہوئی جو آیا اس نے دلی کی اکھیڑ پچھاڑ کی اور اب کے تو چین سے بیٹھے بٹھائے دلی نے اپنا گھر چھوڑا اسکی وجہ میرے خیال میں تو یہ آتی ہے کہ مجھ جیسے دلی والوں نے غدر کے بعد دلی کو ایسا لتاڑا کہ دلی نے تنگ آکر یہاں کی بود و باش چھوڑ دی۔پہلے دلی کو دلی والوں پر ناز تھا اور اب تو دلی والوں نے جمنا کے کنارے وہ اُلٹی گنگا بہائی کہ دلی پانی پانی ہو کر شرم سے ڈوب گئی بسا بسایا گھر چھوڑا اور اپنوں سے منہ موڑ پردیسیوں سے دل لگا بیٹھی اب دلی والوں کو مناسب ہے کہ جیسے آبرو دار شہر میں اپنے آپ کو دلی کے رہنے کے قابل بنائیں ورنہ تعلق آباد کے گنوار بنکر

رہجائیں گے میں نے بچپن میں سنا ہے کہ تغلق آباد کے گنوار ساری دنیا میں اپنے سر پر رکھ کر بیچتے تھے لیکن یہ انکی آن تھی کہ دلی دروازے کے اندر سر پر بوجھ نہیں رکھتے تھے کسی نے پوچھا کہ یہ کیا تو تغلق آباد والے جواب دیتے ہیں کہ میاں دلی ہماری تھی اب اگر دلی ہم سے بدل گئی تو بدل گیا لیکن ہم اس کے آگے کیوں گردن جھکائیں ایسے موقعے کے واسطے کسی نے خوب کہا ہو کہ۔ رسی تو جل کے خاک ہوئی پر بل نہ گیا۔ اب دلی ایسے دلی والوں کی طرف منہ بھی نہیں کرتی۔ وہ پانی ملتان گئے۔ ورنہ دلی ایسی مسافر نواز تھی کہ جو دلی میں آیا دلی نے اُسے اپنے میں جذب کر لیا۔ دلی کی خاص بات مرکز ہونے کے لحاظ سے عجیب ہے آپ اجمیری دروازے سے ذرا باہر نکلیں تو آپ اجمیر کا رنگ دیکھیں گے اور لاہوری دروازے سے پنجاب اپنا پتہ دیتا ہے۔ کشمیری دروازہ کشمیر کی جھلک دکھاتا ہے ذرا جمنا پار ہوئے تو پورب نظر آتا ہے۔ غرض دلی اپنی وضع کی پابند ایسی ہے کہ اپنی چال سے باز نہیں آتی۔ انسان تو ذکی الحس ہی۔ آپ پودوں کو ملاحظہ فرمائیں ہم نے لکھنؤ کے خربزے کا دلی میں بیج بویا تو اُس سال دلی میں جو خربزہ پیدا ہوا ہر خربزے کا رنگ قد مزا قریب قریب ویسا ہوا اب دلی کے پیدا ہوئے خربزے کا بیج بویا تو رنگ قد مزا کچھ بدلا اور تیسرے سال کے خربزے کو دلی نے اپنے رنگ میں رنگ لیا وہی چال دار، قد بڑا دل موٹا اور پھیکا پیدا ہوا۔ لیکن دلی کے خربزے۔ بیچنے والوں نے آواز پکارا کہ شکر سے میٹھے یعنی شکر سے کھاؤ تو میٹھے۔ پہلے دلی ہی کے خربزے میں نے کھائے ہیں اچھے میٹھے خوشبودار ایک خربزہ گھر میں آیا بال بچے چھک گئے اور بیج رہا۔ دلی میں قدرت نے مسلمانوں کو بادشاہ اور ان داتا بنا کر بھیجا تھا۔ اس وقت دلی نے اپنے مہمانوں کی وہ آؤ بھگت کی طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا کیں اچھے اچھے باکمال پیدا کئے بڑے بڑے بہادر بنائے اور خلیق ایسے کہ چار دانگ عالم میں مشہور کہ دلی والوں کو ہندوستان نے سراہا کاریگر ایسے بنائے گو جاہل تھے مگر اُنکے دماغ کام کر رہے تھے۔ سنہ میں بے دھرمی بندوقیں چل رہی تھیں اور ان بندوقوں کا نام بے دھرمی میرٹھ کے کارتوس کی وجہ سے فوج نے رکھا تھا یہ بندوقیں تانبے کی

ٹوپیوں سے چلتی تھیں اب غدر ہوا تو ٹوپیاں نہ رہیں اب بندوقیں بیکار ہوگئیں تو بادشاہ سے عرض کی بادشاہ نے خانم کے بازار میں جو کاریگر تھے انکو بلایا اور فرمایا کہ بندوقیں بیکار رہیں اب کیا کریں کاریگروں نے دست بستہ عرض کی کہ حضور یہ کیا بات ہے حضور کے اقبال سے اب بندوبست ہوا یہ کہکر کاریگروں نے کاغذ کے پٹاخے بنائے جو بچے تپنچوں میں رکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس زمانے میں قدرت کی خاص نظر رحمت دلی پر تھی اب جب دلی والوں نے اپنے آپ کو بھولا اور یہ نہ سمجھا کہ قدرت نے ہم کو کیسا مالا مال پیدا کیا ہے لیکن ہم نے اُس کی کسی نعمت سے کام ہی نہیں لیا۔ تو قدرت کی رفتار سست ہے اس وجہ سے کہ کوئی کسر نہ رہجائے پھر جب قدرت ہاتھ ڈالتی ہے تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ یا تو یہ شہر ایسا تھا کہ جس کی تعریف نا ممکن تھی یا اب دلی کے پہاڑ بدلے زمین بدلی آخر بدلا کیا کچھ نہیں۔ مجھ جیسے دلی والوں نے تمام خوبیوں سے اپنے آپ کو بال بال بچا رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ آپ دلی میں ایک شے کھانے کی پینے کی برتنے کی چاندی سونے کی ڈھونڈیں تو ملنا مشکل۔ اب چاندی والوں کا کیا قصور ہے چاندی خود تو سفید ہے لیکن جو شے اسے مس کرتی ہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ کاریگر تو کاریگر ہیں انہوں نے بی چاندی سے کہا کہ تو ٹھہرا اگر تجھ کو کالا کرکے نہ چھوڑا تو نام نہ پایا۔ چاندی بیچاری ہٹی ہونے کی وجہ سے اتنی شریف ہے کہ تولہ بھر چاندی میں آپ ایک ماشہ تو چاندی لیں اور گیارہ ماشہ میل تو چاندی تیزاب کے اجال پر سفید نظر آئے گی۔ اب کاریگروں نے سونے کو دیکھا کہ یہ ظالم تو ہمارا کہنا مانتا ہی نہیں۔ تولہ بھر سونے میں ایک رتی میل ملاتے ہیں اور وہ میل رتی بھر اپنی جھلک دیتا ہے تو کاریگر بولے اچھا ہم بھی تیرا قائم مقام بناتے ہیں چنانچہ چاندی اور تانبا ملاکر سونے کا ہمشکل بنایا اور منحوس نام رکھا۔ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے اور نہ سمجھے تو ہماری صورتیں بھی بدل جائیں گی کہ شریف اور پاجیوں کے باوا آدم الگ الگ نہ تھے بداعمالیوں نے شکلیں بدل دیں اللہ رحم فرمائے۔

ہندوستان، فن طب کا اصل مولد

"ہندوستان کے فن طب و جراحت" پر ایک مضمون دو نمبروں میں اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی رسالہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ آج عنوان بالا سے کیپٹن پی جانسٹن سینٹ نامی ایک انگریز مصنف کے نہایت فاضلانہ اور پُراز معلومات خطبہ کا خلاصہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو انگلستان کی مشہور "رائل سوسائٹی آف آرٹس" کے ہندوستانی شعبہ کے زیر اہتمام ابھی حال میں پڑھا گیا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ قدیم تاریخ کے متعلق ابتک عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ ایک تاریکی ظلمت اور وحشت و جہالت کا دَور رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی علم کا کبھی کوئی چرچا تھا تو وہ فلسفہ والہیات کا تھا۔ مضمون بالا سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے اپنے قدیم زمانے میں سائنس میں بھی اُسی قدر ترقی کی تھی جس قدر فلسفہ میں فن طب اور اس کی مختلف شاخوں میں اس نے اس قدیم زمانے میں جو کمال پیدا کیا تھا، اس سے آج کی جدید سے جدید تحقیقات و معلومات بھی کچھ بہت آگے نہیں ہیں۔

سعید

ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہندوستان کی تہذیب کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ باوجود تمام تحقیق و تدقیق کے حقیقت پھر بھی اسی قدر مستور رہتی ہے۔ یہ کوئی تقریباً سوا سو سال کی بات ہے کہ بعض اہل مغرب نے سنسکرت زبان کے مطالعہ کی طرف توجہ کرنی شروع کی اور اگرچہ اس وقت سے دفتر کے دفتر آرین قوم کی اصل کے متعلق لکھے جا چکے ہیں، پھر بھی یہ اطمینان کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صحیح حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آرین قوم وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے سے پیدا ہوئی، بعضوں کا خیال ہے کہ انکا مولد جرمنی کا شمالی علاقہ یا ناروے اور سویڈن کا خطہ ہے۔

تاہم ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ویدوں کی تاریخ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ ہوٹنی (Whitney) گراس مان (Grassman) اور بنفے (Benfey) کا یہ خیال ہے، کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہندو لٹریچر کے آغاز کا زمانہ ہے۔ برون ہوفر (Brunnhofer) اسے ۲۸۰۰ ق۔م بتاتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اس مدت کو ۴۰۰۰ قبل مسیح قرار دیتا ہے اور ایک گروہ کے خیال کے مطابق یہ زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے جبکہ اس وقت کی دنیا یہ کرۂ زمین نہ تھی جس پر آج ہم لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اوستا میں ایک ایسی آریوں کی بہشت کا ذکر ہے جو صرف قطب شمالی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔

طب کے متعلق قدیم روایات | بہر حال اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ مسائل ایسے نہیں جن کا تصفیہ گھنٹے دو گھنٹے کی صحبت میں ہو سکے۔ ہم کو صرف ویدوں کے ان اشلوکوں سے غرض ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ رگ وید یا اس کے ساتھ کی دوسری کتابیں خواہ ۱۵۰۰ ق۔م، ۲۵۰۰ ق۔م، ۴۵۰۰ ق۔م یا اس سے بھی قدیم تر کسی ایسے زمانے سے شروع ہوتی ہوں جبکہ تاریخ کا کوئی پتہ نشان بھی نہ تھا موجودہ اغراض کے لئے اس سے بحث نہیں۔ ہم کو اس واقعہ کو اس طرح تسلیم کر لینا چاہئے، جس طرح ایک چھوٹا بچہ راجہ کے قصے کو صحیح سمجھتا ہے بلالحاظ اس کے کہ وہ راجہ کون تھا؟ اور کس زمانے میں وہ حکومت کرتا تھا؟ اس لئے کہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے قصوں اور افسانوں کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔

لسانیات کا ایک عالم ان قدیم قصوں اور افسانوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے تاکہ وہ تخیلات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑ دیں۔ مورخ ان افسانوں کو انکے اصل سرچشمے تک لیجاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جہاں سے کہ وہ اصل حقیقت کی تلاش شروع کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالق اول برہما نے یہ چاروں وید کائنات کی ہدایت کے لئے بنائے اور ان میں سے اتھروید کو دوسرے دیوتاؤں کے پاس بھیجا۔ اور دُواسونیوں' یا سورج کے دو بیٹوں کو اس کا حامل قرار دیا اور اس طرح یہ دونوں آسمانی دیوتاؤں کے

نگراں مقرر ہوئے

آیورویدکی ابتدا | اس کے بعد آیوید پیدا ہوا جو بنی نوع کی اور زیادہ تعلیم کے لئے مزید منتروں کا مجموعہ ہے۔ پھر ان منتروں سے برہمانے انسان کی خراب خستہ اور زوال پذیر حالت پر رحم کھاکر آیوروید پیداکیا جس میں زندگی کے علم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ منتر بذات خود نیست و نابود ہوگئے ہیں اور ان کا جو کچھ بھی علم ہکو ہوا ہے، وہ انکے بعض اجزا سے یا ان تبصروں سے جو بعد کے لٹریچر میں ہمیں ملتے ہیں لیکن ان بالواسطہ ماخذوں کی بنا پر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہی آیوروید مدتہائے دراز تک ہندو فن طب کا سنگ بنیاد رہا ہو۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ویدوں کا بھی پتہ نشان باقی نہ رہا اور تمام لوگ پھر ایک بار رنج و مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ بنی نوع کی یہ حالت دیکھکر دیوتاؤں اور راکششوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور انہیں سمندر میں ڈال دیا اس کے بعد اسے چلانے کے لئے مندرا پہاڑ لیا اور وشنو دیوتا کچھوے کی شکل میں دھرا بنے جس پر وہ لکڑی گھومتی تھی 'شیش' جو سانپ کی شکل کا ہے، ایک رسی بنا جسے ایک طرف سے تمام دیوتا اور دوسری جانب سے راکشش کھینچتے تھے۔ اس طریقہ سے گویا سمندر سے چودہ رتن پیدا ہوئے جن میں سے دھنونتری امرت یا آب حیات لیکر نکلا اور وہی ان دیوتاؤں کا طبیب اول اور فن طب کا سب سے پہلا موجد مانا جاتا ہے۔

دھنونتری، فن طب کا موجد | دھنونتری کا ظہور جو ہندوستان کا ایسکولیپیس مانا جاتا ہے' دنیا میں اس غرض سے ہوا کہ وہ لوگوں کے امراض و تکالیف کا ازالہ کرے اور انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ یونانی ایسکولیپیس کی طرح اس کے ساتھ کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے بلکہ وہ عام طور سے ایک نہایت ضعیف شخص کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب ہے۔ رشیوں نے دھنونتری کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ اس وفد میں، سوشرت بھی شریک تھا جو قدیم فن جراحت کا بانی ہے

اور جسے دھنونتری نے آیور وید سکھانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اسی سوشرت نے بعد میں "سوشرت سمہیتا" کے نام سے فن جراحت پر ایک کتاب لکھی ہے۔

جس طرح سوشرت فن جراحت کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح چرک علم طب کا بانی ہے اور اس نے بھی "چرک سمہیتا" کے نام سے علم طبعیات پر ایک کتاب لکھی۔ سوشرت فن جراحت کا عالم تھا اور چرک طب کا اور انہی دو ہستیوں سے ہندوستان میں فن جراحت و طب کا رواج ہوا۔

ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا چرک پہلے پیدا ہوا یا سوشرت۔ علمی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو چرک کی تصانیف زیادہ قدیم نظر آتی ہیں لیکن قدما میں یہ بات بطور ایک مسلمہ امر کے سمجھی جاتی ہے کہ فن جراحت طب سے پہلے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر وائز (صفحہ ۱۵۵) نے اپنی کتاب "ہندو طب" میں لکھا ہے کہ ایکبار دھنونتری نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا کہ "سب سے پہلے میں کس چیز پر لیکچر دوں؟" شاگردوں نے کہا "جراحت پر" اس لئے کہ پہلے دیوتاؤں میں امراض نہیں ہوتے تھے اور سب سے پہلے جس چیز کے لئے علاج کی ضرورت پیش آئی وہ زخم تھے۔ علاوہ اس کے فن جراحت اس حیثیت سے بھی زیادہ مقدم ہے کہ اس سے فوری آرام ملتا ہے اور اس کا تعلق طبابت سے بھی ہے گو موخر الذکر کو جراحی سے کوئی نسبت نہیں۔ سب سے پہلے انسان کو جراحی کی ضرورت ہوئی، امراض بعد میں پیدا ہوئے اور اس وقت جب انسانوں میں بہت ساری خرابیاں آچکی تھیں اور سچ پوچھئے تو یہ خرابیاں ایک طرح سے انکے حد سے زیادہ گناہوں ہی کا نتیجہ تھیں۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشرت، چرک سے پہلے پیدا ہوا لیکن انکا صحیح زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ انکا زمانہ اتنا قدیم ہے کہ دوسری قومیں اولاً تو ان سے واقف نہ ہو سکیں اور اگر واقف بھی ہوئیں تو ان کمالات کو پورے طور پر سمجھ نہ سکیں۔

مثال کے طور پر عربوں کو لیجئے انکے ہاں انکا ذکر آتا ہے جن سے کہ بعد میں رومیوں

نے لیا۔ کچھ عرصے کے بعد ہمیں اس چیز کا ذکر ملتا ہے جس کا تذکرہ پروفیسر ڈ تیز ([illegible]) نے اپنی کتاب " ہندو طب کی قدامت کے دلائل " میں کیا ہے۔ غرض ہمیں ایک غیر متعین لیکن بلاشبہ بہت ہی قدیم زمانے میں سوشرت کا ذکر فن جراحت کے بانی کی حیثیت سے اور چرک کا فن طب کے موجد کی حیثیت سے ملتا ہے۔

ان تذکروں میں ہمیں ہندو فن طب کی ان دو بڑی شاخوں کی بنیاد نظر آتی ہے، جس کے ساتھ ہی ساتھ تیسری شاخ 'ندان' یعنی تشخیص امراض کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد آیورو وید پر ہے، جس سے نہایت کثرت کے ساتھ اقتباسات لئے گئے ہیں اور پھر انہی کی تشریح برہمنہ، اور بعد کے قرون وسطےٰ کی شرحوں میں بھی کی گئی ہے۔

آیورویدکی تقسیم | خود آیور وید جیسا کہ اس کے مفسرین نے لکھا ہے، آٹھ حصوں میں منقسم ہے۔ دو حصے خاص فن جراحت کے متعلق ہیں، پانچ طب کی کسی نہ کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک حصہ فن جراحت کے پہلے باب میں اجسام غریبہ کے نکالنے، چھری وغیرہ کے زخموں کو کے بھرنے، پٹیاں باندھنے کے طریقے اور آبلے، آماس اور دبل وغیرہ کے علاج سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں آنکھ، کان، ناک اور منہ کے امراض سے بحث ہے تیسرے باب میں جو طب کے شعبہ کا پہلا حصہ ہے، ایسے امراض سے بحث ہے جن کا تمام جسم پر اثر ہوتا ہے مثلاً بخار وغیرہ۔ چوتھا باب دماغ کے علاج، پانچواں بچوں کی خبر گیری، چھٹا تریاق کے استعمال ساتواں جوانی دوبارہ عود کرانے اور آٹھواں نسل انسانی کے تحفظ و بقا پر مشتمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کیمیا کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے لیکن خود یہ علم عربوں سے بہت پہلے ہندوستان میں موجود تھا، اس لئے کہ آیوروید کے ساتویں باب میں اس علم سے بہت کچھ بحث کی گئی ہے۔

آیوروید کے یہی آٹھوں باب کم وبیش اسی ترتیب کے ساتھ سوشرت اور چرک نے اپنی تصانیف میں بیان کئے ہیں۔

سوشرت کون تھا؟ | ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سوشرت، وشوامتر کا لڑکا تھا جو رامچندر جی کا ہمعصر ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متعین طور پر کس زمانے میں تھا۔ سر ولیم جونس (بانی رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) نے رامچندر کے ہندوستان فتح کرنے کا زمانہ تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح متعین کیا ہے۔ برعکس اس کے بعض علمائے فلسفہ سوشرت کو گوتم بدھ کا ہمعصر قرار دیتے ہیں چونکہ وید کے بہت سے منتروں میں اس کا ذکر آتا ہے، اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ویدوں کے زمانے میں رہا ہوگا۔ علاوہ اس کے اتھروید کی آٹھویں کتاب کا ایک منتر انسان کی تخلیق کے متعلق ہے جس میں جسم کے ڈھانچہ کا اس طرح ذکر ہے جس طرح ایتریہ اور سوشرت کے ہاں ملتا ہے۔ اتھروید کا ایک بڑا حصہ مسلمہ طور پر ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب کا ہے اور منتر مذکورہ بالا اس سے بھی قدیم حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اتنی بات تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ سوشرت ۱۰۰۰ ق۔م سے بعد کا کس طرح نہیں ہو سکتا۔ اور علاوہ اس کے ہمیں اس کا اصل مسودہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ سنسکرت کی جس کتاب کو ہم "سوشرت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ نہ جانے کتنی تقریظوں کی تقریظ ہوگی جو اصل تصنیف کے زمانے سے بعد میں کی گئی ہے۔

اپنی اس کتاب میں اس نے آیور وید کے آٹھوں ابواب کا چھ بڑے بڑے عنوانات کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ وہ وید کے انہی دو ابواب سے جن میں فن جراحت کا ذکر کیا گیا ہے، خاص طور سے بحث کرتا ہے، اگرچہ کسی قدر طبابت سے بھی تعلق ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ آج کل بھی دستور ہے۔ ان چھوں ابواب میں سے پہلے باب میں خاص طور سے فن جراحت سے بحث کی گئی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر آب و ہوا اور غذا کا بھی ذکر ملتا ہے جس کا صحت پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ دوسرے باب میں ان امراض کا علاج ہے جو خراب طوبتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس کے تیسرے باب کو ہم تشریح الابدان سے تعبیر کر سکتے ہیں، چوتھے کو علم العلاج سے پانچویں کو علم السموم سے۔ چھٹا اور آخری باب بطور ضمیمہ کے ہے جس میں زیادہ تر اکثر مقامی بیماریوں

سے بحث کی گئی ہے۔

غرض سوشرت نے صرف فن جراحت پر اپنی توجہ رکھی ہے اور جسے وہ علوم طبی میں اولین اور بہترین علم قرار دیتا ہے، اور جس میں دوسرے علوم کی بہ نسبت قیاسی اور استنباطی طریقہ کی بنا پر بہت کم غلطیوں کا امکان ہے، جو خالص اور بے آمیز ہے، آسمان کا بہترین ثمر ہے اور شہرت کا یقینی ذریعہ۔ اس کے بعد ایک عام بے تعلق شخص بھی صحیح طور پر اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ مغربی نظریوں کی کس درجہ جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

چرک کون تھا؟ | چرک کے متعلق غور کرنے کے بعد بھی ہم کم و بیش اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ متعین طور پر یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا؟۔ اس کی تصنیف مکالمہ کی صورت میں ہے جو ایک استاد اور شاگرد کے درمیان ہے۔ مضامین سے جس انداز میں بحث کی گئی ہے اس میں کوئی خاص نظام نظر نہیں آتا بلکہ بلکہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے، نئے نئے مضامین کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مکالمہ کا ایک بڑا حصہ غیر دلچسپ ہے لیکن عموماً ایسے مضامین کا ذکر ہے جو انسان کے لئے بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلی کتاب میں جو تین عنوانات پر مشتمل ہے، فن طب کی اصل اور طبیب کے فرائض سے گفتگو کی گئی ہے۔ دواؤں کی ترتیب، انکے خواص اور استعمال، ان میں سے ہر ایک سے بہ تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح امراض کے اسباب، نوعیت اور انکے انسداد و علاج سے بھی بحث ہے۔ غذا، بخارات کے ذریعہ غسل، کھانوں کی بڑی تقسیمیں یہ اُن بے شمار مسائل میں سے صرف چند ہیں جن کا ذکر اس پہلی کتاب میں آتا ہے۔

امراض | دوسری کتاب میں امراض کا بیان ہے مثلاً بخار، جدرہ یا ورم جذام، جنون صرع یا مرگی۔ تیسری کتاب میں وبائی امراض کی نوعیت، جسم کے اندر رقیق مادوں کی خصوصیت اور دوسرے مسائل سے بحث ہے۔ چوتھی میں استقرار حمل مخلوق کی قسموں اور جسم و روح کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔

پانچویں کتاب میں اعضائے حسّی، ان کی خصوصیات اور امراض، گویائی اعضائے جسمی میں بیماریوں کے اسباب، قوت کا یکبارگی زائل ہوجانا اور موت کا بیان ہے، چھٹی کتاب میں زیادہ قوت اور طویل عمر حاصل کرنے نیز مختلف قسم کے امراض کی تکالیف سے بحث کی گئی ہے مثلاً استسقا یرقان، جلد کا صفراوی ورم، دمہ، تشنگی، زہر خوری۔ التہاب یا ورم، سکرات گٹھیا اور فالج وغیرہ اس قسم کے تمام امراض بھی ہیں۔ ساتویں کتاب میں مقئی و مسہل کا ذکر ہے اور اس کے بارہویں باب میں اس قسم کی بہت سی دواؤں کا ذکر ملتا ہے جو اس زمانے کے ہندوؤں کو معلوم تھیں۔ سب سے آخری اور آٹھویں کتاب میں جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے بخار کے علاج، مختلف اغراض کے لئے انجکشن اور پچکاریوں وغیرہ کے دینے کا ذکر ہے۔ اگرچہ اس زمانے کی طب کے ساتھ بہت کچھ قصہ کہانیوں کا رنگ بھی ملا ہوا ہے، اور یہ ترتیب و نظام آج کل عام طور پر لوگوں کو نظر نہیں آتا، پھر بھی اس زمانے کی غیر معمولی طبی معلومات سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بہت سی باتوں کو جنہیں دورِ جدید کی اکتشافات شمار کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں اس زمانے کے لوگوں کو عام طور پر معلوم تھیں۔

ان دو اشخاص یعنی سوشرت اور چرک سے مختلف گروہ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر وایز نے اپنی کسی تحریر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ دو مختلف طریقے فن جراحت کے ہیں، نو طب کے، تین علم الادویہ کے۔ ایک تشخیص امراض کا، ایک دواسازی کا اور تین معدنیات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چار کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن باقی طریقوں سے ہم ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جراحی سے متعلق جتنے آلات و اوزار تھے، ان کی بھی مختلف شاخیں اور قسمیں ہیں جن کی مجموعی تعداد کوئی سوا سو ہے۔ ان میں بڑی بڑی دو ہیں (۱) 'یانترا' یعنی بغیر دھار کے آلات' (۲) 'شاسترا' یعنی دھار والے آلات جن کا کسی قدر تفصیل سے ذکر آئندہ آئے گا۔

علم تشریح | مذکورہ بالا سطروں سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قدیم جراح علم تشریح سے بھی کچھ نہ کچھ واقف رہے ہوں گے لیکن آجکل کا یہ حال دیکھکر کہ ہندو طلبہ لاش کے قریب جانے سے کس قدر بھاگتے ہیں، شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ سچ بھی ہے۔ ۱۸۳۶ء میں جب انگریزی طریقہ چیر پھاڑ ہندوستان میں سب سے پہلی بار رائج ہوا، تو اس وقت بشکل دس طالب علم اس کے لئے دستیاب ہو سکے اور بہ دقت تمام اس کام کو شروع بھی کرنا چاہا تو بکری کے ڈھانچوں اور خشک ہڈیوں سے شروع کیا گیا۔ انسان کی لاش پر چیر پھاڑ کرنا تو قطعاً بعید از قیاس تھا۔ یہ صرف ایک بنگالی طالب علم تھا جس نے ہمت کر کے سب سے پہلے یہ راہ کھولی، پھر بھی اس کے لئے سب سے پہلا کمرہ جو تیار ہوا، اس کی دیواریں خاص طور سے بہت بلند رکھی گئی تھیں اور ہر وقت اس کے گرد پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا تاکہ کسی وقت عوام کے جذبات مشتعل نہ ہو جائیں اور لوگ حملہ کر بیٹھیں۔ اس کے متعلق عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا تھا کہ ادھر ادھر سے لڑکے پکڑ لائے جاتے ہیں اور مریضوں کو بعض اوقات قصداً مار ڈالا جاتا ہے تاکہ چیر پھاڑ کے لئے لاشیں مل سکیں، لیکن یہ کوئی خاص ہندوستان ہی کے لئے تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں بھی یہی حال تھا۔

بہرحال علم تشریح کے تین بڑے گروہ ہیں جن میں سے ایک اتیریہ (Atreya) کا ہے جس کا زمانہ ۱۲۰۰ قبل مسیح ہے، دوسرا سوشرت کا اور تیسرا واگ بٹ (Vagbata) کا جو دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اگرچہ ان گروہوں کی تشریح میں مستقل تصنیفات درکار ہیں لیکن مختصر طور پر انکے اصولوں کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چرک کو لیجئے وہ کہتا ہے کہ "جسم میں حسب ذیل حصے ہوتے ہیں: دو بازو، ۲ ٹانگیں، سر اور گردن، اور جسم کے بیچ کا حصہ۔ یہ کل جسد انسانی ہے جس میں دانت اور ناخن کو لیکر کل ۳۶۰ ہڈیاں ہوتی ہیں۔" اس کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سر اور گردن کو ملا کر ایک رکھا ہے برعکس اس کے سوشرت کی فہرست میں ہم کو صرف ۳۰۰ ہڈیوں کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ وہ خود

لکھتا ہے کہ " علم جراحت کے مطابق صرف ۳۰۰ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ۱۰۶ سر میں ہیں، ۱۲۴ شکم کے جھکاؤ، اس کے ہر دو پہلوؤں، پشت شانوں اور سینہ ہیں، اور ۶۶ گردن سے اوپر ہیں۔ اس طرح سے مجموعی تعداد ۳۰۰ کی ہوجاتی ہے" اور پھر اس کے علاوہ ہر ایک حصہ کی مزید تفصیل کرتا ہے۔

سوشرت اور چرک کے بیانات میں جو فرق ہے وہ غالبًا اس وجہ سے ہے کہ چرک نے ۳۲ دانتوں اور ۲۰ ناخنوں کو بھی علیحدہ ہڈیوں میں شمار کیا ہے۔ بہرحال انکے اعداد وشمار میں خواہ کچھ ہی فرق کیوں نہ ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے طریقوں سے فن تشریح کے نہایت وسیع اور جامع ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور بڑے سے بڑے اور نازک سے نازک اپریشنوں کے لئے جن کا کہ اس زمانے میں اکثر رواج تھا ایسے ہی جامع اور وسیع علم کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے کے اپریشن میں صرف جسم کے حصہ کا کاٹنا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ شکم کے اندرونی حصہ میں بھی اپریشن دئے جاتے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جاتی تھیں، جوڑ بٹھائے جاتے تھے اور فاسد مادہ نہایت خوبی سے نکال لیا جاتا تھا۔ موتیابند کے علاج کا سہرہ بھی سوشرت ہی کے سر ہے علاوہ اس کے چمڑے کا ٹکڑا اعضا کے جوڑنے اور علاج کا طریقہ بھی جو یورپ کو ابھی حال میں معلوم ہوا ہے، ان قدیم جراحوں کے ہاں برابر جاری تھا۔

چیر پھاڑ کے لئے جو کمرہ ہوتا تھا اس کے لئے بھی مختلف قواعد مقرر تھے۔ اس کو بعض دافع جراثیم بخارات سے صاف رکھا جاتا تھا۔ بعض اپریشنوں سے قبل مریض کو کوئی ہلکی غذا دیجاتی تھی، اور بعض حالتوں میں اسے بالکل فاقہ کرایا جاتا تھا، جراح کے لئے قاعدہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال چھوٹے رکھے اور اپنے ناخنوں کو بھی صاف اور ترشے ہوئے رکھے جن پر آج کل کے ماہرین علم جراثیم بہت زور دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ صاف ستھرے اور خوشبودار کپڑے پہنے۔ نشتر دینے سے پہلے بیہوش کرنے والی دواؤں کے استعمال کا

بھی کہیں کہیں پتہ چلتا ہے۔ آخر زمانے میں ۹۰۰ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب ملتی ہے جس میں نشتر دینے سے پیشتر ایک دوا سنگھانے کا ذکر ہے جسے "سموہنی" کہتے تھے اور جو گوتم بدھ کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھی۔

بعض قدیم تصانیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں نیوٹن کی پیدائش سے سیکڑوں برس پہلے لوگوں کو "کشش اجسام" کا مسئلہ بھی معلوم تھا۔ نیز ہاروے کا نام سننے سے بہت پیشتر وہ دوران خون کے علم سے بھی واقف تھے۔ ہریت نامی ایک ماہر فن اپنی کتاب میں اینمیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بیماری رگوں کے درمیان میں مٹی کے آجانے سے پیدا ہوتی ہے جس سے کہ خون کا دوران بند ہوجاتا ہے۔ جز لاینجزی کے نظریہ پر حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے صدیوں پہلے بحث و مباحثہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں انکے معلومات بہت وسیع تھے۔

جسم کے بعض حصوں کے کاٹنے کے ساتھ لوگوں کو بعض اعضا کے از سر نو لگانے کا طریقہ بھی معلوم تھا اور رگ وید میں اسکا بعض بعض جگہ ذکر ملتا ہے ایک موقع پر لوہے کے پاؤں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح مصنوعی آنکھوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چمڑے کے پیوند لگانے کا ذکر پہلے آچکا ہے جس کا اعتراف ایک جرمن مصنف ڈاکٹر ہرش برگ (Dr. Hirch Berg) اپنی کتاب میں کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "یورپ کے اس قدیم فن میں نئے سرے سے ایک جان پڑ گئی جبکہ ہندوستانی جراحوں کے ان کمالات کا ہمیں علم ہوا" ذی روح جسم سے چمڑا کاٹکر جوڑ لگانا بھی خالص ہندوستانی ہی طریقہ ہے۔

ان قدیم جراحوں کو چمڑے سے نئے کان اور نئی ناک بنانے میں بھی دسترس تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انکے ہاں مجرموں یا بیوفا بیویوں کو اکثر ناک اور کان کاٹنے کی سزائیں دیجاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے جوڑنے اور لگانے کا طریقہ بھی لوگوں نے حاصل کیا۔

موہ واگ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ کا طبیب جیوکا کھوپری کی ہڈیوں

کے جوڑ کا علاج بھی کس خوبی سے کرسکتا تھا، علاوہ اس کے جینر (Jenner) سے بہت پہلے یہاں کے گوالے چیچک کا ٹیکہ لگانا جانتے تھے۔ وہ آبلوں کے خشک کھرنجوں کو لیکر کسی قدر اپنے بازو پر رکھتے اور پھر اس کے بعد جسم میں سوئی چبھوتے اور اس طرح گویا وہ چیچک کے حملے سے محفوظ ہوجاتے۔ پانڈی چری کے ایک فاضل ڈاکٹر ہولیٹ (Dr. Hullet) کا خیال ہے کہ ہندو اطبا اس قسم کا بھی ٹیکہ لگانا جانتے تھے جسے آج کل ویکسی نیشن کہتے ہیں یہاں تک تو فن جراحت کا ذکر تھا۔ آئندہ سطروں میں فن طب کا تذکرہ کیا جائیگا۔

سلیم کی یادیں

۱۹۰۷ء کو یادش بخیر بائیس سال ہو گئے۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب میں کوہ نینی تال سے
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علیگڑھ میں داخل ہونے کے لئے چلا اور نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم
نے مجھ سے کہا کہ علیگڑھ پہنچکر مولوی سید وحید الدین سلیم اڈیٹر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے ضرور ملنا
چونکہ رسالہ معارف مرحوم جس کے وہ اور حاجی صاحب مرحوم جوائنٹ اڈیٹر تھے میری نظر سے
گزر چکا تھا اسلئے مجھے خود سلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا بہت شوق تھا مگر میں علیگڑھ
پہنچکر کالج کی ایف۔اے کلاس میں داخل ہوتے ہی بیمار پڑ گیا۔ ایک ماہ تک صاحب فراش رہا
جب کچھ افاقہ ہوا تو اس سال کثرتِ طلاب کی وجہ سے جو جگہ کچی بارک میں مجھے ملی تھی اس پر دوسروں
کا قبضہ ہو گیا تھا اور میں تندرست ہو جانے کے باوجود کرزن ہسپتال ہی میں رہنے کے لئے مجبور
کیا گیا۔ آخر کار کالج کے اربابِ حل وعقد نے جعفر منزل کرایہ پر لی اور مجھ جیسے اور ستم رسیدوں
کو بھی وہاں رہنے کا حکم ہوا۔ ازآنجملہ اقتدار عالم صاحب بھی تھے جو تھرڈ ایر کلاس میں تھے اور آج
کل غالباً بدایوں میں وکیل ہیں۔ ان حضرت سے صاحب سلامت ہو کر کافی شناسائی ہو گئی تھی۔
جعفر منزل اس وقت زیر تعمیر تھی اور اُسی کے جو کمرے تیار ہو گئے تھے وہ بھی آرام دہ نہ تھے۔
اقتدار صاحب کالج کے پرانے طالب علم تھے۔ جوڑ توڑ لگا کر سوسائٹی کو منتقل ہو گئے مگر میں اور
دیگر طلبہ کچھ عرصہ تک جعفر منزل ہی میں رہے۔ اب مجھے یہاں رہتے ہوئے دو تین ماہ گذر چکے
تھے۔ ایک روز خیال آیا کہ سلیم صاحب سے ملنا چاہئے۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ جعفر منزل سے
سوسائٹی کی طرف جہاں سلیم صاحب رہتے تھے پا پیادہ روانہ ہوا۔ ان دونوں میں کم از کم ایک
میل کا فاصلہ ہوگا۔ شام کے کوئی چار بجے ہونگے اور غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر کا زمانہ تھا۔
سوسائٹی پہنچکر سلیم صاحب کا کمرہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دکن کی جانب کے کمرے میں مقیم ہیں

اُس کمرے میں پہنچا تو وہاں دو تین اصحاب اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سلام کرکے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اور لوگ اُٹھ جائیں تو سلیم صاحب سے اظہار عقیدت کروں۔ خوش قسمتی سے دس پندرہ منٹ کے بعد جس موقع کا میں متلاشی تھا وہ مل گیا۔ میں اور سلیم صاحب رہ گئے باقی اصحاب اُٹھ کر چلے گئے۔ اب میں نے از اول تا آخر حاجی محمد اسمٰعیل خاں کا ارشاد اور بیماری کی وجہ سے جلد نیاز نہ حاصل کرنے کی مجبوری وغیرہ وغیرہ تمام قصہ کہا اور اُن کی ملاقات پر فخر کا اظہار کیا۔ اُس وقت تک میں نے دو چار نظمیں ضرور لکھی تھیں مگر وہ سلسلے سے یاد نہ تھیں اس لئے میں نے غزل کے کچھ اشعار سلیم صاحب کو اپنے ادبی مذاق کے ثبوت میں سنانے شروع کئے۔ عرصہ زیادہ ہوگیا ہے لیکن جہانتک خیال ہے میں نے اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا۔

ہمیشہ نامہ بر سے وہ یہی کہتا ہے "چل۔ آیا" کہانتک دل کو سمجھاؤں نہ آج آیا نہ کل آیا

سلیم صاحب ۔ لغو ۔

(مجھے تعجب تو ہوا لیکن میں سلیم صاحب کے "لغو" کہدینے سے ابھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا)

میں ۔ ارے نادان! تو فکر دنیا میں کیوں سر کھپاتا ہے دھرا رہجائیگا سب کچھ جو پیغام اجل آیا

سلیم صاحب ۔ واہیات ۔

اب میں ستی ہوگیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلیم صاحب کو اپنی خوش مذاقی کا کیسے یقین دلاؤں میں نے دل میں کہا کہ ۱۹۰۵ء ایک قطعہ مولانا حالی کو سنایا تھا جب وہ میرٹھ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے اُس کی زبان کی تعریف کی تھی۔ آؤ اُسے سنائیں چنانچہ اس تمہید سے کہ مولنا حالی سے میرٹھ میں مجھے نیاز حاصل ہوا تھا اور یہ قطعہ اُنہیں بھی سنایا تھا میں نے پڑھنا شروع کیا۔)

آئے ہو، بیٹھو، جائیو جلدی ہے ایسی کیا مدت میں آج ہوئی ہے زیارت حضور کی
تشریف لائے اور کیا مورد کرم تکلیف میرے واسطے اتنی ضرور کی

شب کو قیام کیجئے یہ ہے آپ ہی کا گھر میں آپ ایک ہیں نہیں نسبت ہے دور کی
یہ رات تو ہے خوب ولیکن سحر نہو جبتک کہ ہم سنے نہیں آواز صور کی

سلیم صاحب - خرافات -

اب مجھے کچھ اور کہنا باقی نہ تھا اور دل ہی دل میں پشیمان تھا کہ سلیم صاحب نے نصیحتاً کہا کہ "شاعری بیکار شے ہے اسے چھوڑنا چاہئے" اور مجھ سے دریافت کیا۔

سلیم صاحب - تم مولانا حالی سے کہاں ملے تھے ؟

میں - میرٹھ میں -

سلیم صاحب - کب ؟

میں - ۱۹۰۵ء میں -

سلیم صاحب - تم انہیں پہچان سکتے ہو ؟

میں - (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی ہاں !

(اُسی کمرے کے اندر لکڑی کے تختوں سے ایک حدِ فاصل بنا کر علٰحدہ چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا اور دروازہ بھی لگا تھا تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک صاحب باہر تشریف لائے - سلیم صاحب فوراً اُٹھے ، اُنکے اُٹھتے ہی میں بھی کھڑا ہوگیا - غالباً سلیم صاحب سے انہوں نے دیا سلائی طلب کی اپنا سگار روشن کیا اور کھڑے کھڑے دو تین کش لیکر جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے اور دروازہ بدستور بند ہوگیا - سلیم صاحب پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھے)

سلیم صاحب - (مجھ سے مخاطب ہوکر) تم جانتے ہو کہ یہ کون صاحب تھے ؟

میں - (بالکل بے پروائی سے) جی نہیں !

سلیم صاحب - یہ مولانا حالی تھے -

سلیم صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی اور وہاں سے اُٹھنے کے لئے بے قرار ہوگیا - میری بیقراری کو سلیم صاحب نے مولانا حالی سے ملنے کی خواہش پر محمول کیا اور

فرمانے لگے " یہ وقت اُن سے ملنے کا نہیں ہے۔ وہ کراچی ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے اپنا خطبہ تیار کر رہے ہیں۔ انکو ملنے ملانے کی فرصت نہیں ہے "

میں ۔ (کھڑا ہو کر) السلام علیکم

سلیم صاحب ۔ (بہت بے پروائی سے) وعلیکم السلام

اب دن چھپنے ہی کو تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر مجھے معلوم نہیں ہوا کہ میرا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے اور میں کدہر چلا جا رہا ہوں۔ اپنے اوپر لعن و نفریں اور افسوس کرتا ہوا کہ کیوں اس شخص سے ملنے آیا اور قریب قریب روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بار بار کہتا تھا " یہ عجیب آدمی ہے۔ میں نے مانا مجھے شعر کہنا نہیں آتا۔ میرے اشعار بھی لغو ہیں لیکن یہ کیا انسانیت ہے کہ اس طرح آدمی کو ذلیل کیا جائے۔ کیا اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے کوئی اور مستحسن طریقہ نہ تھا؟ اور لیجئے آپ پوچھتے ہیں تم مولنا حالی کو پہچان سکتے ہو۔ گویا میں جھوٹا ہوں، میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں کوئی پوچھے کہ ایک ہی بار تو میں نے مولنا حالی کو دیکھا تھا۔ پھر دو برس تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا (اور تصویر انکی کہیں شائع نہیں ہوئی تھی۔ کیا یاد رہ سکتا ہے اور ان کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔ مگر اس شخص کو ذلیل کرنا مقصود تھا۔ بھئی! ہم تو اب اس شخص کے یہاں کبھی نہ جائینگے خدا اس سے پناہ میں رکھے۔ توبہ! توبہ ایسے یہ شخص تو ملنے کے لائق ہی نہیں ہے " غرض جو میرے منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ اپنے آپ کو بھی برا کہا اور سلیم صاحب کو بھی۔ جب جعفر منزل پہنچا تو میں اس قدر رنجیدہ اور ملول تھا کہ اُس روز میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ رات کو کچھ لکھا پڑھا دو تین روز تک میں چپ چپ اور خاموش رہا۔ اس کے بعد یہ جانگزا سانحہ دل سے محو ہو گیا۔

ایک روز اقتدار صاحب ملے، اس واقعہ کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد اور میری نظم موسوم بہ "ایک طائر وحشی کی فریاد" علیگڑھ منتھلی دسمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہو چکی تھی ۔ کہنے لگے " سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ "

میں ۔ (دل میں) شاید ان کو میری اور سلیم صاحب کی اس ملاقات کا حال معلوم ہو گیا ہے اور

یہ تمسخراً کہہ رہے ہیں۔ (اقتدار صاحب سے) میری اور سلیم صاحب کی کوئی واقفیت نہیں وہ مجھ کیوں یاد کرتے؟

اقتدار صاحب۔ (کسی قدر مسکرا کر جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ضرور میری ہنسی اڑا رہے ہیں) بھئی! میں قسمیہ کہتا ہوں وہ آپ کو پوچھ رہے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میری اور آپ کی ملاقات ہے تو مجھ سے باصرار کہا کہ تنہا صاحب سے ضرور ملانا۔ مجھے تو آپ سے کہنا بھی یاد نہ رہا اور وہ کئی بار تقاضا کر چکے ہیں۔ (اپنے ساتھی کی طرف دیکھکر) اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔

اقتدار صاحب کے ساتھی۔ واقعی سلیم صاحب نے مجھ سے اور ان سے کئی بار کہا ہے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ۔ اور ہم نے اُن سے کہدیا ہے کہ وہ اکثر یہاں تاش کھیلنے آیا کرتے ہیں آپ سے ملا دیں گے۔ آپ سوسائٹی ہم سے ملنے اور تاش کھیلنے اکثر جاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں یاد نہیں رہتا۔

میں۔ (دل میں) آپ کے ساتھی ہی کیا قابل اعتبار ہیں۔ اس کالج میں تو ایک سے ایک چھٹا ہوا لڑکا بھرا ہوا ہے۔ بیوقوف بنانا اور ہنسی اڑانا معمولی بات ہے۔ (اقتدار صاحب سے) اچھی بات ہے۔ جب آپ سے ملنے آؤں گا تو سلیم صاحب سے بھی مل لوں گا۔

درحقیقت اقتدار صاحب سے میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی مگر دل میں یہی ارادہ تھا کہ سلیم صاحب سے ہرگز نہ ملوں گا اگر اقتدار صاحب فی الواقع سچ بھی بول رہے ہوں۔ علیگڑھ منتھلی جنوری ۱۹۰۸ء میں اب میری ایک اور نظم دربلبل سے دو دو باتیں" چھپی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ دونوں نظمیں دیکھکر سلیم صاحب کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اپنی اور میری اُس ناگفتہ بہ ملاقات کو بھول گئے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اقتدار صاحب جب کبھی ملتے، مجھ سے ضرور تقاضا کرتے کہ سلیم صاحب سے ملنے چلو اور میں ٹالدیتا۔

ایک روز تعطیل تھی اور میں کھانا کھا کر سیدھا سوسائٹی پہنچا۔ شاید بارہ بجے ہوں گے آخر جنوری یا شروع فروری کا زمانہ تھا۔ اقتدار صاحب کے کمرے میں تاش کھیلا جا رہا تھا۔ میں بھی

شریک ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اقتدار صاحب کے ساتھی کو سلیم صاحب نے آدمی بھیجکر کسی ضرورت سے بلایا۔ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ "تنہا صاحب! چلئے۔ آج تو پکڑے گئے۔ سلیم صاحب آپ کو یاد کررہے ہیں" میں بہت جزبز ہوا مگر چارہ کار کچھ نہ تھا۔ میں نے کالج واپس آنے کا بھی ارادہ کیا لیکن اقتدار عالم صاحب نے مجھے پکڑ لیا اور کشاں کشاں سلیم صاحب کے کمرہ تک لے گئے۔ وہاں پہنچکر مجبوراً میں نے بھی متانت اختیار کی اور کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں چلتا ہوں۔ چنانچہ اسی حد فاصل والے چھوٹے کمرہ میں ہم سب لوگ جو چار یا پانچ تھے داخل ہوئے۔ سلیم صاحب باریش مبارک ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو تکئے جن کے غلاف میلے تھے ایک سرہانے اور ایک اُن کے زانو کے نیچے تھا۔ پان چبارہے تھے۔ پاندان چھوٹا سا ایک اسٹول پر تھا اور ایک بوسیدہ ڈبیہ بھی تھی جس میں بہت سے پان بنے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی تھیں، ایک آدہ کی جو کمی تھی وہ نوکر نے باہر سے لاکر پوری کردی اور ہم میں سے ایک صاحب سلیم صاحب کی پائینتی بیٹھ گئے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اقتدار صاحب نے سلیم صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

سلیم صاحب۔ (مجھ سے مخاطب ہوکر) آپ کی نظمیں علیگڑھ منتھلی میں دیکھ کر بیحد طبیعت خوش ہوئی آپ بہت اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ افسوس ہے آپ سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں۔ (دل میں، ارے ظالم! میں ہی جانتا ہوں، میں جیسی اچھی نظمیں لکھتا ہوں (سلیم صاحب سے) کچھ عرصہ ہوا میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوا تھا۔

سلیم صاحب۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ آپ ایک مرتبہ کے بعد پھر شاید نہیں آئے

میں۔ (دل میں) کون ایسا کمبخت بے غیرت ہوگا جو ایسی ملاقات کے بعد دوبارہ آئے (سلیم صاحب سے) جی ہاں! پھر میں نہیں آیا۔

سلیم صاحب۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔ آپ کے کالج کے اکثر طلبہ جن کو ادبی مذاق ہے تقریباً روزانہ آتے رہتے ہیں۔ مجھے بلکہ تعجب ہے کہ آپ ادہر کا رُخ نہ کریں

میں۔ (دل میں) میں تو بڑے اشتیاق سے آیا تھا لیکن نتیجہ نفرت انگیز نکلا (سلیم صاحب سے) کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا، انشاء اللہ اب حاضر ہوا کروں گا۔

ہم سب لوگ دس پندرہ منٹ اور بیٹھے اور سلیم صاحب نے سب کو اپنی ڈبیہ میں سے پان عنایت فرمائے۔ اس کے بعد ہم سب رخصت ہو کر چلے آئے۔ میں جعفر منزل یا غالباً کچی بارک کمرہ نمبر ۱ کو چلا آیا کیونکہ میں ۱۹۰۸ء تک جب کہ میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اسی کمرہ میں رہا۔ اب میں کبھی کبھی سلیم صاحب کے یہاں جانے لگا اور اُن سے ایک قسم کی بے تکلفی ہو گئی ایک روز سلیم صاحب نے فرمایا" بھئی تم نثر نہیں لکھتے نظمیں ہی لکھا کرتے ہو اب زمانہ نثر کا ہے کوئی مضمون ہمارے اخبار کے لئے لکھو،، میں اُن سے مضمون لکھنے کا وعدہ کرکے چلا آیا چار پانچ روز بعد میں ایک مضمون لکھکر لے گیا۔ اُس کا عنوان "شہرت سے خطاب،، تھا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اور اُسے تمام و کمال پڑھکر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگے "یہ مضمون تم نے لکھا ہے،، میرا اب وہ زمانہ تو رہا نہیں تھا کہ جب انکے الفاظ" لغو، واہیات، خرافات" سنکر لہو کے سے گھونٹ پی کر چلا گیا تھا اب میں ان سے مقابلے کے لئے بھی تیار تھا۔

میں۔ جی نہیں کسی اور سے لکھوا کر لایا ہوں۔

سلیم صاحب۔ واقعی خوب مضمون لکھا ہے۔ تم نظم لکھنا چھوڑ دو۔ نثر لکھا کرو۔ نثر تم بہت اچھی لکھتے ہو۔ (میرے چہرے کی طرف دیکھکر) تمہاری صورت پر علمیت نہیں برستی۔ لیکن آگے چل کر عالمانہ شان بھی پیدا ہو جائے گی۔

سلیم صاحب نے وہ مضمون علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور ایک ہفتہ تک جو کوئی آتا اُس سے میرا تعارف کراتے اور کہتے کہ آپ نے "شہرت سے خطاب،، والا مضمون پڑھا ہے۔ وہ تنہا صاحب یہی ہیں جنہوں نے وہ مضمون لکھا ہے۔ دو تین ہفتہ کے بعد سلیم صاحب نے اور مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ اور میں نے ایک ہفتہ کے بعد" اعتماد،، پر مضمون لکھا۔ اُسے لیکر سلیم صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ پہلے دو پیراگراف دیکھکر کہا کہ یہ اچھے ہیں لیکن آخر کے حصہ مضمون کو پڑھکر کہا کہ یہ کچھ

نہیں اس کو بدلو۔ میں اگلے روز اُسے بدل کرلے گیا۔ پڑھکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بغلگیر ہوتے بیحد تعریف کی اور کہا کہ تم نے آخر کے حصہ کو خوب ہی بدلا ہے تعریف نہیں ہوسکتی۔ اُس مضمون کو بھی علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور لوگوں سے اُس کی تعریف کرتے رہے۔

ایک روز میں ایک انگریزی نظم کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے لے گیا۔ بہت داد دی اور کہا کہ بہت سی انگریزی نظموں کا ترجمہ کرکے ایک کتابی شکل میں چھپواؤ چنانچہ انکے ارشاد کے مطابق شاعرانہ خیالات کے نام سے میں نے اس قسم کی کتاب ۱۹۱۲ء میں چھپوائی تھی۔ سلیم صاحب اس وقت لکھنؤ کے مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے۔ اُس اخبار میں آپ نے اس کتاب پر ریویو کیا اور لکھا کہ ایک شخص نے فرانسیسی نظموں کا ترجمہ عربی میں چھاپا ہے۔ وہ ترجمہ میں ایسا کامیاب نہیں ہوا جیسے کہ تنہا صاحب اس کے علاوہ اور بہت کچھ تعریف لکھی۔

ایک روز چند طلبہ انکے پاس بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم۔ مجھے سوسائٹی کے دروازے سے آتا دیکھکر بڑے زور کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرنے لگے کہ فوراً آؤ۔ انیس احمد صاحب بھی تھے جو شیخ الہند مولوی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولوی انیس احمد صاحب مشہور ہیں اور ہندوستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ فوراً آؤ۔ میں تیز قدمی کے ساتھ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور حیران تھا کہ کیا ایسا ضروری کام ہے جو اس قدر جلد بلاتے ہیں۔ فوراً مجھے بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب سلیم صاحب نے کہا۔
سلیم صاحب۔ اس وقت ہم سب آدمی مشددآباد کے رہنے والے موجود ہیں۔ ہم میں کوئی غیر شخص نہیں۔ مشددآباد سے اضلاع سہارنپور، کرنال، مظفرنگر اور میرٹھ کا کچھ حصہ مراد ہے۔ اس حلقہ کو مشددآباد کیوں کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ ہر لفظ تشدید کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً روٹی کہنا ہو تو کہیں گے روٹّی۔ لوٹا کہنا ہے تو کہیں گے لوٹّا۔ ایک لطف اور ہے جن الفاظ پر تشدید ہو، اُس تشدید کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً کتّا کہنا ہے تو کہیں گے کتا! بلّی کہنا ہو تو کہینگے بلی۔ بعض اوقات اکثر الفاظ میں سے الف حذف کر دیتے ہیں مثلاً کہنا ہو ابے! اُٹھا تو کہیں گے کہ بے! اُٹھا

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے اور مزاح موقوف ہو گیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے براہ راست ہیوٹ صاحب لفٹنٹ گورنر کو استعفا بھیجا اور انگریزی اسٹاف نے بھی ایسا ہی کیا۔ نواب وقارالملک کا زمانہ تھا لیکن ٹرسٹیوں کی جیسی کچھ اُس وقت جماعت تھی خوف تھا کہ شاید نواب صاحب کا ساتھ دیں اور لفٹنٹ گورنر کے منشا کی مطابق کام کریں۔ میں نے ایک نظم اس اندیشہ کی بنا پر "ایک گمنام سولن کی صدا" کے عنوان سے لکھی۔ سلیم صاحب کو دکھلائی۔ بعض اشعار سلیم صاحب نے پسند کئے اور بعض کی نسبت کہا کہ انہیں بدلو۔ میں روزانہ دو چار شعر بدلکر لیجاتا تھا اور وہ پسند کر لیتے تھے۔ نظم بڑی تھی اس لئے ایک ہفتہ تک تو یہی سلسلہ رہا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا جب میں سلیم صاحب کے پہنچا۔ کہنے لگے کہ اب اشعار تھوڑے رہ گئے ہیں جن کو بدلنا مقصود ہے، اس لئے تم ان کو میرے سامنے یہیں بدلو چنانچہ میں نے ترمیم و تنسیخ شروع کر دی۔ ایک مصرع جو بدلکر سنایا تو ہاتھ کے اشارے، جیسے کوئی کسی کو بلاتا ہو، جلد جلد کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا مطلب ہے فرمایا کہ اس مصرع پر "تلو جوتے" اور یہ کہکر خوب ہنسے۔ اس وقت تو میں چپ ہو رہا۔ حضرت بھی میرے مصرعوں کی بجائے دوسرے مصرعے رکھتے جاتے تھے اور جب ہم دونوں پسند کر لیتے تھے اُس مصرع کو لکھ لیتے تھے۔ سلیم صاحب نے ایک مصرع میرے مصرع کی بجائے کہا وہ اچھا نہ تھا میں نے بھی ہاتھ کا وہی مخصوص اشارہ کیا جو ان سے سیکھا تھا اس وقت سلیم صاحب کی ہنسی کا کہیں تپہ نہ تھا بالکل متین بن گئے تھے اور میں ہنس رہا تھا فوراً کہا کہ اچھا یہ مصرع پسند نہیں اور لو۔ غرض اسی ہنسی دل لگی میں وہ نظم اُسی وقت پوری کر دی گئی۔

ایک روز جو میں حسب عادت سلیم صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو کہنے لگے "میری دعا ہے کہ تم کبھی بی۔ اے پاس نہ ہو" میں اس بد دعا کو سنکر سہم گیا اور میں نے سلیم صاحب سے کہا کہ مجھ سے ایسا کیا قصور ہوا ہے جو آپ یہ بد دعا دیتے ہیں۔ فرمایا "بھئی! تم سے پہلے بھی اور لوگ ادبی مذاق رکھتے تھے لیکن جب کمبخت بی۔ اے پاس ہوئے اور اُن کو ڈپٹی کلکٹری ملی پھر لکھنا پڑھنا کیسا س

کو چہ کیطرف بھول کر نہیں آئے۔ تم بی اے پاس ہو جاؤ گے تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔ اس لئے میں کہتا ہوں خدا تمہیں بی اے پاس نہ کرے تاکہ یہ ادبی شوق تو برقرار رہے" میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ مطمئن رہئے میں ہرگز یہ ادبی شوق نہ چھوڑوں گا لیکن آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں بی اے پاس ہو جاؤں تاکہ یہ شوق اچھی طرح پورا کر سکوں۔ سلیم صاحب نے کہا کہ میں تو اسی خیال سے کہتا تھا ورنہ کوئی مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے۔ خدا تمہیں بی اے کرے لیکن تم کو ادبی شوق بھی برابر رہے۔

میں ایف اے پاس کر کے میرٹھ کالج کی تھرڈ ایر کلاس میں داخل ہو گیا اور اُس کے بعد سلیم صاحب سے جو روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں اُنکا لطف جاتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں پانی پت گیا تو سلیم صاحب سے وہاں نیاز حاصل ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں بھی پانی پت اُن سے ملنے کے ارادہ سے گیا اور ملاقات کی۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۲۵ء میں بہت فرق پایا۔ ۱۹۱۱ء میں تو حالت بدستور تھی۔ سلیم صاحب مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ۱۹۰۹ء بلکہ ۱۹۱۱ء تک دہریت کیطرف راغب تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنکا یہ رجحان کیوں اور کیسے جاتا رہا لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے اور اُنکے عقائد بہت درست اور صحیح ہو گئے تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے ہمیشہ سچے بہی خواہ رہے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ اُردو کے فاضل ادیب تھے۔ جدّت پسند تھے۔ آزاد طبع تھے۔ مولانا حالی کا بہت ادب کرتے تھے اور اُنکو بیحد مانتے تھے۔ افسوس ۱۹۲۸ء میں انتقال فرما گئے۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

گرفتاری

حلقہ گردِ من زنید اے پیکران آب گل　　آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

مجھے یاد ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مرجھایا ہوا سا پودا دیکھا تھا، اور اُسے بالکل سوکھا سمجھ کر میں اس کی ننھی ننھی شاخیں توڑنے لگی، شاخیں واقعی سوکھی تھیں، اور ایسی طرح چٹ چٹ ٹوٹ گئیں گویا انہیں میرے توڑنے کا انتظار تھا میں نے ایک ایک کر کے سب شاخیں زمین پر بکھیر دیں اور پودے کا نازک تنا بالکل ٹنڈ منڈ ہو کر رہ گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا اور شرارت نے یہ مشورہ دیا کہ اگر شاخیں توڑ دالیں تو تنے کو کھڑا چھوڑ دینا اور زیادہ ظلم ہے۔ میں نے اس کا پتلا سرا اپنے ہاتھ میں لپیٹا اور ذرا سا جھٹکا دیا۔ تنا نہیں ٹوٹا، اس کے تیور دیکھ کر میں نے بھی پوری طاقت آزمائی کی اور پورا جڑ سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جڑ جہاں سے ٹوٹی وہاں تری تھی اور ہلکی سی سبزی، وہاں زندگی کا رشتہ ابھی قائم تھا۔ اس رشتے نے اپنے ٹوٹنے پر فریاد کی اور آنسو بہائے۔ یوں ہی میں بھی، جب عمر کے بیس بائیس سال گذر گئے ہیں، اپنی ہستی کو تصور کرتی ہوں۔ میں ایک قصبہ میں رہتی ہوں۔ جہاں کے وہ بسنے والے جنہوں نے اُسے اپنا آشیانہ بنایا تھا اور اپنے فلک پیما حوصلوں کی بنیاد پر وہاں ایک زندگی تعمیر کی تھی اب بے نشان قبروں میں آرام کر رہے ہیں اور انکے بعد سے سارے قصبہ پر موت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ میں ایک مکان میں رہتی ہوں جس کے در و دیوار زمین کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اور اس زندگی سے شرمندہ ہیں جس میں اُن کی رسوائی ہی رسوائی ہے۔ اس مردہ بستی اور اجڑے مکان میں صرف میں زندہ ہوں، میرا جسم میری روح، میری امیدیں۔ اُس سوکھے پودے کی شاخوں کی طرح یہ سونی بستی اور یہ ویران گھر اس کے منتظر ہیں کہ کوئی شوخ شریر ہاتھ انہیں گرا دے اور وہ مٹی میں مل جائیں۔ میں اس کھنڈر میں گرفتار ہوں اور میری گرفتاری وہ سلسلہ قائم کئے ہے جسے زندگی کہتے ہیں، مگر اُس پودے کی تری

اور ہلکی سی سبزی اور آنسوؤں کی طرح میں بھی نظر سے چھپی ہوں، مجھے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے شوخ شریر ہاتھ اس کھنڈر کی آرزو پوری کریں، اسے رسوائی سے بچائیں، اور موت کے دامن میں پناہ لینے دیں۔ اس کھنڈر کے ساتھ ممکن ہے میں بھی دفن ہو جاؤں، لیکن میں فریاد کروں گی، اور ممکن ہے یہ پھٹے کپڑوں کی مانند زمین پر گر جائے۔ میری ہستی اور دنیا کی نظروں کے درمیان کوئی پردہ باقی نہ رہے تب بھی مجھے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میں ایک بجھی ہوئی آگ کی آخری چنگاری ہوں، یا ایک آتش جہاں سوز کا پہلا شعلہ، اور مجھے حوصلہ فنا کا کرنا چاہئے یا بقا کا، موت کی تاریکی سے بغل گیر ہونا چاہئے یا روشنی میں جلوہ افروز۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں زندہ ہوں، مجھ میں زندگی کا سامان ہے اور زندہ رہنے کی آرزو۔ مگر میں گرفتار ہوں اور میری گرفتاری عشق کی نہیں اور ہوس کی نہیں۔ اس گرفتاری میں میری ہستی مرجھاتی ہے، سرسبز نہیں ہوتی۔ میں ہر حالت میں راضی برضا ہوں، مگر میرا دل یہ کہتا ہے، ممکن ہے اُسے محض مغالطہ ہو۔ کہ یہ آگ بجھنے کے لئے نہیں جلائی گئی تھی۔

میں جس مکان میں رہتی ہوں اُس کی بنیاد علاؤالدین خلجی کے ایک سردار نے ڈالی تھی، اس نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا۔ اُس کے زمانے سے اس وقت تک اس خاندان نے عجیب عجیب جوہر دکھائے ہیں۔ اس نے کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا کی جو تمام ہندوستان میں مشہور رہی ہو لیکن قوم اور ملت کو صرف بڑی شخصیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آئین پر استقلال سے قائم رہنے پرانے اصولوں میں جوش عقیدت سے ہر دم نئی جان پھونکنے والی ہستیاں درکار ہیں جن کو عوام بہت بلند پایہ نہ سمجھیں، اور خدا کے خاص بندے انہیں محض مٹی کے پتلے دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زنجیریں جو سکون کی حالت میں جہاز کو لنگر سے علیحدہ نہیں ہونے دیتیں وہ بادبان جو جہاز کو چلانے کے لئے اپنا سینہ پھیلا دیتے ہیں۔ اس خاندان میں ایک نصرت خاں تھے جنہوں نے شاہان دہلی کے لئے ہزاروں لڑائیاں لڑی تھیں، اور بعد کو جب انہیں احساس ہوا کہ شاہان دہلی خود کو آئین اسلام کے پابند نہیں

سمجھتے تو انہوں نے بغاوت کی اور اسی میں شہید ہوئے۔ اسی خاندان میں شجاعت خاں تھے جن
کی تمام عمر ایک غریب کسان کو ایک کھیت واپس ولانے میں گذری جو کسی مقدم نے اُس سے جبرًا
چھین لیا تھا۔ غریب کسان کے کھیت کے لئے وہ اپنے باپ سے خفا ہو گئے، گھر بار چھوڑ کر
انصاف کی تلاش میں دہلی پہنچے، وہاں کوئی پرسان حال نہ ہوا تو فوج میں نوکری کی، رفتہ رفتہ
رتبہ حاصل کیا، بادشاہ کے مشیر بنے، اور خدمت کا حق ادا کرکے شاہی فرمان کے ذریعہ سے
کھیت واپس لیا۔ انہیں درباری زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، علمی ذوق کے آدمی تھے لیکن
جو بات جی میں ٹھان لی تھی اُس پر قائم رہے، اُس کے لئے تمام عمر صرف کرنا گوارا کیا جب وہ واپس
آئے تو کسان اور مقدم دونوں مر چکے تھے، انہوں نے فرمان کی بنا پر کسان کے وارثوں کو وہ
کھیت واپس دلوایا، جب وہ کسان کے وارثوں کو فرمان سنا رہے تھے، تو انہیں اپنی عمر
کی بربادی کا خیال آیا اور فرمان پر دو آنسو ٹپک پڑے۔ کھیت اور فرمان دونوں انکے بیٹے
نے اُنکے مرنے کے چند مہینے بعد کسان سے خرید لئے۔ یہ فرمان ابتک موجود ہے، اور اُس
پر آنسوؤں کے دھبے بھی اب تک نظر آتے ہیں۔ ہمارے خاندان ہی میں ایک رنگیلے میاں تھے
جو بعد کو رنگیلے شاہ کے نام سے کافی مشہور ہوئے۔ انہوں نے ساری جوانی عیاشی اور ہوس
پرستی میں گذاری تھی، ایک روز جب وہ شراب پئے بیٹھے تھے تو لوگوں نے خبر دی کہ بیوی
کا دم نکل رہا ہے، اور وہ اُسی طرح سے بدمست اُن سے آخری بار رخصت ہونیکے لئے پہنچے
بیوی کا دم آخری وقت تھا، لیکن وہ محبت کیش عورت شوہر کو پاس کھڑا دیکھ کر اپنی تمام
مصیبتیں بھول گئی، جو کچھ جسم میں طاقت باقی تھی اُسے جمع کرکے شوہر پر ایک لمبی پراسرار نظر ڈالی
مسکرائی، اور آنکھیں بند کرلیں، رنگیلے میاں محبت کا یہ جلوہ دیکھکر سودائی ہو گئے کئی روز تک
بیوی کی قبر کے پائینتی کھڑے رہے، جب کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو گر پڑے، لیکن اُس
جگہ سے نہ ہٹے۔ دنیا کی نعمتیں رنگیلے میاں کے جی سے اتر گئیں، انہوں نے وہیں اپنی بیوی
کی قبر کے پائینتی ایک جھونپڑی بنائی، رات بھر عبادت کرتے اور دن کو غریب عورتوں کی خدمت

کے لئے نکلتے۔ سال دو سال میں انہیں عوام نے رنگیلے شاہ کا خطاب دیا اور انکے مرید ہونے لگے۔ رنگیلے شاہ اگر سودائی نہ سمجھے جاتے تو اُن پر کفر کا فتوی دیا جاتا، کیونکہ وہ لوگوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ خدا کی خدائی بغیر عورت کی محبت کے قائم نہیں رہ سکتی۔

لیکن یہ صورتیں مدت ہوئی خاک میں مل گئیں۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف صورتیں ہی اور نہیں بلکہ خود صورتگر بدل گیا ہے۔ میرے والد مقدمہ بازی کی فضا میں پیدا ہوئے بچپن سے انکا حوصلہ مقدمہ طیار کرنا، لڑنا اور جیتنا رہا ہے۔ روزہ نماز کے نہایت پابند ہیں، قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی آبا و اجداد کا ذکر چھیڑتا ہے تو اعتقاد سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اپنی حالت پر انہیں رونا آتا ہے، لیکن وہ ہمت جو زندگی تعمیر کرتی ہے، جس سے ویرانے آباد ہوتے ہیں اُن میں نہیں ہے، اور کوئی اثر اُسے پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا کوئی مانے نہ مانے مجھے اس کا پورا یقین ہے، کیونکہ اگر اُن میں ہمت ہوتی تو وہ میری آرزوئیں محسوس کرتے، میری نظر سے نظر لڑتی تو میرے دل کی کیفیت سمجھ لیتے، میری خاموشی اُنکے لئے ایک معمہ ہوتی، میرے معمے ایک پر کیف کہانی۔

میرے بھائی کی چودہ برس کی عمر میں شادی کر دی گئی، ورنہ اچھی خاصی جائداد ہاتھ سے جاتی رہتی، میری چوبیس سال تک شادی نہیں ہوئی، لڑکیوں کے بیاہنے میں خرچ ہی خرچ ہے، اور سمجھدار والدین، آمدنی کا خانہ خالی نہیں رکھنا چاہتے۔ میرے لئے ایک شوہر چاہئے تھا جو خود امیر ہو اور بیوی کی غریبی کا مطلق خیال نہ کرے، جس کی اطمینان بخش آمدنی ہو اور سسرال کی جائداد حاصل کرنے کی ہوس سے اُسکا نفس بالکل پاک ہو، اس سے برتر حوصلہ جب دنیا میں کسی کو نہ تھا تو میری گرفتاری میں تڑپنے کا کسے قلق ہوتا، اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جس مرغ کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو وہ زیادہ عرصہ تک تڑپ بھی نہیں سکتا۔ میں تڑپتی رہی، زمانہ گذرتا گیا۔

میرے بھائی کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ اسکول کیسے جاتے؟ واپس جاتے وہ ہم نہیں جاتے، وہاں ہمارا سب مذاق اڑائیں گے،" یوں تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے والد

نے تعلیم کے فوائد پر اکثر تقـــریریں کیں، ایک بار اس شرط پر کہ داخلہ کسی دوسرے اسکول میں ہو انہوں نے میرے بھائی کو راضی کر لیا۔ ایک اسکول میں نام لکھوا دیا، گاڑی کے وقت سے تین چار گھنٹے پہلے ناشتہ، اسباب، سب تیار کرا دیا، لیکن جب جدائی کا وقت آیا تو انکی آنکھوں میں آنسو تھے، میری بھاوج بھائی سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگیں، باہر لوگ چلاتے رہ گئے اور گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ عمر جس میں بھائی تعلیم حاصل کر سکتے تھے یوں گذر گئی، کچھ مہینہ بعد اولاد کی پہلی قسط عطا ہوئی، ماں باپ، دادی، دادا کے بلند حوصلے پورے ہوئے جب صاحب اولاد ہونے کا فخر حاصل ہوا اور کسی فن میں طبع آزمائی کی حاجت نہیں۔ یہ کارنامہ تمام عمر کے لئے کافی ہے۔ لوگوں کے اصرار سے بھائی کے لئے نوکری تلاش کیجا رہی تھی لیکن وہ خود بچے کو کھلانے میں اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں پر صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ نوکری کی شرطیں پوری نہیں کر سکتے، اور اگر ماں باپ کی محبت آمیز نظروں سے دیکھا جائے تو وہ نوکری سے ہزار درجہ بہتر کام میں مشغول ہیں، وہ غالباً تمام عمر اسی مبارک کام میں مشغول رہتے لیکن فطرت کے بھی کچھ احکام ہیں جن کے خلاف عمل کرنے کی سزا ملتی ہے۔ اٹھارہ برس کے سن تک میری بھاوج کے تین بچے ہو چکے تھے یوں وہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھیں مگر دیکھنے میں دس سال کا فرق معلوم ہوتا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے، گالوں پر جھریاں، کمر میں خم، بڑھاپے کے تمام آثار نوجوانی میں دیکھنا انکی قسمت میں لکھا تھا، انہوں نے دیکھا اور گھبرائیں، میرے بھائی نے دیکھا اور اپنی پرانی محبت بھول گئے۔ کمسنی میں شادی کرنے سے انکی صحت کچھ دنوں خراب رہی جسمانی نشو و نما رک گئی، ہوس میں کوئی فرق نہیں آیا، میری بیچاری بھاوج کو انکے ہوس کی شدت، اور طبیعت پر ہوس کا بوجھ ہلکا کرنے کی ترکیبیں چند دنوں میں معلوم ہو گئیں، اور بڑھاپے کے آثار موت کا پیش خیمہ بن گئے۔

کبھی کبھی مجھے انسان کی قوت برداشت دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم ذی روح نہیں۔ اگر ہوتے تو یہ چند روزہ تماشا ہمیں ہرگز اتنا عزیز نہ ہوتا، اور ہم خوشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ بھائی کا رنگ دیکھ کر بھاوج کو یا تو زندگی کا نیا سامان کرنا چاہیئے تھا، یا موت میں پناہ لینا۔ مگر وہ علاج کرا کر موت کو

ٹالتی رہیں، انہیں مرتے مرتے کئی سال گذر گئے، حالانکہ اُنکے مرنے سے بہت پہلے انہیں لوگ دفن کرچکے تھے۔

بیوی سے لطف اٹھانے کی امید جاتی رہی تو میرے بھائی کو نوکری کی پھر فکر ہوئی۔ علاوہ کسب معاش کے اس میں اور مصلحتیں بھی تھیں۔ آزادی، اطمینان، بیمار بیوی کے پنجے سے رہائی بھاوج کی تیمارداری میرے حصہ میں آئی، بچوں کا دلار میرے والد کے۔ بھائی جب جانے لگے تو ایسی عجلت تھی کہ بیوی سے رخصت ہونا بھی بھول گئے۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد جب وہ بیوی کی قبر میں مٹھی بھر خاک ڈالنے آئے تو اُن کی آنکھوں میں ایک نئی ؎ اور میرے نزدیک ایک ں رور بیہودہ مستی کا خمار تھا، ہر یا ہر طبیعت میں بے پروائی اور ایک خاص قسم کی صحبت کا شوق، جس میں بہن یا باپ کی موجودگی نامناسب تھی۔ دوسرے کچھ بھی کہیں، میں ایسے لوگوں کو زندہ نہیں سمجھتی۔ ان میں وہی بدبو ہوتی ہے جو سڑے گوشت میں میرا رویّہ تو نہایت درست رہا۔ مگر معلوم ہوتا ہے میری آنکھیں میرا راز چھپا نہ سکیں، میرے بھائی مجھ سے شرمانے لگے، مجھ سے چھپنے لگے اور میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ہم دونوں میں محبت ہوتی تو کس بنا پر؟ یہی بہتر تھا کہ ہم یہ حوصلہ ہی نہ کریں۔

لیکن میرے باپ کی محبت کے ساتھ حوصلے کی شرط نہیں تھی، اُن کو بہو کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا، اس صدمے نے یہ خواہش پیدا کی کہ لڑکے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیں بھائی کو بھی گھر پر رہنے کی کوئی مصلحت سوجھی، اور انہوں نے ایک روز باقاعدہ استعفا بھیج دیا میرے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بوڑھے باپ کی اور کیا آرزو ہو سکتی ہے؟ میرے بھائی سویرے اُٹھ کر کسی سے ملنے چلے جاتے ہیں، دن کا کھانا کھا کر تین چار گھنٹے سوتے ہیں شام اور رات کو کون جانے کب گئے کب آئے۔ کوئی پوچھے بھی تو بتائے کون؟ بوڑھا باپ بڑھاپے کے حوصلے پورے کر رہا ہے، جوان بیٹا جوانی کے۔ یہی ہمارے آئین حیات ہیں۔ جو نہ مانے اُسے دو چار اور باپ بیٹوں کی داستان سنا دیجئے، اگر نہ سمجھے تو بیوقوف ہے اس

کی ہنسی اڑائے . . .

ایک عمر تھی جب میں نے صبر کرنا نہیں سیکھا تھا، لیکن اب میں اسی فن میں دوسروں کو سبق دینے پر تیار ہوں، بغیر اپنی بیقراری کھوئے ہوئے دنیا کو اس کے رنگ پر چلتے دیکھ سکتی ہوں، اور فریاد نہیں کرتی، شکایت نہیں کرتی۔ میں نے جن حوصلوں سے زندگی شروع کی تھی، جس آزادی کی ہوس میں میں نے اپنی گرفتاری منظور کی تھی وہ اب ایک دھندھلا سا خواب ہو گئی ہے، کبھی کبھی جی بہلانے کے لئے میں دل آزار حقیقتوں سے منہ پھیر لیتی ہوں، میری تمنائیں زندگی کا نقشہ ایسا بگاڑ دیتی ہیں کہ میں اس سے ایک نئی زندگی بنا سکوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتی کہ یہ بگاڑنا اور بنانا محض تصور کی اٹکھیلیاں ہیں جنہیں ہستی کا جامہ پہننا کبھی نصیب نہ ہوگا . . . لیکن اگر میں نے یہ تسلیم کر لیا تو میں اپنی زنجیریں کیوں نہیں توڑ ڈالتی، اپنی تمناؤں کی طرح ہستی سے مایوس ہو کر، مگر ہستی کی حسرت دل میں لئے ہوئے نیستی میں کیوں پناہ نہیں لیتی؟ ہونا تو یہی چاہئے، ہوگا بھی یہی، مگر اس وقت جب میں زندگی کی ساری رسوائی جو میری قسمت میں لکھی معلوم ہوتی ہے، برداشت کر چکوں گی، کیا کروں کیا کہوں، انسان مٹی سے بنا ہے۔

کبھی کبھی جب پوتوں کو دیکھتے دیکھتے تو اسے بھی دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو میرے والد ان چند احباب سے جو شام کو انکے پاس آ بیٹھتے ہیں، میری شادی کے امکان پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ ابھی تک تو یہ محض ایک گفتگو کا موضوع ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا کوئی نتیجہ نکلے میں اسی اندیشہ میں اپنی سرگذشت لکھ رہی ہوں، شاید کبھی، جب میری زنجیریں مجھ میں جنبش کی کوئی طاقت نہ چھوڑیں تو میرا یہ جوش میری یہ حسرتیں مجھے اس شدت سے یاد آئیں کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالوں یا اپنی زنجیریں، انسان کا دل بھی خود انسان کی طرح مٹی کا ہوتا ہے، میں یہ بھی ڈرتی ہوں کہ کبھی اسے تجسس یا تنگ پا کر میری تمنائیں اسے چھوڑ نہ دیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے سب سے زیادہ اسی کا خوف ہے۔ اپنے قصبہ اور اپنی زندگی کو دیکھتے

ہوئے اس کی امید کرنا فضول ہے کہ مجھے ایک رفیق اور ہمدم ملے گا جو میری فطرت سے واقف ہو، یا واقف ہونا چاہئے ، مجھے اس امید پر بھی کوئی اعتبار نہیں کہ میری بیقراری ایک حیوانی سکون میں تبدیل نہ ہو جائے گی۔ میری دعا یہی ہے کہ میرے توسط سے جو ہستیاں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں وہ میری تڑپ ،میری بیقراری اپنے میں لے کر آئیں، میری آرزوؤں کو ورثے میں طلب کریں ۔ اُس آگ کو لے کر جو میرے سینے میں دہک رہی ہے، اُس مٹی سے جس کے آس پاس ڈھیر لگے ہیں پکی ، دلدار اینٹیں بنائیں اور ان اینٹوں سے زندگی کی ایک نئی عمارت کریں، ہمت کی طرح مضبوط، حوصلے کی طرح بلند اور دل کی طرح کشادہ۔

فتح مبین

یہ نظم جناب اقبال سہیل صاحب نے ۲۲ء میں لکھی تھی جب ترکی نے یونان پر فتح عظیم حاصل کی بات پرانی ہوگئی لیکن نظم ابھی نئی ہے اس لئے کہ ابتک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

صبح آمد و از فیض سحر نغمہ سرا شد — ہر غنچہ کہ وا شد
گلبرگ تو گوئی ہمہ تن دست دعا شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد شکر شب تیرۂ آفات سر آمد — صبح ظفر آمد
ہر طرب از پردۂ شب جلوہ نما شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد شکر کہ باز آں قدح بادہ بگردید — پر از مے توحید
گوئید بتاں کہ در میکدہ وا شد — بہ بہ چہ بجا شد
ہر اشک کہ از دیدہ فرو ریخت گہر شد — ہمدوش اثر شد
ہر نالہ کہ از سینہ بروں جست رسا شد — بہ بہ چہ بجا شد
ہر عقدہ کہ در حیطہ تدبیر نبودہ — تقدیر کشودہ
ہر کام کہ ملت ز خدا خواست روا شد — بہ بہ چہ بجا شد
خون امرا ریختہ از غصہ چو دونال — عدلیہ یوناں
خود تیغ ستمگر بسر شس برق بلا شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد چاک بشد سینہ سر عسکر یوناں — از خنجر یوناں
انجام جفا عاقبت الامر جفا شد — بہ بہ چہ بجا شد
عیار اروپا کہ بس از پردہ فسوں کرد — تجہیز فسوں کرد
حیرت زدۂ بوالعجبہائے قضا شد — بہ بہ چہ بجا شد
آن گرگ فسوں ساز نکا بینہ بدر شد — داغش بجگر شد
برہم ہمہ شیرازہ دارالوزرا شد — بہ بہ چہ بجا شد

شذرات

ہمیں نہایت ندامت ہے کہ ہم نے رسالے کی اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہیں کرسکے۔ اگست اور ستمبر کے نمبر پچھلے مہینے میں تیار ہوچکے تھے لیکن طباعت کی مشکلات سے اگست کا پرچہ ۱۵ اکتوبر کو شائع ہوا اور ستمبر کا اب چھپ رہا ہے۔ اکتوبر کے پرچے کو نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع کرنے کی کوشش ہے خدا کرے اب کے ہمیں قارئین کرام سے ندامت نہ اٹھانا پڑے۔

جامعہ ملیہ کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بھوپال اور حیدرآباد میں ہمارے وفد کو شاندار کامیابی ہوئی۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیلات شائع نہیں کرسکتے کیونکہ جناب شیخ الجامعہ نے ابھی باضابطہ روداد نہیں بھیجی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ مہینے میں ہم وفد کی رپورٹ شائع کرینگے

اس مہینے کے وسط میں افغانستان سے جو خبریں آئی ہیں انھوں نے سب ہندوستانیوں کے دلوں کو خوشی سے معمور کردیا ہے۔ افغانستان کے مایہ ناز فرزند امان اللہ خاں کی بدولت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوؤں کو بھی اپنی ہمسایہ قوم سے سچی محبت ہے اور وہ اس کی فلاح و بہبود کے دل سے خواستگار ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے سنا کہ افغانیوں نے آخر کار جاہل اور ظالم بچہ سقہ کے پنجۂ غضب سے چھوٹ کر جنرل نادر خاں کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی تو انہیں ایسی مسرت ہوئی کہ اس سے بڑھ کر اگر کبھی ہوگی تو خود اپنے ملک کی آزادی سے ہوگی۔ کسی قوم کو عقل سلیم اور عزم مستقیم کی بدولت آزادی اور ترقی کے نصب العین کی طرف بڑھتے دیکھ کر

دل میں اس جوش اور ولولے کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے

اس سے بھی زیادہ مسرت ہندوستانیوں کو ہوتی اگر اہل افغانستان امان اللہ خاں کو اطالیہ سے بلا کر اپنا بادشاہ بناتے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ افغانستان میں اندرونی پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور کوئی شخص باہر سے بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان دونوں سرداروں میں سے کون اپنے ملک کی عنان حکومت ہاتھ میں لے کر ملک و قوم کی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے وہ حسن ظن سے کام لے کر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غالباً موجودہ صورت میں وہی سب سے مناسب ہے۔

لیکن ابھی افغانستان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ جن عناصر نے امان اللہ خاں کی حکومت کی بنیاد متزلزل کر دی تھی یعنی امرا کی خود غرضی اور علماء کی ناعاقبت اندیشی اور مالی دقتیں وہ سب بدستور باقی ہیں۔ نادر خاں سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ملک کو دو بار ذلت اور غلامی کی پستی سے عزت و آزادی کی بلندی پر پہنچا چکے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان میں ملک گیری کے ساتھ ملک داری کی قابلیت بھی ہے یا نہیں۔ اسی لئے افغانستان کے بہی خواہ وہاں کی حالت سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اور واقعات کی نشو و نما کا بہت تردد کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ افغانستان میں امن و آسایش کا دور دورہ ہو اور یہ ملک جس نے حصول آزادی کی کوشش میں اب تک صرف مصیبتیں جھیلی ہیں آزادی کی برکات سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

ہندوستانی اکادمی نے اپنے ممبروں اور دوسرے اہل قلم کے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے جس میں اپنا لائحہ عمل بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اکادمی چاہتی ہے کہ اردو اور

ہندی میں تین طرح کی کتابیں شائع کرائے

(۱) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اوسط درجے کی تعلیم پائی ہے اس طرح کی کتابیں جن کے پڑھنے سے ان کی معلومات میں وسعت ہو اور وہ ذاتی مطالعے کے ذریعے اعلیٰ معیار تعلیم تک پہنچ جائیں۔

(۲) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ابتدا سے انگریزی مدارس میں تعلیم پائی ہو اور اسے تکمیل کے درجے تک پہنچایا ہے ایسی کتابیں جنہیں پڑھ کر وہ اپنی مادری زبان کے ادب اور اپنے قومی تمدن سے گہری واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۳) کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے عام فہم کتابیں۔

اکادمی نے ان موضوعوں کی فہرست شائع کی ہے جن پر کتابیں لکھی جائیں گی۔ یہ فہرست بہت طویل ہو اور اس میں تقریباً کل علوم و فنون شامل ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت ہندوستان میں متعدد ادارے اردو اور ہندی کی ترقی کے لئے موجود ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں ان کی خدمت کر رہے ہیں مگر افسوس ہو کہ ان میں اب تک پوری طرح تقسیم عمل نہیں ہوئی ہے۔ اردو میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکادمی الہ آباد اور اردو اکادمی دہلی اور بعض دوسرے ادارات تقریباً ایک ہی قسم کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مقاصد مخصوص ہیں لیکن ان مقاصد کی پوری طرح پابندی نہیں ہوتی۔ غالباً یہی حال ہندی کی اشاعت کے ادارات کا بھی ہو اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ ان متفرق کوششوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ اتحاد عمل بھی ہو سکے اور تقسیم عمل بھی۔ یہ کام کسی عام کانفرنس میں انجام پانا ناممکن ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ صرف

مختلف ادارات کے نمائندے ہر سال کسی جگہہ جمع ہوکر تبادلہ خیالات کیا کریں۔ خواہ اس کا مرکز کوئی ایک ادارہ قرار دیا جائے یا باری باری سے ہر ادارہ دوسروں کو جمع کیا کرے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سب اداروں کے مدیر اس تجویز پر غور فرمائیں گے اور اسے عمل میں لانے کے لئے بہت جلد مناسب تدابیر اختیار کریں گے۔

جامعہ کے ایک طالب علم نے ۱۳ ستمبر ۲۹ء کا اخبار "سچ" مجکو لاکر دکھایا جس میں مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی نے لکھا ہے "روضۂ اقدس (رسول) زمین، آسمان، کعبہ، عرش اور کرسی سب سے افضل ہے" جس کے صریح معنے یہ ہوئے کہ رسول کا روضہ جب عرش الٰہی سے بڑھ کر ہوا تو رسول اللہ سے بڑھکر ہے (نعوذ باللہ)

کیا یہ اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی اہانت نہیں ہے!!

بریلی اور بدایوں کے رسول پرستوں نے تو اسی پر اکتفا کی تھی کہ

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر   اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہوکر

مگر مولوی عبدالماجد صاحب نے اس سے بھی آگے قدم اٹھایا اور رسول کا رتبہ اللہ سے بھی بڑھا دیا

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ فقہا نے ایسا کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقیدہ کا ہے جسکے لئے نص صریح کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے جذبہ کی حالت میں ایسا لکھا بھی ہو تو وہ شطحیات میں شمار ہوگا سند نہیں ہوسکتا قرآن میں ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ   رشتے زمین کے اکثر لوگ اگر تو انکی اطاعت کرے تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دینگے

رسول بندہ ہے اور بشر۔ یہی قرآن میں اسکو حکم دیا گیا ہے کہ "قل انما انا بشر مثلکم" اسکی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسکا رتبہ اللہ سے بڑھایا جائے اور ایسی بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے جس کی نظیر زمانہ جاہلیت میں بھی نہیں مل سکے گی۔

THE CULTURAL SIDE OF ISLAM

Madras Lecture on Islam

(No. 2)

Muhammad Marmaduke Pikthall

Delivered at Madras in January 1929.

CONTENTS.

Price 1/8/-
Bound 2/-

To be had of :—

National Muslim University Book Depot,

KAROL BAGH,

DELHI.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

تاریخ عثمانیہ پر[1] ایک نظر

آل عثمان کی حکومت غازی عثمان خاں کے عہد سے جس نے سلطان علاء الدین سلجوقی کے تاتاریوں کے ہاتھ سے مارے جانے کے بعد ۷۰۰ھ میں بالاستقلال سلطنت حاصل کر لی تھی اس خاندان کے آخری فرمانروا عبدالمجید ثانی کے عہد تک جو ۱۳۴۲ھ میں معزول کیا گیا چھ سو بیالیس سال رہی۔ یہ ایسی طویل مدت ہے جو کسی اسلامی حکمراں خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے پہلے ۹ بایزید ثانی تک سلطان تھے اور بقیہ سلیم اول سے لیکر عبدالمجید ثانی تک سلطنت کے ساتھ خلافت کے منصب سے بھی ممتاز تھے۔

آل عثمان کا یہ کل عہد دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور ترقی دوسرا دورِ زوال غازی عثمان خاں کے استقلال یعنی ۷۰۰ھ سے لیکر سلیمان اعظم کی وفات یعنی ۹۷۴ھ تک دور ترقی رہا جس میں یہ سلطنت قوت۔ شوکت اور مقبوضات کی وسعت کے لحاظ سے برابر بڑھتی رہی اور اس کے بعد سے آجتک دورِ زوال ہے جس میں سلسلہ وار اس کے حصے نکلتے جا رہے ہیں۔

عین عروج کے زمانے میں بایزید ایلدرم کے عہد میں جبکہ وہ یورپ میں فتوحات کر رہا تھا ۸۰۴ھ میں تیمور لنگ کے ناگہانی حملہ سے اس سلطنت کو کاری زخم لگ گیا تھا مگر چونکہ اس وقت اقبال کا دور تھا اور ترکوں کے فاتحانہ جذبات جوش پر تھے اس لئے بہت جلد یہ زخم مندمل ہو گیا۔

سلطنت

جس وقت آل عثمان نے اپنی سلطنت قائم کی اس وقت تاتاریوں کے حملہ سے بغداد کی عباسی خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور جملہ اسلامی مشرقی ریاستیں انکے پنجۂ ستم میں نیم جان ہو رہی

---

[1] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہفتم کا آخری باب ہے جس پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے

تھیں۔ خوارزم شاہ نے کوچک میں سلجوقی سلطنت کو بھی انہوں نے فنا کر ڈالا تھا اور طوائف الملوکی کی حالت میں چند چھوٹی چھوٹی امارتیں رہ گئی تھیں جو باہمی جنگ و پرخاش سے فنا کے ساحل سے آلگی تھیں۔

آل عثمان نے اپنی شجاعت اور فرزانگی سے ان متفرق ریاستوں سے جو سلجوقی سلطنت کے کھنڈر پر قائم تھیں ایک زبردست سلطنت تعمیر کی۔ اور پھر اولوالعزمی سے مقبوضات کا دائرہ یہانتک وسیع کیا کہ یورپ میں داخل ہو گئے اور رفتہ رفتہ بلقان کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ یہانتک کہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا جو اسلام کی ایک پرانی آرزو تھی اور سلطان سلیم نے شام و مصر کو جس سے حرمین شریفین بلکہ سارا عرب عثمانی قلمرو میں آگیا۔ اس کے بعد سلیمان اعظم وسطی یورپ میں ویانا کی فصیل تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف افریقہ میں الجزائر اور مراقش تک ہلالی پرچم کے نیچے آگئے اور عثمانی سلطنت نہ صرف اپنی وسعت بلکہ بری اور بحری قوت و شوکت کے لحاظ سے بھی اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت ہو گئی جس کے حدود بوڈاپسٹ سے دریائے نیل تک اور فرات سے جبل طارق تک پھیلے ہوئے تھے۔

شاہان یورپ اس زمانے میں بجائے سلطان کے اس کے صدر اعظم کو مخاطب کرتے تھے اور اپنی مشکلات میں امداد مانگتے تھے ۱۵۸۸ء مطابق ۹۹۶ھ میں جب ہسپانیہ کا گریٹ آرمیڈا انگلستان پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا ملکہ ایلزبتھ نے مسٹر ہیر لون کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان مراد ثالث کے وزیر محمد پاشا صقلی سے ان "کیتھولک کفار" کے مقابلہ میں مدد چاہی مگر اس وقت جنگ ایران کی وجہ سے امداد نہ دی جا سکی۔ سلیمان اعظم کے عہد میں شاہ فرانس فرینسس اول نے شارلکان کے مقابلہ میں امداد کی دوبار درخواست کی اور دونوں مرتبہ سلطان نے بری اور بحری مدد دی۔

خلافت

۹۲۳ھ میں اسلامی خلافت آل عثمان کے ہاتھ میں آئی۔ ترک چونکہ حنفی المذہب تھے

اس وجہ سے حنفیہ نے بالعموم انکی خلافت کو تسلیم کرلیا۔ اور جا بجا ملکوں میں انکے نام کے خطبے پڑھے جانے لگے۔ لیکن مالکیہ ایک مدت تک بوجہ قریشی نہ ہونے کے عثمانیوں کی خلافت کے قائل نہ ہوئے۔

چونکہ آل عثمان کو خلافت فتح مصر سے ملی تھی اس لئے بالطبع وہ اپنے اس رتبۂ سلطنت کو جس کی بدولت انہوں نے مصر کی سلطنت اور خلافت دونوں کو حاصل کیا تھا ہمیشہ اہم سمجھتے رہے لیکن خلافت کی مذہبی وقعت انکی نگاہ میں تھی۔ چنانچہ سلطان محمود نے ۱۲۴۱ھ میں انکشاریہ کی بغاوت میں علم نبوی کو نکالکر اسکی روحانی قوت سے کام بھی لیا مگر انہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور عرب کے محافظ ہونے کے کہ وہ انکی سلطنت کا ایک جزو تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ نہ عالم اسلامی کی دینی یا دماغی رہنمائی کی اور غالبًا یہ ان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی اور نہ کبھی انکی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ یہانتک کہ حج جس میں جملہ اقطار عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ آخری زمانے میں سید جمال الدین افغانی کے اثر سے عبدالحمید ثانی نے وحدت ملت کی طرف توجہ کی اور حجاز ریلوے کو امت کی مشترکہ ملکیت قرار دیکر عالم اسلامی کے اندر ترکی خلافت کا احساس پھیلایا جس سے ممکن تھا کہ اچھے نتائج مترتب ہوتے کہ ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے خلافت ہی کا الغا کر دیا جس سے یہ منصب مع اپنے عظیم الشان فوائد کے نہ صرف ترکوں بلکہ امت کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

ولی عہدی

آل عثمان میں اگرچہ شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ خاندان کا بڑا شخص سلطنت کا متولی ہو لیکن پھر بھی اکثر تخت نشینی پر نزاعیں برپا ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے ایک بھائی جب تخت پر آجاتا تھا تو اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ چنانچہ بایزید اول نے اپنے بھائی یعقوب کو علماء سے فتویٰ لیکر اور سلیم اول نے اپنے دونوں بھائیوں احمد اور کرکود کو گرفتار کرکے مار ڈالا۔ مراد ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کیا اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے چھوٹے

بڑے ۱۹ بھائیوں کو جو سب کے سب مراد کے ساتھ ہی دفن کیے گئے۔

آخر میں یہ صورت اختیار کی گئی کہ محروم شاہزادے محلات میں نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ کوئی خطرہ بھی نہ رہے اور خون ناحق بھی نہ بہے۔

نظام سلطنت

مہمات سلطنت میں سلطان فرمانروائے مطلق تھا جس کی اطاعت لازمی تھی اور بشرط رعایت نصوص قرآن اس کو رعایا کے جان و مال اور سلطنت کے سیاہ سفید پر کلی اختیارات حاصل تھے۔

حکومت کے سب سے بڑے دو عہدہ دار تھے ایک صدر اعظم جو امور ملکی و فوجی کا کفیل ہوتا تھا دوسرا شیخ الاسلام جو شرع شریف کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ صدر اعظم کے ماتحت جملہ وزرا اور ملکی دفاتر تھے اور شیخ الاسلام کی نگرانی میں جملہ قضاۃ اور محکمہ جات شرعی۔ علاوہ مذہبی امور کے مہمات سلطنت مثلاً اعلان جنگ۔ معاہدہ۔ عزل و نصب سلاطین وغیرہ میں بھی شیخ الاسلام کا مشورہ یا فتویٰ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

فریق علما یعنی رجال شرع میں سے دو شخص خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ایک قاضی عسکر روم ایلی دوسرا قاضی عسکر اناطولیہ۔ یہ دونوں جنگ اور سفر میں سلطان کے ہمراہ رہتے تھے تاکہ فوج میں کوئی اختلاف پیدا ہو تو رفع کریں۔ انہیں میں سے کوئی شیخ الاسلامی کے منصب پر آیا کرتا تھا۔ سلطان اگرچہ شیخ الاسلام کو برطرف کرسکتا تھا مگر جبتک وہ اپنے عہدہ پر ہو اس کو سزا نہیں دیسکتا تھا۔ نہ اس کے فتوے کی مخالفت کا اختیار رکھتا تھا۔ چنانچہ سلطان سلیم اول نے جو اپنے عقیدہ اور عزم دونوں میں بہت سخت تھا عثمانی قلمرو میں شیعوں کے استیصال کے بعد یہ ارادہ کیا کہ سلطنت کے جملہ مشرکوں۔ کافروں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کو قتل کرکے انکے معبدوں اور کنیسوں کو مسجد بنالے تاکہ ملک میں صرف ایک ہی دین رہجائے۔ مشورتاً ایک دن شیخ جمالی سے جو اس کے عہد میں مفتی اعظم تھے پوچھا کہ دنیا کو فتح کرنا بہتر

ہے یا قوموں کو مسلمان بنانا؟ ۔ شیخ مذکور نے جواب دیا کہ مسلمان بنانے میں زیادہ ثواب
ہے ۔ اس کے بعد سلطان نے صدر اعظم کو لکھا کہ سلطنت کے ہر گوشہ میں اعلان کر دیا جائے
کہ جو اسلام نہ لائے گا قتل کر دیا جائے گا ۔

اس سخت فرمان سے صدر اعظم کو تردد ہوا ۔ اس نے شیخ جمالی سے کہا کہ سلطان نے
اس حکم میں تمہارے قول سے سند لی ہے ۔ شیخ مذکور آستانہ کے بطریک کو لیکر سلطان کے
پاس جو اس وقت ادرنہ میں تھا پہنچے ۔ اور وہ عہد نامے پیش کرائے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد
سلطان محمد نے نصارا کے ساتھ کئے تھے ۔ نیز قرآن کا حکم سنایا کہ اہل کتاب جزیہ لیکر مذہب میں
آزاد چھوڑے جائیں ۔ سلطان کو مجبوراً اپنا فرمان واپس لینا پڑا ۔

داخلی نظم و نسق کے لئے جو دفتر تھا اس کو دیوان دولت کہتے تھے ۔ اس میں پہلے تین
وزیر ہوتے تھے لیکن سلطان احمد ثالث نے ان میں متانت دیکھکر جس کی وجہ سے اکثر
کاموں میں ابتری واقع ہو جاتی تھی ان کی تعداد آٹھ کر دی جن کا رئیس صدر اعظم ہوتا تھا ۔
انہیں کی مشاورت سے مہمات سلطنت طے پاتے تھے اور ماتحت دفاتر نیز سلطنت کے
صوبوں اور ایالتوں کے حکام و عمال کی نگرانی بھی انہیں کے ذمہ تھی ۔

بحری فوج قپودان پاشا کے ماتحت ہوتی تھی اور بری صدر اعظم کے ۔ ان افواج کی تربیت
و تنظیم میں ترک اپنے دور ترقی میں دیگر اقوام عالم سے فائق رہے

یہ ارکان دفاتر ۔ حکام ولایات ۔ جاگیرداران ۔ امرا لشکر بلکہ بالعموم متوسلین سلطنت بوجہ
دولت کی فراوانی کے رئیسانہ بلکہ شاہانہ عیش و آرام سے زندگیاں گزارتے تھے ۔ چونکہ غلامی کا بھی
رواج تھا اس وجہ سے انکے گھروں میں غلاموں اور کنیزوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی تھی ۔

ترک

اصلی اوغوز ترک جو ارطغرل اور دوندار کے ساتھ ارض روم میں آئے تھے دو ہزار نفوس سے
زیادہ نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ دیگر قبائل جو سلجوقی عہد میں وسط ایشیا سے گئے تھے انکے ساتھ شامل

ہوتے گئے۔ اور پھر انکی سلطنت کے عروج کے ساتھ ساتھ مفتوح اقوام رومی اور صقلابی وغیرہ کثیر تعداد میں اسلام لاتی گئیں جو سب کے سب ترک بولے جانے لگے اور یہ لفظ مسلمانان سلطنت ترکی کے مرادف ہوگیا جن میں مختلف قومیں شامل تھیں۔

اسلام

ترکوں نے شعائر اسلامی کا ہمیشہ احترام رکھا۔ یہ انکے بے ریا اور مخلصانہ اسلام کا اثر تھا کہ مفتوحہ قومیں جن کو پوری مذہبی آزادی تھی اپنے دلی شوق سے اسلام قبول کرنے لگیں۔ بسنیا بلغاریا۔ رومانیا اور یونان خاصکر البانیا میں بلا جبر و اکراہ بے شمار عیسائی اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ انکشاری فوج جس میں وہ نصرانی جوان لئے جاتے تھے جو مسلمان ہو جاتے تھے اس کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور بلقان کے عیسائی رؤسا اپنے اپنے بیٹوں کو خود خوشی سے لاکر اس میں بھرتی کراتے تھے۔

ترک بالعموم مجاہد اور سر فروش ہونے کے ساتھ عقائد کے پکے اور عبادات کے پابند تھے اور اپنی خانگی زندگی روزمرہ کے معاملات اور اخلاق میں خالص مسلمان۔ اُن میں بخلاف دیگر اقوام کے باہمی محبت اور اخوۃ بھی زیادہ ہے۔

ترک سلطان و رعایا ہمیشہ سے ایک مذہب حنفی کے پابند رہے اس وجہ سے ان میں اختلافی جھگڑے بہت کم پیدا ہوئے لیکن تصوف کے ساتھ بھی انکو عقیدت تھی اور پیری و مریدی کا سلسلہ بھی رائج تھا جس کے باعث کبھی کبھی فتنوں کا ظہور ہوتا رہا۔

سلاطین آل عثمان میں سے سلیم اول مذہب حنفی کا سب سے بڑا علمبردار تھا جس کی خواہش یہ تھی کہ اس کے قلمرو میں بجز اس مذہب کے اور کوئی دوسرا مذہب نہ رہنے پائے۔

رواداری

ترکوں کے اوصاف میں جہاں شجاعت سب سے نمایاں وصف ہے جس کو ان کے دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں وہاں انکی رواداری کی صفت بھی اقوام عالم سے بڑھکر ہے

انہوں نے ہمیشہ غیر جنس اور کمزور قوموں کے ساتھ نہ صرف عادلانہ بلکہ مساویانہ سلوک کیا۔ اور اپنی محکوم قوموں کے مذہب میں کبھی دست اندازی نہیں کی۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں یہودی مقہور اور مظلوم تھے اور ترکوں کے سایہ میں انکو امن و آرام نصیب ہوتا تھا۔ سلطان محمد نے فتح قسطنطنیہ کے بعد بطریک کے عہدہ اور عیسائیوں کے حقوق کو محفوظ رکھا جس کی وجہ سے رومی جو وہاں سے بھاگ گئے تھے پھر واپس آکر امن سے رہنے لگے۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ھونیا د کی قیادت میں جو کیتھولک تھا میدان قوصوہ میں صف آرا تھا اس وقت اس کے ساتھی شاہ سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہوگئی تو کیا کروگے؟ اس نے کہا کہ سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا لیکن یہی سوال جب شاہ سربیا نے سلطان مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں کنیسہ بنوا دوں گا کہ جسکا جی چاہے مسجد میں آئے اور جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے چنانچہ شاہ سربیا نے جو یونانی چرچ کا تابع تھا ھونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا اور مورخین لکھتے ہیں صلیبیوں کی شکست کھانے کی یہی وجہ ہوئی۔

ایک بار عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان کسی ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قتل کر دئیے جائیں گے؟ مفتی نے جواب دیا بے شک۔ دس نہیں ایک ہزار بھی۔

ان رواداریوں کی وجہ سے باوجود بیرونی سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں کے بھی غیر مسلم خاصکر ان عیسائیوں کے دلوں میں جن کو ترکوں سے واسطہ پڑا تھا ترکوں کی وقعت اور عظمت تھی چنانچہ عبدالحمید ثانی کے آغاز جلوس ۱۸۷۷ء میں جب روسیوں نے دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کی اُس وقت ہنگری کے عیسائیوں نے جو ایک مدت سے عثمانی سلطنت سے مطلقاً آزاد تھے اپنے اخلاص کا اس طرح اظہار کیا کہ ایک وفد بھیجکر مرصع تلوار عبدالکریم پاشا کی خدمت میں پیشکش کی جو روس کے مقابلہ کے لئے مامور ہوئے تھے۔

ترکی ادب

عثمانی ترکی چغتائی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سلطنت عثمانی کے قیام سے پیشتر کوئی تصنیف یا تالیف نہ تھی۔ چونکہ ترک سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا اسلئے ترکی ادب کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر پڑی۔ اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ کئے گئے۔ اس وجہ سے عثمانی ترکی میں فارسی اور فارسی سے زیادہ عربی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔

نویں صدی ہجری کے وسط میں جب سلطان حسین والی ہرات کے وزیر امیر علی شیر نوائی کا ترکی دیوان قسطنطنیہ میں پہنچا اس وقت سلطان محمد فاتح کے وزیر احمد پاشا نے جو ادب سے ذوق رکھتا تھا ترکی میں شعر گوئی شروع کی جس کی وجہ سے نہ صرف عوام بلکہ خود سلطان کو بھی اس سے دلچسپی ہوگئی اس کے بعد رفتہ رفتہ ترکوں میں شعر کا ذوق بڑھتا گیا۔ اور بڑے بڑے شعراء مثلاً ابن کمال۔ فضولی۔ نابی۔ ندیم اور غالب وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے غزل۔ قصیدہ اور مثنوی میں نام پایا۔ خود بعض سلاطین آل عثمان بھی شعر کہتے تھے جن میں سے سلیم اور مراد خاص طور پر مشہور ہوئے لیکن ترکوں کی یہ شاعری نہ صرف وزن و بحر بلکہ معنی اور روح کے لحاظ سے بھی فارسی شاعری کے مشابہ تھی جس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے منقطع ہو چکے تھے۔ آخری دور میں جب مغربی خیالات کے اثر سے ترکی میں نئی ذہنیت پیدا ہوئی تو انکی شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا جس کے علمبردار نامق کمال۔ حامد۔ توفیق فکرت اور محمد عاکف وغیرہ ہیں جنہوں نے حسن و عشق کے فرسودہ افسانے چھوڑ کر اثبات زندگی اور ذوق عمل کے نغمے گائے اور عقل و تدبیر کی تحقیر اور توکل و تقدیر کی غلط تعبیر جو تصوف کے اثر سے دلوں میں جاگزیں ہوگئی تھی دور کر کے حریت فکر اور سعی پیہم کی طرف راہنمائی کی۔ ترکی میں بھی فارسی کی طرح نظم نے بہ نسبت نثر کے زیادہ ترقی پائی۔ نثر کی پہلی کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے جو سلطان محمد فاتح کے وقت میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے دینیات، تاریخ اور ادب میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ترکی میں پہلا مطبع وزیر اعظم ابراہیم پاشا نے جو ندیم شاعر کا ممدوح تھا قائم کیا۔ اس میں

ترکی کی پہلی مطبوعہ کتاب ترجمہ قاموس ۱۷۲۹ء میں چھاپکر شائع کی گئی۔

عثمانی ترکی جب سے کتابت میں آئی اسی وقت سے عربی حروف میں لکھی جاتی تھی سال گذشتہ سے جمہوریہ ترکیہ نے اس کو لاطینی حروف میں کر دیا ہے

انقلاب

ترکوں میں بھی دوسری مسلما قوموں کی طرح بجزذات شاہانی کے کوئی ادارہ سیاسی نہ تھا۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد چپہ چپہ میں آزادی کے خیالات پھیل گئے تھے جن سے عثمانی عیسائی رعایا بھی متاثر ہوئی اور اپنی آزادی کے لئے مختلف طریقوں سے جدوجہد کرنے لگی جس میں آخرکار وہ کامیاب بھی ہوئی مگر ترکی طبائع پر اسکا اثر بہت کم پڑا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے ترکوں میں حریت کا احساس پیدا کیا مدحت پاشا تھا جس کی کوششوں سے سلطان عبدالحمید ثانی نے اپنے آغاز جلوس میں دستوری حکومت کا اعلان کیا مگر احساس اس قدر کمزور تھا کہ سلطان نے دستور کو توڑ کر مدحت پاشا کو طائف میں نظر بند کر دیا اور احرار ترکوں کو ملک بدر کرنے لگا اور کوئی بغاوت رونما ہوئی۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ عبدالحمید کے استبداد سے حریت کے شعلے بڑھگئے اور اس کی سختیوں نے جو اس نے دستور کے حامیوں پر کیں اس آگ پر تیل کا کام دیا چنانچہ جمعیتہ اتحاد و ترقی نے جس کے سرگرم ارکان نیازی بک۔ انور بک اور محمود شوکت پاشا جیسے لوگ تھے سنہ ۱۳۲۶ھ میں قوت کے ساتھ دستوری حکومت حاصل کر لی۔ اور اب جنگ عمومی کے بعد سے تو مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کو کامل جمہوری بنا دیا ہے۔

اسباب زوال

ترکوں کی جس طرح ترقی بتدریج ہوئی اسی طرح انکا تنزل بھی رفتہ رفتہ ہوا اور یہ "تلک الایام نداولہا بین الناس" کا فطرتی قانون ہے جو اٹل ہے خاصکر شخصی اور استبدادی حکومتوں کا زوال جن میں لازماً نقائص موجود رہتے ہیں۔ ہم اس جگہ مختصراً ترکوں کے اسباب زوال کو لکھتے ہیں

(۱) ترکی قوم ایک سپاہی اور شجاع قوم ہے۔ اس نے ملک داری میں ہمیشہ دماغی تدبر اور انتظامی ادارہ کی بہ نسبت اپنی بہادری اور شمشیر پر زیادہ اعتماد رکھا۔ اس وجہ سے اپنی مفتوحہ اقوام سے نہ خود زیادہ نفع اٹھا سکے نہ انکو زیادہ نفع پہنچا سکے۔ غیر قوموں کو چھوڑ کر خود مسلمان قومیں جو انکی حکومت میں آئیں انکی بھی جنسیت اور عصبیت کو یہ اپنے ساتھ موافق نہ کر سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود صحابہ کی کوششوں کے عراق اور مصر کے علاقوں کو فوج میں نہیں تقسیم ہونے دیا بلکہ براہ راست خلافت کا محکوم رکھا جس سے تھوڑے ہی دنوں میں ان مقامات کے باشندوں کی عصبیت فنا ہوگئی اور وہ اسلامی قوت کا جزو بن گئے مگر ترکوں نے مفتوحہ اقوام کے علاقے سپاہیوں میں بانٹ دئے۔ ان جاہل آقاؤں کے مظالم سے ان قوموں میں حکومت کی ہمدردی نہ پیدا ہوسکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں جس قدر ضعف آتا گیا اسی قدر ان میں اپنی جنسیت کا احساس اور آزادی کا خیال بڑھتا گیا۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں ۱۲۰۱ھ میں جب روس و آسٹریا نے دولت علیہ پر حملہ کیا اس وقت بلقان کے بہت سے اصلی باشندے جاکر ترکوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ جب لڑائی ختم ہوگئی تو واپس آگئے۔ جاگیرداروں نے بوجہ باغی ہونے کے ان پر سختیاں شروع کیں جس سے شورش برپا ہوگئی۔ باب عالی نے آخر میں عفو عام کا اعلان کرکے فوج کے ہاتھوں سے انکے علاقے نکال لئے۔ اس پر اکثاریہ نے بغاوت کردی۔ بازند اوغلی نے کوشش کرکے پھر وہ علاقے فوج کو دلوادئے۔ انہوں نے پھر وہی مظالم شروع کئے۔ اب اصل باشندے جو جنگ و پیکار سے واقف ہوچکے تھے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے اور مشہور سربی زعیم پترو فنتش کی قیادت میں حزب وطنی قائم کی اور سلسلہ وار جدوجہد کرنے لگے یہانتک کہ آخر میں استقلال حاصل کرکے رہے۔

(۲) بعض ترکی وزراء اور امراء کی خیانت۔ جنہوں نے نازک سے نازک موقعوں پر دشمنوں سے رشوتیں لیکر فتوحات کو شکستوں میں تبدیل کردیا۔ اور سلطنت کو عظیم الشان نقصانات

پہنچائے۔

دولت علیہ کا سب سے بڑا اور خطرناک دشمن روس تھا خاصکر اسکا شہنشاہ پیٹر اعظم جس نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا روس کے لائحہ عمل میں داخل کرلیا تھا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں جب اس نے عثمانی علاقہ پر چڑھائی کی اس وقت محمد پاشا صدر اعظم نے جو دو لاکھ فوج لیکر مقابلے کے لئے گیا تھا۔ دریائے بروت کے متصل اس کو معہ اس کی محبوبہ ملکہ کیتھرائن کے ایک قلعہ میں محصور کرلیا۔ اس موقع پر اگر دیانت اور صبر سے کام لیکر اس نے ان کو گرفتار کرلیا ہوتا تو ترکوں کی ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہوجاتا لیکن ملکہ مذکورہ نے اپنے زیورات اور جواہر اس کے پاس بھیجدئے جس کی وجہ سے اس نے محاصرہ اٹھالیا اور معاہدہ کرکے واپس آگیا۔

سلطان عبدالمجید خاں کے عہد میں جب محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترکوں کو نصیبین میں شکست دیدی جس سے خطرہ پیدا ہوگیا کہ وہ نہ صرف اناطولیہ بلکہ قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلے گا اس وقت احمد پاشا قبودان عام نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لیجاکر خدیو مذکور کے حوالے کردیا۔ اگر انگلستان اور فرانس بیچ میں نہ آپڑتے تو محمد علی قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کرلیتا اور ترکی سلطنت صفحۂ وجود سے مٹ جاتی

عبدالحمید ثانی کے عہد میں انگریز کوشش میں تھے کہ جزیرہ قبرص لے لیں لیکن سلطان کسی طرح تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں صفوت پاشا نے صدارت پر آتے ہی جزیرہ مذکور انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اور سلطان سے کہدیا کہ برلن کانفرنس میں یہ ہماری مدد کرینگے۔

یہ اور اس قسم کے واقعات ترکی تاریخ میں اور بھی ہیں۔ بعض مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ روس کی اکثر فتوحات دولت علیہ پر زر کی بدولت تھیں نہ کہ زور کی۔

(۳) دور انحطاط میں بجز چند سلاطین مراد رابع۔ سلیم ثالث۔ محمود ثانی یا عبدالحمید ثانی اور بجز چند وزرا جیسے خاندان کوپریلی وغیرہ کے عام طور پر عثمانی سلاطین۔ انکے وزراء۔ امراء اور ارکان دولت سیاست اور ملک داری میں نااہل تھے جو نہ خارجی تعلقات کو ٹھیک رکھ سکے

نہ داخلی انتظام کو جس کے باعث دن بدن فوجی اور اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی یہانتک کہ سلطنت عثمانیہ کو "مرد بیمار" کا خطاب دیا گیا جس کی ہلاکت میں بہت کم مدبرین کو شبہ تھا۔

دوسری طرف اس کے حریف یورپ نے دور جہالت و شقت سے نکلکر علم اور وحدت قومی کی طرف قدم بڑھایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر کے ترکوں کو پیہم شکستیں دینے لگا، یہانتک کہ انکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے باندھ لئے چنانچہ یکے بعد دیگرے انکے مقبوضات نکالنے بھی لگے جس کے باعث بجائے اس کے کہ سلیمان قانونی کے عہد میں کی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی اب گھٹکر ایک معمولی ریاست رہ گئی۔ ع

وہ بڑھ کے بدر ہوئے گھٹ کے ہم ہلال ہوئے

(۴) ترکوں اور بالخصوص انکے علماء میں تقلید اور قدامت پرستی زیادہ تھی اور حریت فکر اور وسعت نظر کمتر۔ اس وجہ سے اکثر انہوں نے جدید اصلاحات کی مخالفت کی اور مذہب کے نام سے مفید دنیاوی علوم و فنون کو روکا۔ سلیم ثالث نے ۱۲۱۰ھ میں جب جدید طرز کی فوجیں تیار کرنی شروع کیں اور خاصکوئی اور جزیرہ ہکبہ لی میں انکی تعلیم کے لئے حربی مدارس کھولے اسی وقت رجعت پسند جماعت نے قیامت برپا کردی: اور انہوں نے نہ صرف ان اصلاحات کے حامی وزراء کو قتل کیا بلکہ سلیم کو بھی تخت سے اتار کر چھین لیا کیونکہ طوپال عطاء اللہ آفندی شیخ الاسلام نے فتوی دیا تھا کہ مغربی فوجی لباس شریعت کے خلاف ہے۔

دوبارہ سلطان محمود نے جب پھر وہ اصلاحات شروع کیں اس وقت انکشاریہ پھر مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ مجبور ہو کر سلطان نے انکشاری فوج کو توڑ دینے کا فیصلہ کرلیا مگر اس میں کامیابی اس وقت ہوئی جب آتی میدان میں انکی چالیس ہزار لاشوں کے پشتے لگا دئے گئے۔

یورپ میں جابجا مطابع قائم ہو چکے تھے اور علوم و فنون کا سیلاب رواں تھا لیکن ترکی میں ایک مدت کے بعد احمد ثالث کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں پہلا مطبع قائم ہوسکا۔ اس پر بھی مفتی اعظم نے یہ قید لگا دی کہ قرآن کریم نہ چھاپا جائے کیونکہ موصوف کو تحریف کا خطرہ تھا۔

اسی جمود کا یہ رد عمل ہے کہ جمہوریہ ترکی نے اب ہر بات میں مغرب کی تقلید شروع کی ہے۔ یہاں تک کہ جملہ باشندوں کے لئے یورپین لباس کو بھی لازمی قرار دیا ہے ترکی زبان کو بھی حکماً لاطینی حروف میں منتقل کر دیا ہے اور مشرقیت سے اپنے رشتے توڑ رہے ہیں تاکہ وہ قدیم ذہنیت بدل جائے لیکن اصل چیز جس نے یورپ کو یورپ بنایا ہے وہ سائنس ہے جبتک اس کو قابو میں نہ لائیں گے ان تبدیلیوں سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔

بعض پرانے خیال کے مسلمان ترکوں کے مغربی تہذیب اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ اسلام ہی سے بیزار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام مغربی یا مشرقی تہذیبوں سے بالاتر ہے وہ کسی خاص ملکی یا مقامی طرز اور وضع میں محدود نہیں بلکہ اسکا تعلق قلب و عمل کے ساتھ ہے۔ اگر نوجوان ترکوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ وہ قرآن کریم کو جو اصل الاصول ہے مضبوط پکڑے ہوئے ہیں تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ انکا یہ زوال جس میں جمہوریت پیدا ہو گئی ہے ایک نئے دور اقبال کا فاتحہ ہو۔

ڈراما کیا چیز ہے؟

(گذشتہ سے پیوستہ)

(ب)

فرحیہ   جس ڈرامے میں واقعات کی عام رفتار اور قصہ کا انجام خوشگوار ہو یعنی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر فرحت و مسرت کا اثر ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ مگر جس طرح وہ المیے کی شان نہیں رکھتا بلکہ ایک کمتر درجے کی چیز ہے اور میلوڈراما (رقت آمیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ اسی طرح وہ کھیل جو محض تفریح اور دل لگی کا باعث ہوتا ہے فرحیے کے معیار سے پست ہوتا ہے اور فارس (نقل) کے نام سے موسوم ہے۔ فرحیے سے راحت و مسرت کے علاوہ دیکھنے والے کی طبیعت کو اطمینان اور آزادی کی ایک مستقل کیفیت محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہٹ جاتا ہے

عموماً اس کیفیت کا اظہار ہنسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس پر غور کریں کہ ہنسی عموماً کن چیزوں پر آتی ہے تو ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فرحیے کے کیا عناصر ہونا چاہئیں نفسیات کے ماہروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہنسی کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں کسی شخص کی خفت یا ذلت، اسکا بھونڈا پن یا بے تکا پن۔ اسکا شخصیت سے محروم اور بشیں نما ہونا۔ مثلاً جب کسی کا خصوصاً کسی خواہ مخواہ مرد آدمی کا پیر پھسلے اور وہ گرے تو ہمیں ہنسی ایک تو اس لئے آتی ہے کہ یہ اتفاق اس شخص کی خفت کا باعث ہے دوسرے اس لئے کہ گرتے وقت اور گرنے کے بعد اس کی قطع بے تکی ہو جاتی ہے۔ چہرے کی عجب بزرخ ہو جاتی ہے۔ منہ پھیل کر رہ جاتا ہے ٹانگیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ اس کی بے بسی دیکھ کر ایک لمحے کے لئے گویا ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حضرت اشرف المخلوقات ہیں۔ جن سے ہمیں ہمدردی کرنا

چاہئے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گوشت اور چربی کا ایک تودہ ہے جسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔
فرانسیسی فلسفی برگساں نے ہنسی کے محرکات کی تحلیل جو کی ہے وہ زیادہ مکمل ہے۔ وہ کہتا ہے ہنسی کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) اس کا موضوع شکل صورت وضع قطع یا طرز معاشرت میں سوسائٹی کے عام رنگ سے مختلف ہو (۲) جس حالت میں وہ پایا جائے اس میں اس کی شخصیت چھپ جائے اور وہ مشین یا کٹھ پتلی کی طرح معلوم ہو (۳) دیکھنے والے کو اس وقت اس کے انسانی جذبات کا احساس نہ ہو۔ مثلاً اوپر کی مثال میں موٹا ہونا سوسائٹی کی عام روش سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ پیر پھسل کر گرنے میں ہر شخص کٹھ پتلی کی طرح مجبور رہتا ہے اور پھر موٹے آدمی کی بے بسی کا تو کیا پوچھنا ہے، رہی تیسری شرط تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بیچارے الفربہ کے جذبات کا کسے احساس ہوتا ہے۔
لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک اور چیز ہنسی کی محرک ہوتی ہے جس کا برگساں نے ذکر نہیں کیا اور وہ تہذیب اور ثقاہت کے تکلفات سے آزادی کا احساس ہے مثلاً ایک مجمع میں جہاں سب مقطع اور ثقہ لوگ بیٹھے ہیں اور انسان وہاں بات کرنے بلکہ سانس لینے میں بھی تکلف محسوس کرتا ہے کوئی شخص کوئی موٹی سی گالی بک دے یا پھکڑ مذاق کر بیٹھے تو حالانکہ خوش مذاق لوگوں کے لئے گالی یا بیہودہ مذاق بجائے خود کوئی ہنسی کی چیز نہیں مگر ایسے موقع پر انہیں بے اختیار ہنسی آجائے گی۔
ہنسی کی اس نفسیاتی تحلیل کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظرافت میں وہ کیفیت جس پر ہنسی آتی ہے پانچ طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک تو کسی شخص کی بے تکی جسمانی صفات سے مثلاً ناک کا بڑا ہونا۔

(۲) اس کی انوکھی ذہنی اور روحانی صفات سے مثلاً بیچ بیچ کا مراق یا خبط، یا کسی معمولی صفت میں اس قدر مبالغہ جو مراق کی حد تک پہنچ جائے۔

(۳) اس کی نرالی عادتوں اور حرکتوں سے مثلاً کندھے اچکانا، منہ چڑانا۔

(۴) کسی مضحک حالت کے دکھانے سے۔

(۵) مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنے سے۔

فرحیہ نگار ان سب ترکیبوں سے کام لیتا ہے لیکن انکے استعمال میں تناسب کو مدنظر رکھتا ہے۔ جس ناٹک میں محض بے تکی جسمانی صفات یا نرالی عادتیں اور حرکتیں دکھائی جائیں وہ فرحیہ نہیں رہتا بلکہ نقل (فارس) بن جاتا ہے۔ فرحیے میں یہ چیزیں اسی حد تک کھپتی ہیں جہانتک یہ ذہنی اور روحانی بے آہنگی کی علامت ہوں۔ البتہ انوکھی ذہنی صفات کو نمایاں کرنا مضحک حالتوں کا پیدا کرنا، مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنا فرحیے کا اصل جوہر ہے۔

یہانتک ہم نے فرحیے کے عناصر مضمون کے لحاظ سے بیان کئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے طرز ادا کیا اختیار کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی خوش طبعی کا اظہار ان تین طرزوں میں سے کسی طرز سے کرتا ہے۔ مذاق یا دل لگی، ظرافت، طنز۔

مذاق یا دل لگی اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنی فطری شگفتہ طبعی سے ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈھے، خود ہنسے اور جس پر ہنسے اُسے بھی ہنسائے۔ اس کی بنیاد ہمدردی، یار باشی، کشادہ دلی پر ہوتی ہے۔ مذاق کرنیوالے کا مقصد کسی کو خفیف کرنا نہیں بلکہ سب کو خوش کرنا ہوتا ہے وہ جس طرح دوسروں پر چوٹ کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ پر بھی فقرے کستا ہے۔ اُس کی طبیعت میں یا اس کی باتوں میں کوئی خاص نفاست یا باریکی نہیں ہوتی لیکن وہ تناسب کا کسی قدر احساس رکھتا ہے، اُس کی نظر بے ڈول یا بے تکی چیز پر فوراً پڑتی ہے، وہ بیساختہ ہنس پڑتا ہے اور اس کے ہنسنے پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے مذاق کرنے والا اگر متانت اور خودداری سے بالکل خالی ہو اُس کی باتوں میں بازاری پن کی جھلک اور خوشامد یا مطلب براری کا پہلو ہو تو وہ مسخرا اور اسکا مذاق مسخراپن کہلاتا ہے۔

وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کی بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت

ستھرا پن پایا جاتا ہے اسے ظرافت کہتے ہیں۔

ظرافت کی بنیاد شوخ طبعی، نکتہ سنجی اور ذہنی رعونت پر ہوتی ہے۔ ظریف آدمی کا احساس تناسب اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا بے تکا پن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب وہ بیڈول چیزوں اور بے تکے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہمدردی کی جگہ ایک طرح کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دل لگی باز کی طرح کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مذاق نہیں کرتا بلکہ برتری کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو لئے دیئے ہوئے لطیف اشاروں اور کنایوں میں چوٹیں کرتا ہے اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اسکا مقصد کمتر ہنسنا اور زیادہ تر بیوقوفوں اور سادہ لوحوں کو بنانا اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

اگر ظرافت حد سے زیادہ تلخ اور ترش ہو جائے تو وہ طنز کے درجے پر پہنچ جاتی۔ طنز کرنیوالا عموماً اکل کھرا اور مردم بیزار ہوتا ہے۔ اس کی نظر حماقت اور بے تکے پن کے علاوہ اخلاقی کمزوریوں پر بھی ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اُسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ ان کی پردہ دری کر کے دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کی ہنسی زہر خند کی شان رکھتی ہے اور اس کی ظرافت غم اور غصے میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

ان میں سے فرحیے کا مخصوص طرز اداا نداق اور دل لگی ہے۔ ظرافت کا استعمال محدود ہے اس کی باریکی اور شوخی سے کام لیا جاتا ہے لیکن رعونت کا انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اکثر اعلیٰ درجے کے فرحیہ نگار مثلاً شیکسپیئر جن لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں اُنکی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک حد تک محبت رکھتے ہیں۔ شیکسپیئر کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی۔ اس کی پھبتیوں میں نیش نہیں ہوتا۔ اُس کے سب سے مشہور مضحک کیرکٹر فالسٹاف کی حماقت، لالچ، شیخی پر ہم جی کھول کے ہنستے ہیں لیکن جب وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے تو ہمیں اُس پر رحم آجاتا ہے۔ مولیر جو غالباً فرحیہ نگاری کا سب سے بڑا استاد ہے شیکسپیئر سے زیادہ سخت گیر ہے لیکن اس کا دل بھی رعونت اور تحقیر کے جذبات سے خالی ہے۔ وہ جن لوگوں کا خاکہ اڑاتا ہے انہیں اپنے سے کم درجے کا مخلوق نہیں بلکہ

اپنی طرح انسان سمجھتا ہے۔

بقیہ دو طرز یعنی مسخرا پن اور طنز فرحیے کے لئے مناسب نہیں۔ مسخرے پن پر ہنسی ضرور آتی ہے لیکن خوشی کی جو کیفیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے اس سے تھوڑی دیر دل بہلتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں میں کوئی مستقل سہولت حاصل نہیں ہوتی اس طرز کا محل استعمال نقل (فارس) ہے جو عوام میں بہت مقبول ہے لیکن خوش مذاق لوگوں کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

طنز کی گنجایش فرحیے میں اور بھی کم ہے۔ فرحیے کی سبک روی اس کی تلخی اور ترشی کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ طنز کی جان غم وغصہ اور نفرت کے جذبات ہیں جو مذاق کے ہلکے سے پردے میں چھپے ہوتے ہیں۔ تنقید اور تضحیک کے لئے یہ بہت اچھا آلہ ہے لیکن فرحیے میں جس کا اصل مقصد تفریح اور خوش وقتی ہے۔ اس کی آشفتہ نوائی سارے عیش کو تلخ کر دیتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہنسی زیادہ تر ان لوگوں پر آتی ہے جس میں شخصیت نہ ہو بلکہ جو کٹھ پتلی کی طرح کسی بیرونی قوت کے اشارے پر حرکت کرتے ہوں اس لئے فرحیے میں جس کا دارو مدار ہی اس پر ہے کہ ہر شخص کو مضحک حالت میں دکھایا جائے عموماً کوئی نمایاں شخصیت رکھنے والا کیرکٹر یعنی کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کیرکٹر کو خاص طور سے مضحک بنایا جائے تو اس کی شخصی حیثیت پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے کسی جماعت یا طبقے کی مثال (Type) کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولیر کے ڈراموں میں جہاں کہیں ایک طبیب یا ایک کنجوس آدمی کی خبر لی گئی ہے تو اس سے کوئی خاص شخص مراد نہیں بلکہ سارے طبیب اور سارے کنجوس آدمی۔ اکثر فرحیوں میں اصل قصے کے ساتھ ایک یا زیادہ ضمنی قصے بھی ہوتے ہیں جن کے اشخاص کی اہمیت قریب قریب مساوی ہوتی ہے۔ اس طرح فرحیے میں عمومیت کا رنگ جس کے لئے المیے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت پیدا کرنے کی اور ترکیبیں مثلاً مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر فرحیے میں کام نہیں دیتا کیونکہ ان سے خوف اور دہشت کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ فرحیے کی

نشار کے خلاف ہے۔

(۶)

ڈراما کی نشو و نما عہد قدیم سے عہد جدید تک | انسانی زندگی کی تمثیلیں ناٹک کے ذریعے دکھانے کی رسم اکثر قوموں میں قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے لیکن اسے ادبی اور شاعرانہ حیثیت پہلے پہل چینیوں یونانیوں، اور ہندوؤں نے دی۔ ان تینوں قوموں نے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر الگ الگ اس صنف شاعری کو ایجاد کیا یونانیوں میں اس رسم کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انکے یہاں ابتدا سے ڈایونی سیس[1] دیوتا کے پوجا کے سلسلے میں مذہبی روایات ناٹک کی شکل میں دکھائی جاتی تھیں۔ جب یونانی تمدن نے ترقی کی تو شعرا اس رسم کے لئے خاص ڈرامے تیار کرنے لگے عام دستور یہ تھا کہ اس موقع پر ایک فرحیہ اور تین المیے دکھائے جاتے تھے جو ڈراما نگار چوٹی کے سمجھے جاتے تھے اُنکے ڈرامے اس کام کے لئے منتخب ہوتے تھے یونانی زبان کے اکثر بہترین ڈرامے اسی تقریب سے لکھے گئے۔

یونانیوں میں ڈراما کے اصول و ضوابط سب سے پہلے ارسطو نے اپنی شعریات (poetics) میں مرتب کئے۔ ارسطو کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانیوں کے ذہن نے اپنی فطری تخلیقی رو میں علم و ادب اور فنون لطیفہ کے جو نمونے پیدا کئے تھے اُس نے اُنکا غور و فکر سے مطالعہ کیا اور اُنکے اہم عناصر دریافت کر کے علمی قوانین بنا دیئے تاکہ آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور بنے بنائے راستوں پر چل کر کم وقت میں زیادہ ترقی کر سکیں اس کے عہد میں باکمال شعرا صرف المیے لکھتے تھے۔ اچھے فرحیے یا تو اُس سے پہلے لکھے گئے یا

---

(۱) اس دیوتا کے متعلق ابتدا میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ سارے نباتات کے اُگنے اور بڑھنے کا کفیل ہے لیکن آگے چل کر اُسکا کام محض یہ سمجھا جانے لگا کہ انگور میں شراب پیدا کرے۔ اسی کو Bacchus کہتے ہیں۔

اُس کے بعد۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اپنی فطری سنجیدگی اور خشک مزاجی کی بدولت اُس نے اعلیٰ ڈراما صرف المیے کو قرار دیا اور فرحیے کو ادنیٰ درجے کی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے عہد میں اسٹیج بالکل ابتدائی حالت میں تھی، فنی (Technical) ذرائع بہت محدود تھے، پردوں کے بدلنے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس لئے اس نے یہ اصول قرار دیا کہ ہر ڈرامے میں صرف ایک قصہ ہو، ہر قصے کا محل وقوع ابتداء سے آخر تک ایک ہو اور زمانۂ وقوع جہاں تک ممکن مختصر رکھا جائے یہ سہ گونہ وحدت کا قانون کہلاتا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کا نظریہ یونانی حالات کا پابند تھا اور اُس نے جو اصول بنائے تھے وہ ہمیشہ کے لئے نہ تھے۔

مگر جب یونانیوں کے تمدن کا زوال ہوا اور انکی وراثت اہلِ روما کو ملی تو انھوں نے اپنی فطری تقلید پرستی کی بدولت فنونِ لطیفہ میں یونانیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو دوامی قانون سمجھا جس کی مخالفت اُن کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھی۔ ہورِیس نے ارسطو کے ضوابط کی تشریح کی اور انکی پابندی کو ہر ڈرامانگار کے لئے لازمی قرار دے دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے ڈراما کی آزاد نشو و نما رک گئی اور وہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی سختیوں کے سبب سے ڈراما کو اور تنزل ہوا۔ اس زمانے میں زندگی پر مذہب اور کلیسا کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے ڈراما بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ لوگ اپنے ذوقِ تمثیل کو مذہبی سوانگ سے پورا کرتے تھے جس میں مسیح کی ولادت اور شہادت اور اولیا کی زندگی کے سیدھے سادے قصے ہوتے تھے مگر اصولِ فن میں بدستور یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی۔ عہدِ جدید میں سب سے پہلے شکسپیر نے جو قدیم علوم سے تقریباً بالکل ناآشنا تھا اپنی فطری قوتِ تخلیق کی بدولت ڈراما کو فرسودہ قوانین کی پابندی سے آزاد کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مگر سولھویں صدی کے نقاد اب تک پرانے ضوابط کے قائل تھے اور شکسپیر کے ڈراموں کو بے اصول سمجھ کر رد کر دیتے تھے۔ جو لوگ اس بادشاہِ سخن کے فطری جوہر کے قائل تھے انھوں نے بھی اصولِ فن میں

کسی طرح کی تبدیلی گوارا نہیں کی ہاں اتنا کیا کہ شکسپیر کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ڈراما کی تنقید میں یہ قدامت پرستی اٹھارہویں صدی تک جاری رہی۔ البتہ سترھویں صدی میں ڈرائیڈن اور اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر جانسن نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ارسطو کے اصول بہت سی باتوں میں اس کے عہد کے حالات کے پابند تھے اور جب وہ حالات بدل گئے تو ان اصولوں کی پابندی بھی لازمی نہیں رہی۔ ان نقادوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شکسپیر کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اس کی قوت تخلیق نے فرسودہ ضوابط کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں رومانی تحریک کے بانی ہرڈر نے تو فن تنقید میں بالکل کایا پلٹ ہی کر دی۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر دور کی ایک مخصوص شاعرانہ روح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے خود راہ نکالتی ہے۔ اس کے خیال میں ادب اور شاعری کو دوامی قواعد و ضوابط کا پابند بنایا گویا انکی روح کو طوق و سلاسل میں جکڑ کر رکھنا ہے۔ رومانی دور کے ڈراما میں جو جدتیں پیدا کی گئیں انہیں دیکھ کر سولھویں اور سترھویں صدی کے نقاد آپے سے باہر ہو جاتے۔ سہ گونہ وحدت کا قانون بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔ ڈراما کے طول میں کسی طرح کی پابندی نہ رہی۔ المیہ کا موضوع بجائے بادشاہوں کی زندگی کے عوام کی زندگی بن گئی۔

شکسپیر کے عہد اور رومانی دور کے ڈراما میں قدیم یونانی رومی ڈراما یا قرون وسطےٰ کے فن تمثیل کے مقابلہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ محض قانون صورت اور اصول فن کے لحاظ سے نہ تھیں بلکہ عہد جدید میں شاعری کی اور اصناف کی طرح ڈراما کا بھی مزاج ہی بالکل بدل گیا۔ یہ تغیر اصل میں انسان کے نفسی انقلاب کا نتیجہ تھا۔ یونان کے سقراطی دور اور روما کے شاہنشاہی دور کا انسان ایک ایسے تمدن کا حامل تھا جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا تھا۔ اسکے خیالات میں پختگی تھی اور سادگی جو پختگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی پختگی اور یہی سادگی اُس زمانے کے فلسفے میں، آرٹ میں خصوصاً ڈراما میں پائی جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحی مذہب نے رومی اور المانی قوموں میں

پہنچ کر ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے ہم مغربی تمدن کہہ سکتے ہیں۔ صدیوں تک یہ تمدن بچپن کی حالت میں رہا۔ لوگوں کے دلوں پر بھولے پن، عقیدت، تقلید کا رنگ غالب تھا جس کا اثر اُس عہد کے طرز تعمیر، شاعری، ڈراما سبھی چیزوں پر پڑا۔ شیکسپیر کے زمانے میں اس تمدن نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہمعصروں کے جذبات میں تلاطم برپا تھا اُن کے تخیل میں ہیجان پیدا ہوگیا تھا کیونکہ اس کے نفس میں نئی قوتیں، امنگیں، آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں یا بہ قول افلاطون کے اُن کا مرغ روح پر پرواز پیدا کر رہا تھا۔ اس سیلاب تخیل، طوفان آرزو، جوش جوانی کو راہ پر لگانے کے لئے اٹھارہویں صدی کی نئی روشنی کی تحریک نے عقلیت کے پشتے تیار کئے لیکن یہ دریا ان کے روکے نہ رُکا، اٹھارہویں صدی کی شاعری اور ڈراما میں لیسنگ اور اُس کے ہمعصروں کی کوششوں سے کچھ دن تک پختگی، سنجیدگی، ضبط کا چلن رہا لیکن رومانی تحریک نے وضع احتیاط سے اکتا کر گریبان عقل کا چاک کر دیا اور جذبات پرستی کا دور دورہ ہوگیا۔ قلب انسانی کی گہرائی سے احساس اور تخیل کے چشمے ابل پڑے اور بحر زخار کی طرح پھیل گئے۔

مگر انسانی تمدن اور انسانی روح کو پھیلنے کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کو سمیٹے۔ جوانی کی شوریدہ سری اور مطلق العنانی، تھوڑے دن رہتی ہے پھر خود بخود یہ احساس ہوتا ہے کہ بس اب سنبھلنے کا وقت ہے۔ یہ صورت مغربی تمدن کو انیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آئی۔ رومانی دور کی جذبات پرستی نے تخیل کو بڑی وسعت دی تھی اور احساس کو بہت تیز کر دیا تھا لیکن بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ محض تخیل احساس اور جذبات کی بنا پر مکمل تمدنی زندگی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اہل نظر تنقید اور غور سے کام لینے لگے اور ایک بااصول اور مستحکم عقیدۂ زندگی تلاش کرنے لگے۔ اس جستجو کا پہلا علمبردار شاعری اور ڈراما میں جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ گوئٹے ابتدائی عمر میں رومانی شاعر تھا لیکن مدت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اُس کے عقائد بہت کچھ تبدیل ہوگئے اور وہ زندگی کا ایک برتر اور بہتر نصب العین تلاش کرنے لگا۔

لیکن گوئٹے انقلاب کا قائل نہیں تھا بلکہ ارتقا کو مانتا تھا۔ وہ تاریخ کے ہر دور کو تمدنی نشوونما کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا تھا اور کسی کڑی کو توڑنا اُسے گوارا نہ تھا۔ رومانی خیالات کا اس پر بڑا گہرا اثر تھا اور انکی خامیوں سے واقف ہوجانے کے بعد بھی اس نے انہیں بالکل رد نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ایک اہم عنصر کو اپنے فلسفۂ زندگی میں جذب کرلیا۔ اُس کے نزدیک رومانیوں کی جذبات پرستی، انفرادیت، بے اصولی، بے راہ روی سطحی اور عارضی چیز تھی لیکن انکی باطنیت بڑی گہری حقیقت پر مبنی تھی۔ اس باطنیت کو اس نے لے لیا لیکن یوں نہیں کہ حواس ظاہری اور عقل کو معطل کرکے نامعلوم قوتوں کے آگے سر جھکا دیتا بلکہ اس طرح کہ انسانی زندگی کو اس نے ایک مجازی چیز قرار دیا جو عقل و ادراک کے مرحلوں سے گذرتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر حقیقت کے آغوش میں چلی جاتی ہے اس کے آگے جو کچھ ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں اور نہ ہوسکتی ہے۔

مگر گوئٹے کے بعد انیسویں صدی کے نصف دوم میں یوروپ کی زندگی اور خیالات میں بڑا انقلاب ہوگیا۔ سائنس کی ترقی اور اُس کے استعمال سے صنعت کو بیحد فروغ ہوا۔ بڑے بڑے کارخانے کھل گئے۔ دیہات کی آبادی کھنچ کر شہروں میں آگئی۔ زندگی کی ضروریات بڑھ گئیں اور انکے پورا ہونے میں دقت ہونے لگی۔ کارخانے کے مزدور جب دفعۃً ایک نئی فضا میں آئے تو انکی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ان معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کے سبب سے لوگوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ نئے مادی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق، ہر چیز میں انقلاب کی ضرورت ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اس زمانے میں روزمرہ زندگی کے واقعات نے لوگوں کو اس قدر متوجہ کرلیا کہ زندگی کی حقیقت اور اُس کے آغاز و انجام پر غور کرنے کی فرصت نہیں رہی۔ اُدھر نظری فلسفے پر ثبوتیت کا رنگ چھا گیا۔ یعنی علم کا تنہا معیار تجربہ اور مشاہدہ قرار پایا اور تخیل وجدان اور باطنی احساسات ناقابل اعتبار سمجھ کر ترک کردئے گئے۔ ادھر عملی فلسفے میں افادیت دخیل ہوگئی، زندگی کا اعلیٰ مقصد حصول راحت ٹھہرا اور اُس کے حصول کا ذریعہ سائنس۔

عام خیال یہ تھا کہ زندگی کی تشکیل اور تہذیب کو مذہبی عقائد یا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے اسکا ایک صحیح علم مرتب کرنا چاہیئے۔ اس علم کا نام عمرانیات (Sociology) رکھا گیا اور یہ سارے علوم کا سرتاج سمجھا جانے لگا۔

اس انقلاب کا اثر ناول نویسی اور ڈراما پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان فنون کا اصل مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے ذوقِ جمال اور ذوقِ مشاہدہ کو پورا کریں۔ ان سے زندگی کی تنقید یا اصلاح کا کام اگر لیا جاتا تھا تو محض ضمنی طور پر۔ اب انکا سب سے بڑا فرض یہ قرار دیا گیا کہ فرسودہ اصولوں اور عقیدوں کی چیتھاڑ کریں اور زندگی کے نئے نصب العین پیش کریں۔ عمرانیات سئے جو مسئلے اس زمانے میں عام طور پر چھڑے ہوئے تھے مثلاً فرد کی جسمانی اور روحانی آزادی، عورتوں اور مردوں کی مساوات، مروجہ اخلاق کی تنقید وغیرہ وہی ناولوں اور ڈراموں کے بھی موضوع بن گئے۔

بے قید تخیل اور بے روک جذبات پر اب بڑی قدغن ہونے لگی۔ ایسی باتیں جن میں واقعیت کا رنگ نہ ہو بالکل ترک کر دی گئیں۔ مافوق الفطرت عناصر جیسے دیوتا، تقدیر، جن، پری، وغیرہ جن سے پہلے ڈراما میں بہت کام لیا جاتا تھا اب صرف بچوں کی کہانیوں تک محدود رہ گئے۔ ان سے جو تخیلی اثر پیدا ہوتا تھا وہ اب زندگی کی ظاہری قوتوں مثلاً وراثت، قوت حیات، اور نفسیاتی عناصر سے پیدا کیا جانے لگا۔ یوں بھی صنعتی ترقی نے اسٹیج پر ہر طرح کے مناظر دکھانے میں اتنی آسانی پیدا کر دی تھی کہ ڈراما کے زور اور اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔

یہ نئی روح ناروے کے ڈراما نگار ابسن کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس لئے وہی نئے ڈراما کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابسن یہ محسوس کرتا تھا کہ مغربی سماج کے اصول وقواعد اور اخلاق و رسوم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں ہے کہ نئے زمانے کیساتھ چل سکیں اور نئی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ لوگ محض قدامت پرستی کے سبب سے ان سے اجتک مانوس ہیں۔ اور وہ ان میں اتنی بصیرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پرانے خیالات اور

اور رسم و رواج کی کمزوریوں کو سمجھ لیں اور اتنی ہمت کہ ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں ۔ جب وہ اصلاح کے جوش میں اپنے عہد کے اصول اخلاق پر پے در پے حملے کرتا ہو تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اجتماعی اخلاق ہی کا قائل نہیں اور اس کے نزدیک فرد انسانی پر باہر سے یعنی مذہب یا تمدن کی طرف سے کسی طرح کی قیود عائد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُسے اُس کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ اُس کی جبلتیں اور صلاحیتیں آزادی سے نشو ونما پا سکیں ۔ لیکن اس کی تصانیف کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک نراجی نہیں ہے ۔ اس کا منشا اصل میں یہ ہے کہ اخلاقی اصول اور رسوم جو انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں مدد دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں اسی حد تک قابل عمل ہیں جب تک وہ زمانے کے حالات، فرد کے فطری رجحانات اور اس کی مخصوص ضرورتوں سے نہ ٹکرائیں ۔ جہاں یہ تصادم پیدا ہو تو جیتے جاگتے انسان کی راحت و عافیت کو مقدم سمجھنا چاہئے اور بیرنگ اور بیجان اصولوں کی پروا نہ کرنا چاہئے ۔ اگر یہ کشمکش اکثر پیدا ہونے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ اب ہمارا مروجہ اخلاق زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نظر ثانی کا محتاج ہے ۔

ابسن کا کمال یہ ہو کہ باوجود تنقیدی اور مصلحانہ طرز اختیار کرنے کے وہ آرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا ۔ اس کے اصلاحی جوش اور اُس کی انقلاب پسندانہ شورش نے اس کی شاعری کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کے کلام میں اور زیادہ زور اور اس کے انداز بیان میں اور زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا وہ اپنے عہد کی معاشرت کا نقاد ہے ، نئی سماجی تحریک کا علم بردار ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شاعر ہو اور اسکے یہاں رومانی رنگ صاف نظر آتا ہو ۔ آگے چل کر یہ رنگ ہلکا ہو گیا مگر پھیکا نہیں پڑنے پایا ۔ آغاز صدی کے رومانیوں میں اور ابسن میں بس اتنا فرق ہو کہ ان لوگوں کی نظر کو جذبات پرستی نے دھندلا کر دیا تھا اور انہیں انسانی زندگی گویا کہر میں چھپی ہوئی نظر آتی تھی مگر ابسن کو بس اتنا نشہ تھا کہ اس کا احساس تیز ہو گیا تھا اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ اس میں وہی قلبیت تھی اور وہی انفرادیت مگر تنقید اور تحلیل کے ساتھ سموئی ہوئی ۔ یہ تحلیل منطقی

تحلیل نہ تھی جو زندگی کے پھول کو بیجان سمجھ کر اس کی پتی پتی الگ کر کے دیکھتی ہو بلکہ نفسیاتی تحلیل جو اس کے اندر سما کر اس کے رنگ و بو، اس کی تازگی اور خوشنمائی کا جائزہ لیتی ہے اور اس کے خون دل اور چاک جگر کا بھید پاتی ہے۔

ابسن نے "دشمن مردم" میں فرد اور جماعت کے تعلقات سے بحث کی ہے۔ "گڑیا کا گھر" اور "سمندر کی خاتون" میں مرد اور عورت کے تعلقات پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن "بحث" اور یہ "تبصرہ" خشک علمی مذاکرے نہیں ہیں بلکہ ان میں آرٹ کی سبکدستی نے دلکشی اور دلربائی پیدا کر دی ہے۔ "دشمن مردم" جماعت کے خلاف۔ فرد کا نعرۂ جنگ، "سمندر کی خاتون" اور اس سے بھی بڑھ کر "گڑیا کا گھر" مرد کے مقابلے میں عورت کا اعلان آزادی ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں مناظرے کی درشتی اور تلخی شاعری کی نرمی اور حلاوت پر غالب نہیں آئی۔

آخری عمر میں ابسن کے شاعرانہ تخیل نے واقعیت نگاری میں استعاریت کا رنگ پیدا کر دیا اسکا عمدہ نمونہ اسکا مشہور ڈراما "ماہرین فن تعمیر" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک ذکی الطبع ماہر فن تعمیر سولینس کچھ خودغرضی اور کچھ رشک کے سبب سے اپنے نوجوان نائب راگنر کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر راگنر اس کی ملازمت ترک کر کے اپنا کاروبار الگ جاری کر دے گا تو اس کے گاہک ٹوٹ کر راگنر کی طرف چلے جائیں گے۔ اور اس میں اسکا بڑا نقصان ہے۔ علاوہ اس کے اُسے یہ گوارا نہیں کہ شباب کا بڑھتا ہوا زور بڑھاپے کی گھٹتی ہوئی قوت پر فتح پائے۔ اس لئے ایک طرف تو راگنر کے بنائے ہوئے نقشوں میں خواہ مخواہ عیب نکال کر اس کی ہمت کو پست کرتا ہے اور دوسری طرف راگنر کی منگیتر کے بھولے دل کو اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیتا ہے تاکہ نہ وہ خود اس کی نوکری چھوڑے اور نہ راگنر کو چھوڑنے دے مگر شباب ایک نوجوان سیلانی لڑکی ہلڈا کی شکل میں آتا ہے اور اس کے دل کو پر اسرار طریقے سے تسخیر کر لیتا ہے۔ ہلڈا اسے اس پر آمادہ کرتی ہے کہ اپنی بنائی ہوئی عمارت کے مینار پر جا کر ہار چڑھائے۔ سولینس لکڑی کے ڈھانچے پر جو معماروں نے مینار کے گرد کھڑا کر دیا ہے چڑھتا ہے۔ مگر آخری زینے پر پہنچ کر اس کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ

اس بلندی سے زمین پر گر کر مر جاتا ہے۔ اس طرح پیری کی شکست ہوتی ہے مگر بڑی شاندار شکست۔ ابسن کو اس ڈرامے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ موجودہ نسل کا آئندہ نسل کی اٹھان کو روکنا گویا قانون فطرت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کا انجام ناکامیابی ہے مگر یہ ناکامیابی پیری کے لئے باعث ذلت نہیں۔

اس ڈرامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما کے جدید دور میں رومانیت روح معدوم نہیں ہوئی بلکہ نئے روپ میں استعاریت (Symbolism) کی نام سے تخیل کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومانیت تو عجائب پسندی کی دھن میں واقعیت کے قوانین سے صریحی انحراف کرتی ہے، جذبات پرستی کے جوش میں اعتدال کے اصول کو کھلم کھلا توڑتی ہے مگر استعاریت عقل اور عادت کے پردے کو قائم رکھتی ہے اور اس کے پیچھے سے رموز و اسرار کی جھلک دکھلاتی ہے۔ یہ طرز بیان جو ابسن کے یہاں صرف آخری دور میں نظر آتا ہے۔ اسٹرنڈبرگ، میٹرلنک، روستان کے یہاں عام ہے آئرلینڈ کے ڈراما نگاروں خصوصاً ییٹس کی تمثیلوں میں یہ استعاریت اور گہری ہو کر باطنیت بن گئی ہے۔

روستان میٹرلنک اور ہاؤپٹمان کی بعض تمثیلوں اور خود ابسن کے نوجوانی کے ڈراموں میں رومانیت اپنی اصلی حالت میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ہیں جن سے شام مغرب کی سنجیدگی اور افسردگی کم نہیں ہوتی۔

زمانے کا عام رجحان، جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں، واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت کی تنقید کی طرف تھا۔ ڈرامے عموماً اس قسم کے موضوعوں پر لکھے جاتے تھے جیسے شادی اور اس کے بعد کی زندگی، طلاق کا مسئلہ، مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، عشق و محبت، عزت و وقار اور غیرت و حمیت کے موجودہ نصب العین کی تنقید، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش وغیرہ وغیرہ۔ خوف تھا کہ ان خشک اور سنجیدہ مسائل پر تنقیدی بحث کرنے سے ڈراما میں آرٹ کا عنصر کم ہو جائے گا لیکن اس دور کے تمثیل نگاروں کا کمال تھا کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں فن کی خوبی

اور دلکشی کو قائم رکھا۔ ابسن علاوہ اس کے ہمعصر اسٹرنڈبرگ، جرمنی کے ہاؤپٹمان اور زوڈرمان، آسٹریا کے اشنیتسلر، انگلستان کے گالسورتی کے قلم میں یہ جادو تھا کہ انہوں نے زندگی کی عکسی تصویریں میں بھی نقاشی کا لطف پیدا کر دیا۔

لیکن فرانس کے زولا اور بریو کی تصانیف کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعیت نگاری اور سماجی تنقید کو آرٹ بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ زولا کی فحش اور بیرنگ اور بریو کی خشک اور پھیکی تمثیلیں نہ صرف آرٹ سے خالی ہیں بلکہ شہوانی جذبات اور خبیث امراض کی بے حجابانہ نمائش سے ذوق سلیم کو اس قدر آزردہ کر دیتی ہیں کہ تنقیدی اور اصلاحی مقاصد میں بھی انکی کامیابی بہت محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ سماجی تنقید اور مصلحانہ تبلیغ کو کامیابی کے انتہائی درجے پر پہنچانے کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی اخلاقی خلوص اور جوش، سوز درد اور طنز و ظرافت انکی زولا اور بریو میں بہت کمی تھی۔ دوسرے ڈراما نگاروں میں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ چیزیں موجود تھیں مگر اسی حد تک کہ آرٹ کی سبک روی میں خلل نہ پڑے۔ اخلاقی مقاصد کے آگے آرٹ کی پروا نہ کرنا اور اس کے باوجود لوگوں کے قلوب کو تسخیر کر لینا صرف دو شخصوں کے حصے میں آیا جن میں ایک روس کا ناول نویس ٹالسٹائے تھا اور دوسرا انگلستان کا ڈراما نگار برنارڈ شا۔ ٹالسٹائے نے سوز و درد سے اور برنارڈ شا نے طنز و ظرافت سے یورپ کی ادبی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ ان دونوں کے فلسفۂ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ انکے اصلاحی جوش اور خلوص نے آرٹ کی خوشنما زنجیروں کو توڑ کر اور گلا کر اخلاقی تبلیغ کی تلواریں بنائیں جن کی چمک نے آرٹ کے قدردانوں کی نظروں میں چکاچوند ڈال دی۔ ٹالسٹائے کو ڈراما سے سروکار نہیں اس لیئے اسکا ذکر ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے مضمون کے تیسرے حصے کو برنارڈ شا کی زندگی اور اس کے ڈراما کی نشو و نما کے بیان کے لئے وقف کرتے ہیں۔

لندن اور پیرس وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات

رسالہ اُردو جلد ۹ حصہ (۳۴) میں مولنا باقر آگاہ کے متعلق ایک دلچسپ اور پر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مگر اس میں زیادہ تر ان کی لائف اور دیوان سے بحث کی گئی ہے۔ دیگر تصانیف کے متعلق پوری صراحت صحت کے ساتھ نہیں ہے۔ چونکہ مصنف مضمون کو ان کی تمام تصنیفات نہیں ملی ہیں اس لئے انکے متعلق فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اُس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ یورپ میں ان کی جو کتابیں ملی ہیں انکے لحاظ سے ایک سرسری نظر ان کے تصنیفات پر ڈالی جاتی ہے۔ میرا مقصد باقر آگاہ کی لائف بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ رسالہ اردو میں اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند امور کا بیان بطور تمہید ضروری ہے تاکہ ناظرین جامعہ باقر آگاہ کی شخصیت سے واقف ہو جائیں۔

آگاہ کا نام محمد باقر ہے انکے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے ان کے والد محمد مرتضیٰ ویلور (احاطہ مدراس) آئے اور اسی کو وطن بنالیا آگاہ کی پیدائش ۱۱۵۸ھ میں یہیں ہوئی۔ اس طرح آگاہ ویلوری ہیں مگر اپنی تصنیفات میں ویلور کے ساتھ ساتھ بیجاپور کی نسبت بھی ضرور دی ہے اس سے آگاہ کی وطنی محبت بیجاپور کے ساتھ (جو دکن کا گویا بغداد تھا) بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

آگاہ عربی فارسی اور اردو کے جیّد عالم اور بڑے پرگو شاعر تھے۔ نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں اشعار کہا کرتے۔ عربی اور فارسی میں آگاہ اور اردو میں باقر تخلص تھا۔ ان کی عربی قابلیت کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے۔ انھوں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی عربی تصنیف ”سبحۃ المرجان“ پر چار سو اعتراض کئے تھے۔

آگاہ کے علم و فن کی انکے زمانے میں بڑی قدر و منزلت ہوئی مدراس کے نواب محمد علی والا جاہ نے انکی اچھی توقیر کی۔

آگاہ نے ۷۶ سال کی عمر پائی بسنہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ مدراس میں دفن ہوئے

ان کی تصنیفات عربی فارسی اور اردو ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم کرنی دشوار ہے۔

تقریباً ۳۰۰۰ بتائی جاتی ہیں۔ اس میں سے ۱۶ اُردو ہیں جن کی فہرست ذیل میں دیجاتی ہے۔

(۱) ہشت بہشت (۲) فرائد در عقائد (۳) ریاض الجنان (۴) تحفۂ احباب (۵) محبوب القلوب (۶) تحفۃ النسار (۷) گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا (۸) روضۃ السلام (۹) خمسہ منجرہ (۱۰) مثنوی روپ سنگار (۱۱) ہدایت نامہ (۱۲) فرقہ ہائے اسلام (۱۳) معراج نامہ (۱۴) دیوان اردو (۱۵) ریاض السیر (۱۶) رسالہ عقائد۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اُردو تصنیفات کی تعداد ۱۴ ظاہر کی گئی ہے مگر نمبر ۲ جسے مضمون نگار نے تین کتابوں کا مجموعہ سمجھا ہے اصل میں ایک ہی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ نمبر ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۶ کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے۔

ان میں سے دس کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں آئندہ صفحات پر ان کے نام گنائے جاتے ہیں۔

(۱) "ہشت بہشت" یہ دراصل آٹھ رسالوں کا مجموعہ ہے جس کی تصنیف ۱۱۸۱ھ سے ۱۲۰۰ھ تک ہوئی ہے۔ ہر رسالہ کا نام علحدہ ہے اور ان میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف چند خصوصیتیں رکھتی ہے اول تو یہ کہ اس وقت تک دکھنی زبان میں اس قسم کی کتابیں تصنیف نہیں ہوئی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلے ایک کتاب شیدا حیدرآبادی کی تصنیف سے تھی مگر وہ چھوٹے چھوٹے قصوں سے مملو تھی۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی معتبر کتابوں سے مواد

حاصل کیا گیا ہے ۔ تیسرے یہ کہ اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں لکھی گئی تھی عربی اور فارسی یا سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ کا زیادہ استعمال نہیں کیا گیا ہے ۔ یہ آٹھوں رسالے آٹھ مختلف بحروں میں ہیں ۔ ان رسالوں کے نام اور ان کے مضمون کے متعلق خود مصنف کا کلام ملاحظہ ہو :۔

ذکر اُس کے ہے نور کا درا دل — من دیپک اُسے لقب ہے اجل
دوسری میں ہیں اسکی سب بشارات — ہر من ہرن نام اس کا خوشدہات
تسری میں لکھا ہوں اُسکا مولود — ہے من موہن نام اس کا مسعود
چوتھی میں زہشت سال اے جان — سرور کی وفات لک ہے بیان
پنجم میں بیان کیا ہوں خوشدہات — اخلاق و شمائل اور عادات
چھٹی میں خصائص اس کے اکثر — بولا ہوں مفصل اے برادر
ہفتم میں معجزات سالار — تفصیل سے لکھا ہوں اے یار
لکھتا ہوں بفضل و رحمت رب — آداب محبت اس کی کچھ اب
ہور اُس کی درود کے فضائل — کرا نکوں توں نقش صفحہ اول
ہور اس کی فضائل زیارت — نین جس کی شرف کوں حد و غایت
دکھنی میں کہا ہوں اس لئے میں — تا ہووے سمجھ عوام گیت میں
تا سر بسر امیاں ہور عورات — پڑنی ستی اسکی پادین لذات
گرچہ یہ کتب ہیں دکھنی یک یک — اخبار کے ترجمے ہیں بیشک
جو کچھ یہ کتب بنی ہیں مذکور — ہے ترجمہ حدیث اے سور
اس فن میں جو معتبر کتب ہیں — بلکہ وہ سیر کی بیچ اب ہیں
اُن سب کا خلاصہ لیا ہوں — ان نسخوں میں درج اسے کیا ہوں
دیباچے میں ان کتب کی تفصیل — نا دنکی کروں گا ان کی تفصیل

من جیوں آسی ہی نام دل خواہ
ہو اُس سے حیات ہر دل آگاہ

(مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر ۵۶۶۷ ورق ۲۳۴ ب)

ہشت بہشت کا ایک نسخہ برٹش میوزیم[1] میں ہے اور ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں۔

پیرس کے نسخہ کو یہ خصوصیت حاصل ہو کہ کاتب کے لکھنے کے بعد مصنف نے اُس پر نظر ثانی کی ہو اور کئی اشعار کا اضافہ، ترمیم اور اصلاح وغیرہ کی ہے۔

اول الذکر کی تاریخ کتابت ۱۴ رجب ۱۲۷۶ھ ہو آخر الذکر کی تاریخ درج نہیں ہو صرف کاتب کا نام اور مقام کتابت تحریر ہے:۔

"ازدست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والاجاہ"

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ نسخہ شاہی محل میں لکھا گیا ہو۔ دونوں کتابوں میں چند صفحات کا نثر میں دیباچہ بھی ہو۔ جس میں ان کتابوں کی صراحت کی گئی ہے جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہو۔

یہ کتاب مدراس اور بمبئی میں متعدد مرتبہ طبع ہوئی ہے اور ایک زمانہ دراز تک لوگ اس کے خواہشمند رہے جب بدرالدولہ نے آنحضرت کی سیرت "فوائد بدریہ" اردو نثر میں مرتب فرمائی تو بلحاظ زبان کی تدریجی ترمیم اور اصلاح کے اس کتاب کا رواج نہ رہا۔

بہرحال آگاہ کی یہ تصنیف خاص حیثیت رکھتی ہے جس پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

---

(۱) برٹش میوزیم کا نمبر 6.4.6673 ہو

(۲) کتب خانہ پیرس کا نمبر (Indien 872)

(۲) ریاض الجنان۔ اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر 6765.5 پر اور ایک نسخہ پیرس میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔

یہ مثنوی ہی جو اہل بیت کے فضائل میں لکھی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۲۰٦ھ میں ہوئی ہے اس کے دیباچہ سے کئی ایک امور پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس سے کسی قدر انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دیباچہ میں حمد و نعت اور ان کتابوں کی تفصیل کے بعد جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہی لکھتے ہیں :۔

"بعضے علما اُن مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی پس تصنیف ہونا اُسکا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر یہ کہ ولی ایلوری و شیدائے حیدر آباد دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھتے ہیں اُن کا نام روضہ الشہدا اور روضہ الاطہار مناقب عترت اخیار کے اُن دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں واقعات شہادت کے کچھ تفصیل کئے ہیں اور اکثر بیان دونو کا غلط اور بے اصل ہے جیسا انتقام چہنا عکاشہ کا آنحضرت صلعم سے ۔ ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ ۔ اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انکاری کیتئیں شیوہ اپنا کیا کر کر تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائی سو لکھ گئے اس جہت سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں جیسا حبیب السیر اور روضۃ الصفا اور روضۃ الشہدا بخلاف ثقات حدیث کے کہ تصانیف انکی غایت تحقیق سے موزوں اور نہایت تدقیق سے مشحون ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"۔ ۔ ۔ ۔ اور بوج اے بھائی کہ یہ عاصی پندرہ دیں سال سے شعر کے ساتھ الفت اور ارتباط رکھتا ہے اگرچہ شعر کم کہتا تھا ایسی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا

تھا جب سنہ ۱۱۸۴ اور ۱۱۸۵ھ میں بعضے رسائل ہشت بہشت کی منظوم کیا لفظ باقر کا جز نام ہے بجائے تخلص رکھا من بعد ۱۱۹۴ھ وقت نظم کرنے دیوان عربی کے تخلص اپنا آگاہ مقـــرر کیا اس تخلص کو عربی فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختیوں میں بھی اُسی تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل ہشت بہشت میں کہ بیچ سنہ ؟ کے منظوم ہوئی اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے در ۱۲۰۶ھ کی منظوم ہوے اور اس رسالہ میں کہ ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی باقر رکھا ہے کیا واسطے کے رسائل اول کے جا بجا مشہور ہوئی تھی اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص ہوتے اس واسطے وہی تخلص باقی رکھا اب مثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہی"

اس صراحت سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں :۔

(۱) مناقب کے متعلق کوئی مستقل کتاب فارسی میں نہیں تھی آگاہ نے اس مضمون کو اُردو میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

(۲) ولی ویلوری اور شیدائے حیدرآبادی نے دو کتابیں شہادت امام حسین میں مرتب کی تھیں مگر وہ صداقت سے دور غلط واقعات پر مبنی تھیں۔

(۳) اس وقت کی جتنی کتابیں سیر وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ بھی اسی طرح غلطیوں سے خالی نہیں تھیں۔

(۴) آگاہ نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔

(۵) ۱۱۸۴ھ میں جبکہ ہشت بہشت کے چند رسالے مرتب ہوتے اپنا تخلص باقــر قرار دیا۔

(۶) ۱۱۹۴ھ میں عربی دیوان مرتب ہوا جس میں آگاہ تخلص رکھا گیا۔

(۷) اسی زمانے میں فارسی کلام میں اسی تخلص کو اختـــیار کیا گیا۔

(۸) آگاہ نے مراثی اور اردو غزلیں بھی کہیں جن میں آگاہ تخلص ہے۔

(۹) محبوب القلوب اور ریاض الجنان ۱۲۰۶ھ میں مرتب ہوئے جس میں باقر تخلص ہے

---

(۳) "محبوب القلوب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۷۶۵ء پر موجود ہے یہ ایک مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۰۰۰ شعر ہیں۔ اسمیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں چھ ورق نثر میں دیباچہ بھی درج ہے۔ اس کے سنہ تصنیف کے متعلق رسالہ اردو میں حسب ذیل شرح کی گئی ہے:۔

"اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطہ سے ۱۱۳۰ھ معلوم ہوتا ہے لیکن ریاض الجنان کے دیباچے میں ۱۲۰۰ھ لکھا ہوا ہے جو درحقیقت ایکہزار ایک سوتائیس ہے اگر یہ آخری تاریخ صحیح ہو اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۳ کے ۲ نہ لکھ دیا گیا ہو تو غالباً یہ ۱۱۲۷ھ میں شروع ہوا ہوگا اور دس سال بعد ختم ہوا"

صاحب مضمون سے اس میں سہو ہوئی ہے کیونکہ ۱۱۲۷ھ یا ۱۱۳۷ھ کوئی بھی صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ اس زمانے میں آگاہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ خود اسی مضمون میں انکی پیدائش کو ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۸۲ سطر ۵) ریاض الجنان کے دیباچے سے صاف طور پر ۱۲۰۶ھ ظاہر ہوتا ہے اس کی تصنیف اسی سنہ کو قرار دینا چاہئے۔ علاوہ ازیں مصنف نے ۱۱۸۳ھ سے اپنی تصنیفات آغاز کی ہیں۔ اس لئے ۱۱۲۷ھ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا اور ۱۲۲۷ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔

(۴) "تحفہ احباب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۷۶۵۴ پر موجود ہے یہ بھی مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۵۰۰ شعر ہیں۔ اس میں اصحاب کی فضیلت اور مناقب بیان کئے گئے ہیں کتاب میں چھ باب ہیں اور ہر باب میں کئی کئی فصلیں۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ برٹش میوزیم والا مخطوطہ ۱۶ محرم ۱۲۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب عبدالواحد ہے۔ اس مثنوی کے ابتدا میں

بھی ایک دیباچہ نثر میں لکھا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علما دکھنی زبان کو زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اے بھائی اکثر بلکہ سب دکھنی کتاباں بنانے والے بیان میں ایسی بہت غلط کئے ہیں کہ اس زبان کو بے اعتبار کردئے اس لئے علما اُن کتابوں طرف التفات نہیں کرتے آج لگ کوئی کتاب دکھنی صحیح ومعتبر میری نظر میں آئی نہیں۔ بعضے اُن سے سرتاپا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ ہے اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا اشد حرام ہے اس بات پر سب علما کا اجتماع ہے شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل بہت صحیح ومعتبر و نہایت مضبوط ومدلل ہیں کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور نہیں کہ اُس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے۔"

(۵) "تحفۃ النسا" اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔ یہ بھی مثنوی ہے جس میں ۸۰۰ شعر ہیں اور اُسکی تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے ان دونوں امور کو خود مصنف نے بیان کیا ہے :۔

ہیں اٹھ سو اُس کے جیسے ابیات — پڑھنے میں ہوا کمی بہوت برکات
گیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد — ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ یاد

(ص ۱۴۵ ب)

اس کتاب میں اول تو حمد ونعت ہے اس کے بعد اپنے مرشد ابوالحسن کی مدح کرتے ہیں :۔

اس ملک منی تھا پیر میرا — ہر کام میں دستگیر میرا
تھا نام شریف ابوالحسن جس — اس خلق حسین ہوا حسن جس
اس دور کا ہو جنید آیا — الحاد کی حرف کون مٹایا

وصف اسکا ہے بے شمار باقر　　بیان مدح کوں اسکی کر کوئی آخر

(ص ۲۲۸)

اس مثنوی میں ازداج مطہرات اور دیگر خواتین کی فضیلت بیان کی گئی ہے مثنوی کے مضمون کو خود بیان کر دیا ہے :-

امت میں نبی کی جو ہیں عورات　　افضل ہیں سب عورتاں سوں بات

لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر　　احوال نار کا اسے برادر

اس شاہ کی دختران کا احوال　　اس شاہ کی عورتاں کا احوال

امت میں جو عورتاں تھے کامل　　تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

(ص ۲۲۸ ب)

سب سے پہلے فاطمہ زہرا کی فضیلت ہے اس کے بعد دیگر صاحبزادیوں پھر ازداج اور اس کے بعد رابعہ بصری وغیرہ دیگر خواتین کا بیان ہے -

یہ مثنوی مصنف کے ابتدائی زمانے کی تالیف ہے کیونکہ انہوں نے اس قسم کے کام کی ابتدا ۱۰۸۴ھ میں کی ہے اور یہ تصنیف ۱۰۸۵ھ میں ہوئی ہے -

(۶) "رسالہ فرقہ ہائے اسلام" یہ بھی پیرس میں موجود ہے نمبر ۷۰۲ - اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۳۲۵ ہیں اس میں صرف فرقہ ہائے اسلام کا ذکر نہیں ہے بلکہ عقائد مثلاً اسما صفات رویت حسن و قبیح عفو - ایمان - توبہ فاسق وغیرہ کا بیان بھی ہوا ہے -

پہلا شعر حسب ذیل ہے -

خدا کوں سزا وار حمد و ثنا　　کہ ہے گا مبرا ز نقص و فنا

آخر پر لکھتے ہیں :-

نہ تھا شان میرے کا یہ مقتضا　　کہ ہندی زباں کا کرے اصطفا

ولے بعض یاروں کا ایماء ہوا　　سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

اس امر کا خیال رہے کہ مصنف نے اکثر جگہ اردو کے بجائے ہندی کا استعمال کیا ہے اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ آج کل کی "ہندی" ہی، نہیں بلکہ جنوبی ہند میں عام طور سے زمانہ حال تک اردو کو ہندی ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ باقر آگاہ کے بعد قاضی بدرالدولہ کی اردو تصنیفات میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

(۷) "ہدایت نامہ" یہ بھی پیرس میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۲۵۰ ہیں اور اس میں گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلا شعر :۔

کروں آغاز حمد حق سوں اول　　　کہ تا نامہ ہووے یگی مکمل

کتاب کا نام بھی اشعار میں بیان ہوا ہے :۔

ہدایت نامہ یو پورا کیا میں　　　ہدایت خلق کوں پورا دیا میں

الٰہی یو ہدایت نامہ میرا　　　حقیقت میں سخن یو سب ہے تیرا

(ص ۱۰۴۳۰)

(۸) "معراج نامہ" پیرس میں ہی نمبر وہی ۸۰۲ اشعار کی تعداد ۱۵۹۵ ہے قدیم دکھنی شعرا کی مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد ضرور معراج کا عنوان قائم کیا جاتا تھا جس میں آنحضرت کے معراج کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ بعض شاعروں نے معراج کے متعلق علیحدہ مستقل تصنیفیں کی ہیں جن کے منجملہ یہ بھی ایک ہے۔ پہلا شعر حسب ذیل ہے :۔

سرانا خدا کوں سزاوار ہے　　　ہر ایک ذرہ اس کا نمودار ہے

خاتمہ :۔

کیا ختم میں ذکر معراج کا　　　بنام محمد نبی مصطفٰے

کیا ختم میں لے محمد کا نام　　　علیہ الصلوٰۃ و علیہ السلام

کتاب کے آخر میں کاتب کا نام اور اشعار کے تعداد کی صراحت ہے :-
"جملہ ابیات ایں کتاب یکہزار پانصد چہل وپنج است از دست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والا جاہ"

(۹) "رسالہ عقائد" پیرس کے ۸۷۲ نمبر پر موجود ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے۔ اس مثنوی میں جیساکہ نام سے ظاہر ہے عقائد کا ذکر ہے جس کو خود مصنف نے بیان کردیا ہے :-

کیا میں اس لئے یہ نسخہ منظوم	کرتا ہر کس کوں ہووے جلدی سوں مفہوم
کیا ہوں میں بیان اس نظم اندر	عقائد اہل سنت کا سراسر
کہا نہیں میں کبھی دکھنی میں اشعار	منجے ہے شعر کہنے سوں بہت عار
ولی یو نظم بولیا بالضرورت	پڑی تا اس کو ہرا می و عورت

(ص ۲ ۲)

غالباً یہ بھی ابتدائی زمانے کی تصنیف ہے۔ سنہ تصنیف معلوم نہ ہوسکا۔

(۱۰) "مثنوی گلزار عشق (عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا) یہ مصنف کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔ رسالہ اردو والے مضمون میں صراحت اس کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کو تین علٰحدہ کتابوں سے موسوم کیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تینوں نام ایک ہی مثنوی کے ہیں۔
اسکا ایک نسخہ آکسفورڈ کے بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ کٹلاگ میں اسکے متعلق حسب ذیل صراحت ہے۔

(۲۷۶۶۷) ایک مثنوی جو عشقیہ داستان رضوان شاہ و روح افزا ہے۔ مصنف مولوی محمد باقر جنہوں نے اس کو ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں لکھا ہے۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہے گارساں دوتاسی کی فہرست میں یہ شریک ہے اور کسی نے نہیں بیان کیا۔ ورق ۱۲۰۔ سطر ۱۱ تا ۱۷ سائز ۱۰×۶ ۱/۲"
کتاب میں سب سے پہلے ۱۴ صفحے کا نثر میں دیباچہ ہے جو اپنے بیان کے لحاظ سے قابل قدر

ہے جس کی صراحت آگے آئے گی ۔

مثنوی میں اول حمد ہے جس کے ۵۳ شعر ہیں اس کے بعد مناجات میں ۵۴ شعر۔ پھر نعت میں ۲۹ شعر۔ اس کے بعد معراج کے بیان میں ۸۹ شعر اس میں منقبت بھی ہے پھر "عرض حال از رسول" کا عنوان آتا ہے جس میں ۱۰۲ شعر درج ہیں اس کے بعد محبوب سبحانی کی مدح میں ۹۰ شعر۔ امام حسین کی مدح میں ۳۳ شعر سبب تالیف کتاب اور اپنی ستایش میں ۱۹۲ شعر۔ اس کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے جس کے تقریباً ۲۸۹۰ شعر ہیں قصہ کے ختم ہونے کے بعد خاتمہ کا عنوان ہے جس میں ۵۹ شعر ہیں اس طرح کل مثنوی تقریباً ۳۵۸۱ شعر پر ختم ہوتی ہے ۔

یہ مصنف کے آخری زمانے کی تصنیف ہے جو ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور انکا انتقال ۱۲۱۲ھ میں ہوا ہے ۔

مصنف کٹلاگ کو اس کے سنہ کے متعلق کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے خود مصنف نے صاف طور پر عبارت کی تشریح کر دی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں ۔

" الحال کہ تاریخ ہجرت با جاہ و جلال کے یک ہزار دو سو پر گیارہواں سال ہے قصہ عنوان شاہ و روح افزا کا پسند کر کے اُسے نظم کیا "

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص حیثیت رکھتا ہے جس میں پہلے حسب رواج حمد و نعت وغیرہ کے بعد اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ زبان کو خدا نے اپنی قدرت کی بڑی علامت قرار دی ہے اس کے بعد نصرتی کی تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے شعرا عادل شاہی وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی بتائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

" مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلانِ معنی اور ہرزہ درایاں لایعنی زبان دکنی پر اعتراض اور گلشن عشق ۔ وعلی نامہ کے پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب ملک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان انکی درمیان

اُنکے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی، فراقی
شوقی، خوشنود، غواصی، ذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہم
کے بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و قطعات نظم کئے
اور دادِ سخنوری کا دئے لیکن نصرتی ملک الشعرا تنگ نظری سے مبرا ہے۔

جب شاہانِ ہند اس گلزارِ جنت نظیر کو تسخیر کئے طرز و روزمرہ دکھنی تبع
محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم
آنے لگی اور ہندوستان مدت لک زبان ہندی کہ اُسے برج بھاکا بولتے ہیں
رواج رکھتی تھی اگرچہ لغت سنسکرت اُنکی اصل اصول اور مخرج فنون فروع و اصول
ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب
خاص کو اُس کی کھونے لگے۔ سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمیٰ
ہوئی۔ جب ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں باقی طرز جدید کے ہوئے ہیں۔

ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور اُستاد ہے بعد اُس کے
جو سخن سنجان ہند پر روز کئے (؟) بے شبہ اس تبع کو اُس سے لئے اور من بعد
اس کو با سلوب خاص مخصوص کر دئے اور اُسے اردو کے بھاکے سے موسوم کئے
اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کے جب شاہجہاں آباد و لکھنؤ و اکبرآباد وغیرہ
رواج پایا اور جون چاہی سبھوں کی من بھایا۔

اواخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن میں اکثر مشاہیر شعرا عرصہ میں
آئی اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد۔ مظہر۔ فغاں۔ دردمند
یقین۔ سوزاں۔ ابر۔ آرزو۔ سودا۔ تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی
مثنوی مستعد (؟) بھی نہیں کیا فقط غزلیات و قصائد و قطعات پر اکتفا کیا۔ بارے
اس عصر میں حسن دہلوی ایک مثنوی مختصر لکھا دریافت اس کی میر مصنف پر موقوف

رکھنا اول ہے۔ برخلاف شعراء دکن کے کہ اکثر مثنویاں کہیے ہیں۔ بالاتفاق غزل بولنا آسان ہے اور مثنوی کا کہنا دشوار وگراں ہے اس نے ملک شعراء دکن بطور تعریض کہتا ہے ؎

دس پانچ بتیاں کہ لئے شوقی اگر تو کیا ہوا　　　معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بتا ز ؟ کا

اس کے بعد وہ شعرا کے اقسام بتاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :۔

" اور بوج اسے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعضے فقط شاعر ہیں اور بعضے شاعر کے سات چاشنی عشق ۔ عرفان میں بھی ماہر ہیں مثلاً مولنا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص و قاضی محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جانجاناں و خواجہ میر درد شعراء ہند سے بعد ازیں مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا اعتبار نمایاں پایا "

اس بیان کے بعد سودا اور نصرتی سے بحث کی ہے اور انکا مقابلہ کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

" بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ اُس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں اور واعجبا یا واحسرتا ملک شعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اُس کے سحر حلال کی نہیں جانتے بڑی دستاویز انکی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے۔ زہی دریافت و خوشا سخن فہمی و عجب سمجھ آیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب و عجم و ہند کے معنی جان سخن آبدار اور لباس مستعار ہے . . . . "

اس کے بعد گلشن عشق سے نصرتی کا کچھ کلام درج کر کے لکھتے ہیں :

" تعصب کو یک طرف رکھ کر سب کلیات سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا اندازہ

سے اُس کی اور اس کی بواقعی واقف ہوے۔ سودا کو چھوڑ دے جس شاعر فارسی
گو سے چاہے خواہ قصائد میں خواہ مثنوی میں اُسے موازنہ میں لا دے بالفعل
بھی مہر و ماہ یکتائی فن طرازی عاقل خان رازی کتیں قصہ مہر و مد مالتی کا گلشن
عشق سے مواجہہ کر دیکھے تا معنی مثل دکھنی کے ہات کنگن کو آرسی کیا درکار خوب
سمجھے سو

کبھی نصرتی سن کے یہ دلولہ — ملا بعد مدت کے مجکو صلہ
کہا سودا کتیں انصاف سے — کہ صدقے کرو مجکو آگاہ کے"

بیان بالا سے یہ بھی واضح ہوتا ہے آگاہ گلشن عشق کو مہر و ماہ کا ترجمہ نہیں خیال کرتے
یہی رائے میں نے اپنے ایک جداگانہ مضمون میں دی ہے۔ میرے بیان کی آگاہ کے
قول سے تائید ہوتی ہے حالانکہ میں آگاہ کے اس بیان سے اس وقت لاعلم تھا۔
نصرتی کو سودا سے فوقیت دینے کے بعد وہ سودا کے کمال کے بھی انصاف کیساتھ
معترف ہیں چنانچہ کہتے ہیں:۔

"باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و
غزل میں بڑا سخن تراش و صاحب تلاش ہے محاورہ شستہ و صاف ہیں یگانہ
زمانہ اور شوق فراج و رنگینی طبیعت میں یکہیں افسانہ پر افسوس کہ ہجو ہائے
رکیک سے آشنا نہ (؟) اور راز ندین (؟) و تمکین سے بیگانہ تھا"

اس کی صراحت کے بعد وہ اس امر کو بیان کرنے میں کہ گلشن عشق اور علی نامہ کو
دیکھکر کسی مثنوی کے لکھنے کا شوق ہوا اور اس مثنوی کی ابتدا کی مگر چہ سو اشعار کے بعد
دیگر تصنیفات میں مشغول ہوگئے۔ اس کے بعد اپنی کتابوں کی تفصیل دی ہے جن کا ذکر صفحات
بالا میں ہو چکا ہے۔ اس دیباچہ میں بھی اپنے تخلص کی صراحت کی ہے ان امور کے بعد بتایا ہے
کہ اس مثنوی کو دکھنی زبان کے بجائے شمالی ہند کی اردو میں لکھا گیا ہے اور پھر اس کی وجہ بتائی

ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"ابیات ان بیہوں کے تخمیناً چوبیس ہزار ہیں اس لئے تکمیل قصہ عشق کی نہیں ہوئی
الحال کہ تاریخ ہجرت با جاہ وجلال کے یکہزار دوسو گیارہ رواں سال ہے قصہ قصول
شاہ وروح افزا کا پسند کر کے اُسے نظم کیا۔ جب زبان قدیم دکھنی اس سبب سے کہ
آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے اُسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و
شستہ کو کہ قریب روزمرہ اردو کی ہے اختیار کیا صرف اس بہا کے میں کہنے سے
دو چیز مانع ہوے اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اس میں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد
پدری و مادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں دوسرے یہ کہ
بعضی اوضاع اس محاورہ کے میرے دل میں بھاتے نہیں ازاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث
فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے اور اگر
مونث ہے تو مونث یہ قاعدہ موافق قاعدہ عربی کے ہے کہ سید السنہ ہے اور قیاس صحیح بھی اس
کی تائید کرتا ہے برخلاف محاورہ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف
کر مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں"

اس وضاحت سے امید ہے کہ دیباچہ گلزار کی حقیقت ظاہر ہو جائے۔ اب میں اصل مثنوی کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

قبل ازیں اس کی صراحت ہو چکی ہے کہ مثنوی میں عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور اس کے تحت بیان ہوا ہے۔ مگر عنوانات بھی گلشن عشق کی تقلید میں شعر میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً مناجات کا عنوان :-

غنچہ دل کی عرض حیرانی ۔۔۔۔ در حضور نسیم رحمانی

معراج کا عنوان ہے :-

ذکر معراج صاحب لولاک ۔۔۔۔ پائیں جس کے سپر کی تیئیں افلاک

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کا عنوان :۔

وصف محبوب بارگاہ قدم سر افسراد پر ہے جس کا قدم

اپنی تعریف کا عنوان :۔

فخریہ کا ہے اس میں کچھ انداز اور تصنیف کے سبب کا راز

اس میں کوئی شک نہیں شعرا خود ستائش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی اُن سے ایک حد تک انکے کلام پر روشنی پڑتی ہے ۔ آگاہ اول اپنے عربی نظم و نثر کا فخر اس طرح کرتے ہیں :۔

میری نظم دلکش کو وہ فیض ہے کہ اُس سے ہوا نام طائی کا طے
ابوطیب اس خوف و ہیبت ستی کیا تو بہ لاف نبوت ستی
میری نثر میں ہوئی صابی صبی نظر آوے وہاں ابن عتبی غنی
گر انشا ، کا بانی ہے عبدالحمید و لے میں ہوں خاتم بوجہ سدید
اگر قاضی مصر ہوتا یہاں یہ دعویٰ او پر حکم کرتا عیاں
بھیجے گر انشا ، میری تا رشید مقامات کی بھیج دیتا رسید
اگر ابن عباد ہووے حکم نہ سمجھے مجھے بو محمد سے کم

اس کے بعد انہوں نے اپنی فارسی نظم اور اس کے جملہ اقسام میں اپنی مہارت کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

ہے جیسا عرب میں مجھے دار و گیر ہوں ویسا ہی ملک عجم کا امیر
سنئے شعر کا میری گر ریک نوا تو کہتا اُدھے رود کی مرحبا
کہو گر قصائد تو افضل سے کہے کہ سلمان و مسعود عرفی رہے
ثنائی کرے یوں ثنا گستری ہر اس بدر کے پاس کیا انوری
غزل میں اگر دیوں رقت کا داد تو حافظ پڑھے آیت ان یکاد

بھلا بلفظ معنی میں حسن و تلاش | حسن اور خسرو کہیں شاد باش
کہوں مثنوی گر تو ہے دل گواہ | نظامی و سعدی کہیں واہ واہ
لکھوں گر معارف کہیں خاص و عام | ہوا پھر کے گردش میں جامی کا جام
کروں نظم اگر قطعہ ہائے متیں | پڑی رشک میں جان ابن یمیں
کہوں گر رباعی تو کھا پیچ و تاب | سحابی کی آنکھیں ہوں مثل سحاب
بہ فرد و بہ تسمیط و ترجیع بند | میری فکر ہے مستزاد و بلند
میرا نثر وہ چشمہ صاف ہے | عیاں جس میں اوصاف و صاف ہے
عبارت ہے میری وہ رنگیں بہار | کہ جان ریاض اس سے ہے خار خار

اپنے دکھنی اور اردو شاعری پر فخریہ کہتے ہیں :-

ہے دکھنی میں مجکو مہارت یتی | کہ النصر منکم کہے نصرتی
گر اردو کی بھاکے میں کھولوں زباں | تو سودا کا سب سود ہووے زیاں

وہ اپنے علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے فلسفہ سے ناواقف ہونے کا صاف طور سے اظہار کرتے ہیں مثلاً۔

غرض در علوم فروع اصول | خدا کی عنایت سے ہوں باحصول
نہیں فلسفہ کا مجھے کچھ بھی پاس | وگرنہ وہ کیا چیز ہے میرے پاس

آگاہ اگرچہ مدراس کی ریاست میں صاحب عزت اور مرتبہ تھے مگر معلوم ہوتا ہے عام طور سے لوگ علم کے قدردان نہیں تھے چنانچہ آگاہ نے اسکا گلہ کرتے ہوئے زمانے کی حالت کو بیان کیا ہے :-

یہ سب کچھ ہے لیکن کروں کیا علاج | نہ اس دور میں ہے ہنر کا رواج

مزید تفاخر کے بعد لکھتے ہیں :-

ہے اب ہزل اور مسخرے کو قبول | ہنر ہے پتھر اور فضلت فضول

تفاخر میں از وال ہیں جا بجا | ندامت میں اشراف ہیں مبتلا
جہاں لگ جو نوع مسلمان ہیں | ستو تکلیف و محنت سے حیران ہیں
سب ہی ہات سی غم کے پامال ہیں | ارا ذل جوان میں ہیں بامال ہیں
پر اہل نجابت اوپر قہر ہے | حیات انکی تلخی سی جوں زہر ہے
کرے کوئی اس وقت کیا فکر شعر | کہ بدتر ہے دشنام سے ذکر شعر
کرے کوئی کیوں عزم تصنیف کا | ہو کس طرح سے شوق تالیف کا

آگاہ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف پر اعتراض کئے تھے جس سی خیال ہوتا ہے دونوں میں صفائی نہ ہوگی مگر آگاہ اپنے دوستوں کے ذکر میں نہایت خلوص کے ساتھ انکا ذکر کرتے ہیں۔

جیسا راز دان خفی و جلی | ندیم سخن میر امداد علی (؟)
سیادت کی میزان کا حرف صحیح | نجابت کے انشا کا لفظ فصیح
زہی سرو موزوں باغ سخن | حسینی نسب بلگرامی وطن
ہر اہل سخن سے اُسے اتحاد | میرے سات الفت ہو اُسکی زیاد
دگر دوست میرا ہے عبد السلام | مروت میں کامل وفا میں تمام

اصل قصہ فارسی زبان میں ہے اس کو آگاہ سے بہت پہلے ۱۰۹۵ھ میں فائز نے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے۔ آگاہ اس سے واقف ہیں اور اُس دکھنی قصہ کو مکمل تصور نہیں کرتے

لکھے ہیں اُسے فارسی نثر میں | یہ مجمل وہ نہیں رائج اس عصر میں
کیا نظم دکھنی میں فائز اُسے | سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اُسے
نہیں شعر کا برگ و ساز اُس میں کچھ | نہ مضموں تلاشی کا راز اُس میں کچھ
مضامیں ہیں اُس کے پر بے اثر | ہیں الفاظ سب اُس کے زیر و زبر

جو تھا عقل اور نقل کے دھان خلا | کیا ہوں میں انصاف سو اسکو صاف
جہاں اسمیں ایجاز سے تھا خلل | کیا اس کو اطناب سو میں بدل
جہاں عشق کے جوش کا ہو مکاں | کیا ہوں وہاں اُسکا پورا بیاں
نکات اسمیں عرفاں کے لایا ہوں میں | مجازی میں اس کو چھپایا ہوں میں
کیا نام میں اُسکا گلزار عشق | کہ گل جوش میں اس سو اسرار عشق

اصل قصہ کا لب لباب اس طرح ہے :-

چین کے بادشاہ کا لڑکا رضوان شاہ علم و ہنر میں سرآمد روزگار تھا۔ باپ کے انتقال پر سلطنت کا مالک بنا ایک دن شکار کو روانہ ہوا۔ اور ہرن کا تعاقب کیا مگر ہرن ایک چشمہ میں غائب ہوگیا۔ رضوان شاہ نے اس ہرن پر فریفتہ ہوکر خود غوطہ لگانا چاہا مگر ارکان سلطنت مانع ہوئے۔ نجومی اور رمال اسکا سراغ لگانے کا وعدہ کرکے بادشاہ کو واپس لائے۔ رضوان شاہ ہرن کے عشق سے از خود رفتہ ہوگیا آخر کار اس چشمہ پر ایک محل تعمیر کرکے رہنے لگا روز محل روشنی سے جگمگا جاتا اور عطر و گلاب کی خوشبو سے معطر ہوا کرتا ایک رات روح افزا پری اس چشمہ سے باہر آئی دونوں کا وصال ہوا مگر جدائی ہوگئی اور ایک زمانے تک فراق میں بسر ہوئی۔ مصیبتوں میں گرفتار رہوئے اور پھر ایک مدت کے بعد دونوں کی شادی ہوئی اور اس طرح بامراد چین کو واپس ہوئے۔

اب مختلف مقامات سے مثنوی کا انتخاب[1] پیش کیا جاتا ہے۔ قصہ کی ابتدا :-

محبت کے گلزار کا باغباں | جو تھا اُس کے اخبار سو گل فشاں
ہلا اپنے خامہ کے شاخ نول | جیوایا یہ قصہ کا اوتار پھل
کہ تھا ملک میں چین کے ایک شاہ | تھا حکم اُسکا ماہی سے لے تا باہ

---

(۱) انتخاب میں میں نے کوئی خاص بات مدنظر نہیں رکھی ہو بلکہ یوں ہی کچھ نمونہ دیا گیا ہے۔

رضوان شاہ کی تعلیم و تربیت کا حال :۔

بلا بھیج ہر علم کے اوستاد
کئے اُس کی تعلیم کو دل نہاد

کئے اُس کو جوں چاہیے وہ تربیت
ہوے پوری تا آ سکے تئیں معرفت

طبیعی الٰہی میں فاضل ہوا
ریاضی کے ہر فن میں کامل ہوا

ہوا ہیئت و ہندسہ میں خبیر
حساب و مساحت میں وہ بے نظیر

ہوا موسقی میں وہ یوں اوستاد
کہ زہرہ کرے اس سے اس فن کو یاد

رضوان شاہ کی بے قراری :۔

ہوا رنج ضائع میرا سال کا
عجب ہی کہارا مرے حال کا

میرا سینہ حسرت سے ناشاد ہے
گنہ لازم ورنج برباد ہے

نہ اب جان نہ جاناں میری بات میں
مجھے بخت ڈالے ہیں کس گھات میں

کہاں سو گیا کھیلنے میں شکار
کہاں سے وہ ہرنی کئے دہان کنار

میں کیا کیا سہانگ و ناموس کھو
برس ایک لک شکل اوداس ہو

کشتی میں سوار ہو کر تلاش میں روانہ ہونا :۔

بہر حال دو نو ہو کشتی سوار
چلے تن بہ تقدیر بے اختیار

اوپر انکے تھانیلگوں آسماں
تلے انکے دریائے دوراز گراں

ہو دونوں بھی جینے سے اپنے ملول
گئے یک قلم اپنی ہستی کو بھول

کئے قطع اس طرح کئی روز جب
سمایا کھڑا ایک ادپر عجب

نمایاں ہوئی رات کو یک نہنگ
اوڑے کوہ کا جس کے ہیبت سے رنگ

رضوان شاہ روح کو نامہ تحریر کرتا ہے :۔

میں یک جزی کالعدم اے صنم
سہا ہوں تیرے غم سے کیا کیا ستم

کہ تیرا نگہبان ہونت ذوالجلال — رکھے تجکو دائم بلا سے سنبھال
نہ دیوے پہنچنے تجھے کچھ بھی غم — مسلم رکھے دل تیرا از الم
تیرے تن پہ دہاں جو جو آزار ہے — میری جان پر اُسکا سب بار ہے
پڑی جیسے پاؤں میں بیڑی تجھے — میرا دم ہوا پاؤں بیڑی مجھے
رگ رگ ہوئی میری زنجیر اب — کروں کیا میں اس غم کی تدبیر اب

رضوان شاہ کے متعلق دیو سے اظہار واقعہ :-

محبت میں کیا کیا مصیبت سہا — عجب ہے کہ اب لگ وہ جیتا رہا
اگرچہ ضمیر اُسکا ہے گا زخاک — ولے آتشی سے ہوا جل کے راک
تیری شاہزادی کہ ہے شہ پری — اوسے داغ سے غم کے بریاں کری
کبھو وحش صحرا کی فوجوں میں پھر — کبھو جوش دریا کی موجوں میں پھر
بہر حال پہنچا ہے اب وہ یہاں — ہلاکی سے مجکو دیا ہے اماں
تو جو ہو سکے تجھ سے تدبیر کر — اعانت میں اُس کی نہ تقصیر کر
دسے اول خبر اس کے محبوب کی — سپس فکر کر اس کے مطلوب کی

رضوان شاہ کامیاب ہو کر وطن کو واپس ہوتا ہے :-

خبر شہر میں یوں پہنچتی ہے تب — بنی یکے رضوان آیا ہے اب
یہ مژدہ سنے جب صغار و کبار — چلے اب ہیں سب دوڑ دریا کنار

بصد شان و شوکت کے انکو لئے — تھے چھوٹے بڑے جو محل میں ملے

خاتمہ کتاب میں لکھتے ہیں :-

اگر دیکھے اس نظم کو طمطراق — تپ دق سے سودا کو ہو احتراق
مجھے نصرتی ساتھ ہے گفت گو — اُسے کیا ہے طاقت کہ ہو روبرو

اگر جاوے چالیس میں یہ نور تن — ملک اس کو اپنا کرے من وموہن
جو دل عشق کی شمع کا ہے لگن — یہ نسخے کو اپنا کرے من لگن
جو ہے شوق شغل اور شور عزام — نشاطی ہو اس پھول کا وہ مدام
نہ کرتا ہوں ہرگز مباہات میں — کہاں راست ہے شبلاس بات میں
اگر شعر کے فن میں ساحر ہے تو — بہی عشق اور عرفاں میں ماہر ہے تو
بہی ہے انکا بھید میں تجکو راہ — کبت اور دہریت میں ہے دستگاہ
تو باور کرے گا تو یہ حرف صاف — وگرنہ کہنگا ہے لاف وگذاف
تھے جب یکہزار اور نوکم دوسو — بنا اُسکا دیباچہ اے گرم رو
گذر گئے ہیں جب اسپرتیس سال — ہوا بدر کامل یہ زیبا ہلال
کیا اس کی بیتوں کو جب میں عدد — ہوئے سہ ہزار اور پانسو نود

بھی محبوب سبحاں کے اوپر سدا
محب جس کے ہینگے تمام اصفیا

اگرچہ ان اشعار سے سنہ تصنیف ۱۲۱۰ھ ہوتا ہے ممکن ہے مثنوی کا اختتام اس سنہ میں نہ ہوا ہو کیونکہ دیباچہ جو نثر میں لکھا گیا۔ اسمیں صراحت سے ۱۲۱۱ھ کا ذکر ہے۔

آگاہ کی تصنیفات پر آجکل کے نقطہ نظر سے غور نہ کرنا چاہئیے۔ ڈیڑھ سو سال پیشتر کا ماحول آج کل کے ماحول کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ آگاہ نے جس زمانے میں اپنی تصنیفات شروع کیں اسوقت ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی کلایو اور وارن ہسٹنگز کا دور دورہ تھا مغلیہ خاندان پہ زوال آچکا تھا اور اس کا چراغ گل ہو رہا تھا اہل قلم دنیا سے گزر رہے تھے اور انکی جگہ پُر کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی زبان فارسی باقی نہ رہی تھی اس لئے اس کے جاننے والوں کا کال ہو رہا تھا۔ ملک کی عام زبان بھی فارسی تھی اس کے بجائے عام طور سے اردو کا رواج ہو رہا تھا مگر اقلیم اردو میں علم وفن کا ذخیرہ شاذ بلکہ نایاب تھا۔ شمالی میں صرف غزل نویسی کا زور

تھا جنوب میں مثنویوں کا رواج تھا مگر اس میں بھی علمی مواد بہت کم تھا۔
دانایان فرنگ ہنوز اردو کی سرپرستی کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے نہ تو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور شاہ عبدالقادر نے قران کی تفسیر قلمبند کی تھی۔ عام طور سے تعلیم کی کمی تھی خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی میں جو اب مادری زبان نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ اور حالت سے بدتر ہوتی جا رہی تھی
اس نقص کو معلوم کرنے والا۔ اس مرض کو دریافت کرنے والا۔ اس کے علاج پر کمر ہمت باندھنے والا۔ اور اپنی تصنیفات سے اسکا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔
آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو ضروری تصور کیا اور انکے لئے خاص کتابیں لکھیں۔ آگاہ نے اپنی تصنیفات میں صاف طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انکا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے۔ دیباچہ ہشت بہشت میں لکھتے ہیں :۔

"بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی مطلب تمام دل کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے"

اسی کتاب میں بیان کرتے ہیں :۔

"دکھنی میں کہا ہوں اس لئے میں | تا ہوئے سہج عوام کے تیں
تا سر بسر امیاں ہور عورات | پڑھنے ستی اُسکی پاویں لذات"

رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں :۔

ولے یو نظم بولیا بالضرورت | پڑھے تا اُسکو ہر امی و عورت

غرضکہ آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہی کہ اس نے اردو زبان میں سیر نفقہ عقائد پر چند دو کتابیں تصنیف کیں اور انکو خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا۔

آگاہ کے زمانے میں مبالغہ اور دروغ گوئی کلام کا خاص امتیاز تھا اور جو کتابیں واقعہ کربلا وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ صداقت سے دور تھیں اس کے برخلاف آگاہ نے دروغ گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا۔

آگاہ نے آنحضرت کی لائف میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ آپ کے بہترین اخلاق اور پاکیزہ سیرت کو صداقت کے ساتھ پیش کیا جائے اور بعض بعد کے مصنفین کی طرح معرکہ آرائی اور جنگ کو پیش نہیں کیا۔ آگاہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ آنحضرت کی مبارک زندگی میں اخلاق اور عادات ہی امت کے لئے چراغ ہدایت ہیں اور ان کی پیروی صراط مستقیم پر گامزن کرا سکتی ہی۔

آگاہ آج دنیا میں موجود نہیں ہے اس کی تصنیفات ہندوستان سے معدوم ہو چکی ہیں مگر جب تک زبان اردو قائم ہے اس کے محسنوں کی پہلی صف میں آگاہ کو جگہ دیجائیگی اور اس کے کارنامے گو پوشیدہ ہیں مگر فراموش نہیں ہو سکتے۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصہ

(بسلسلہ گذشتہ)

ایک دہقانی رئیس نے بوڑھے بوڑھے پارسی جمع کئے اور پرانی روایتوں کی رو سے ان منتشر اجزا کو ترتیب دیکر ایک مکمل کتاب تیار کرائی۔ مولانا شبلی نے اس کی تردید میں متعدد دلائل سے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت شاہنامہ کا ماخذ وہی عربی تراجم ہیں۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے اور فردوسی کا ان داستانوں کے نظم کرنیکا مقصد بھی یہی تھا کہ ایران کی قدیم تاریخ کے منتشر اوراق یکجا ہو جائیں اور ایرانیوں کو بھی عربوں کے مقابلہ میں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنیکا موقع ملے لیکن ان قصوں میں اس قدر تخیل آرائی اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور ایسے دور از کار افسانے اس میں درج ہیں کہ مہابھارت کے قصے بھی انکے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تاریخی وقعت داہمیت بالکل نظروں سے گر جاتی ہے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ایران کی تاریخ کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ یہی ہے اس سے زیادہ صحیح تاریخ مل بھی نہیں سکتی۔ سرجان مالکم تاریخ ایران میں لکھتے ہیں :-

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ و خیالات شاعری بسیار دارد لکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا یافت می شود دراں مندرج است"

ایک بڑی وجہ اس کی بے اعتباری کی یہی بتلائی جاتی ہے کہ اس میں فرضی افسانے اور دور از کار قصے شامل ہیں۔ لیکن فردوسی نے جن کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے وہ ابتدائی عہد کی لکھی ہوئی ہیں اور آپ ہر قوم کے ابتدائی عہد کی تاریخوں میں اسی قسم کے وہمی و خیالی افسانے پائیں گے

علاوہ بریں فردوسی نے جن ماخذوں کی مدد سے اپنی کتاب تیار کی ہو ان میں یہ قصے اسی طرح درج تھے۔ فردوسی نے فرض سمجھکر ان قصوں کو جوں کا توں نقل کر دیا۔

مستشرقین نے زمانہ ماقبل اسلام کی کتابیں بڑی کاوش کے بعد ڈھونڈھ کر نکالی ہیں۔ ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں میں کچھ شاہان عجم کی تاریخ سے متعلق بھی ہیں غالباً فردوسی کا ماخذ بھی یہی کتابیں تھیں۔ ان تاریخوں اور فردوسی کے بیان میں مطلق فرق نہیں ہے کارنامہ ارتخشتر جو کچھ عرصہ قبل اسلام کی تاریخ ہے اور پہلوی زبان میں جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے مولنا شبلی نے اس کے متعلق پروفیسر براون کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

"اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے اور نظریں اس کی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے۔ ان سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے"(۱)

غرضکہ مستشرقین نے اس امر کا پورے طور پر اعتراف کیا ہے کہ فردوسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم ایرانی تاریخوں سے حرف بحرف مطابق ہے خود فردوسی کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر خیال ہے کہ وہ ماخذ کا بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے (۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہنامہ قدیم ایران کا مرقع ہے۔ وہ صرف ایک رزمیہ مثنوی ہی نہیں ہو بلکہ آپ اس سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا بھی بخوبی پتہ لگا سکتے ہیں۔ مولنا شبلی لکھتے ہیں۔

"شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آجاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامے

---

(۱) شعر العجم حصہ اول (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم

کی مدد سے اُس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔

"بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا۔ امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے عرض و معروض کرنے کے کیا آداب تھے۔ انعام و اکرام کا کیا طریقہ تھا۔ بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا۔ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ نامہ و پیام کا کیا انداز تھا۔ مجرموں کو کیونکر سزائیں دیجاتی تھیں بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کیجاتی تھی وغیرہ وغیرہ "

" شادیوں کے کیا مراسم تھے۔ جہیز میں کیا دیا جاتا تھا۔ عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں دولھا دلہن کا کیا لباس ہوتا تھا۔ پیش خدمت غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا "

"خط و کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے۔ خاتمہ کی کیا عبارت ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ ان کو کیونکر بند کرتے تھے۔ کس چیز کی مہر لگاتے تھے "

" مالگذاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا۔ زمینوں کی کیا تقسیم تھی مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں ٹیکس کیا کیا تھے۔ کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے "(۱)

مولانا نے اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں لیکن مضمون اس قدر تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

شاعری کی حیثیت سے بھی شاہنامہ کا جو مرتبہ ہے اس پر حرف رکھنے کی گنجایش نہیں، مولانا شبلی نے شعرالعجم کے پہلے اور چوتھے حصے میں فردوسی کی خصوصیات شاعری پر مفصل بحث کی ہے نظامی کے تذکرہ میں انہوں نے فردوسی اور نظامی کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس میں اگرچہ انہوں نے

---

(۱) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۱۴۶

نظامی کو اکثر مقامات پر ترجیح دی ہے لیکن آخر میں انہیں لکھنا پڑا ہے کہ

"ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہے اور نظامی نظامی"[1]

عنصری

محمود کے دربار کا یہی نامور شاعر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کو بقائے دوام اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ دولت شاہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"مناقب و بزرگواری او اظہر من الشمس است و سرآمد شعرائے روزگار سلطان محمود بودہ وا ورا، ورائے شاعری فضائل است بعضے اورا حکیم نوشتہ اند"[2]

حسن بن احمد نام ابو القاسم کنیت اور عنصری تخلص ہے۔ بلخ اصلی وطن ہے ابتدا میں مروجہ علوم و فنون حاصل کئے لیکن شاعری کا ذوق سب پر غالب آگیا۔ اس نے اسی فن کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس قدر ترقی کی کہ سلطان محمود کی ندیمی کا منصب ملا۔

"اورا در مجلس سلطان منصب ندیمی با شاعری ضم بودہ و پیوستہ"

سلطان محمود کے دربار میں چار سو شاعر تھے اور عنصری کی حیثیت ان سب سے بلند تر تھی وہ گویا انکا افسر اور استاد تھا"[3] محمود نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا تھا اور تمام شعرا کو حکم تھا کہ پہلے اپنا کلام اصلاح کی غرض سے عنصری کو دکھائیں بعد کو بارگاہ سلطانی میں پیش کریں۔ اس کے انہیں اعلیٰ مناصب کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے شعرا نے اسکی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ وہ خود بھی شاعروں کا قدردان تھا اور ہر طریقہ سے انکی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ دولت و ثروت کا

---

(۱) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۳۵۶

(۲) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۴

(۳) " " "

یہ حال تھا کہ چار سو زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔ اس کی شاعری کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ درباری شعرا کا افسر تھا اور دیگر شعرا کے قصائد سلطان کی خدمت میں پیش ہونے سے پیشتر اس کو دکھائے جاتے تھے اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے:۔

"دیوان استاد عنصری قریب سی ہزار بیت است مجموع آں اشعار مصنوع و معارف و توحید و مثنوی و مقطعات"(۱)

مگر اب صرف تین ہزار شعر باقی ہیں اس وقت شعرا کی طبائع کا رجحان زیادہ تر قصائد کی جانب تھا لیکن جیسا کہ مندرجہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے اس کی شاعری صرف قصائد تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں قطعات و مثنویاں وغیرہ سبھی شامل تھیں اس نے متعدد مثنویاں لکھی تھیں جو اب ناپید ہیں۔ بدیہہ گوئی شاعری کا لازمی جز سمجھا جاتا تھا شاہی درباروں میں در خور حاصل کرنے کے لئے بدیہہ گوئی میں کمال پیدا کرنا ناگزیر تھا۔ عنصری اس وصف میں سب سے آگے تھا۔ مولنا شبلی نے عنصری کی بدیہہ گوئی کے متعدد واقعات لکھے ہیں(۲)۔ اس کی طبیعت

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۸

(۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲ نظامی عروضی نے بھی عنصری کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے یہ محمود و ایاز کے متعلق ہے وہ لکھتا ہے ایک رات محمود نے شراب بہت پی لی اسی حالت بدمستی میں ایاز کی طرف نگاہ اٹھائی اس کی پیچ در پیچ زلفیں دیکھکر بے قرار ہو گیا اور والہانہ اس کی طرف بڑھا لیکن یک بیک اس کی حالت سنبھل گئی اور تقوے کا جوش بدمستی پر غالب آ گیا۔ فوراً قینچی ایاز کی طرف بڑھائی اور زلفیں کاٹنے کا حکم دیا۔ اسی حالت میں خوابگاہ کو چلا گیا صبح کو اٹھا تو ایاز کی یہ حالت دیکھکر بہت بدمزہ ہوا اپنے کئے پر نادم و پشیمان تھا اور بے قراری میں اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ درباریوں میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ دریافت کرتا آخر حاجب علی قریب کے حکم سے عنصری اس کی خدمت میں حاضر

کا رجحان زیادہ تر قصیدہ گوئی کی جانب تھا۔ قصیدہ میں اس نے نت نئی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ ان قصائد میں اس نے اپنا زور صرف ممدوح کی مبالغہ آمیز تعریفوں ہی پر صرف نہیں کیا ہے بلکہ اکثر قصیدوں میں سلطان کی لڑائیوں کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں شروع سے آخر تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے ایک دوسرا قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہے اور آخر تک اسے نباہا ہے (۱)

فرخی

علی نام (۲) ابوالحسن کنیت فرخی تخلص سیستان وطن (تذکرۃ الشعرا میں ترمذی لکھا ہے) باپ کا نام جولوغ یا قلوغ، نہایت نیک، سلیم الطبع اور ذہین تھا۔ شاعری میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا تھا۔ سیستان کے ایک دہقان کا ملازم تھا۔ دو سو کیل

ہوا۔ سلطان نے کہا میں تیرے ہی انتظار میں تھا۔ تجھے معلوم ہے کہ کیا واقعہ ہو گیا ہے کچھ ایسے شعر کہہ جو حسب حال ہوں۔ عنصری نے برجستہ کہا

کے عیب سر زلف بت از کاستن است   چہ جائے بغم نشستن و خاستن است

جائے طرب و نشاط و مے خواستن است   کاراستن سرو زپیراستن است

سلطان یہ اشعار سنکر بے انتہا خوش ہوا اور حکم دیا کہ تین مرتبہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ (چہار مقالہ صفحہ ۳۵) یہ واقعہ شعر العجم میں بھی کم و بیش اسی طرح مذکور ہے لیکن مولانا نے چہار مقالہ کا حوالہ دیکر لکھا ہے کہ اس میں بجائے منہ کے دامن ہے لیکن (مولنا کو غالباً کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ) جو نسخہ اسوقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں بجائے "دامان" کے "دہان" ہی لکھا ہے۔

(۱) تفصیل کے لئے شعر العجم حصہ اول تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۸ و ۴۹ لباب الالباب صفحہ ۲۹ و ۳۰ و ۳۲ و ۳۳

(۲) فرخی کے ابتدائی حالات لکھتے وقت ہم نے چہار مقالہ اور شعر العجم دونوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ مولنا شبلی نے بھی ابتدائی حالات تمام تر چہار مقالہ سے اخذ کئے ہیں۔

غلہ اور سو درہم سالانہ معاوضہ مقرر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک امیر عورت سے شادی کی جس کی وجہ سے خرچ میں زیادتی ہوئی اور موجودہ آمدنی ناکافی ہونے لگی۔ فرخی نے زمیندار سے مقررہ معاوضہ میں اضافہ کی درخواست کی۔ زمیندار نے معذوری کا اظہار کیا اس سے فرخی کو بہت مایوسی ہوئی اور اب وہ اس تلاش میں رہنے لگا کہ کسی امیر کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ اس کی موجودہ مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نکل آئے لوگوں نے اسے بتلایا کہ امیر ابو المظفر چغانی بہت بڑا سخن سنج اور قدر دان علم و فن ہے۔ شعرا کی جماعت کو بیش قرار انعامات اور صلے دیتا ہے اور معاصر امراء میں اس بارے میں اسکا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ سنکر اس نے ایک قصیدہ کہا جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

با کاروان حلہ رفتم ز سیستان   با حلۂ تنیدہ ز دل بافتہ ز جاں

اور بلخ کی جانب روانہ ہو گیا جہاں ابو المظفر محمود کی جانب سے گورنر تھا۔ اسے گھوڑوں سے بہت شوق تھا۔ اس کے چراگاہ میں اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے تھے ہر سال وہ انکا جائزہ لیتا تھا اور داغ کرتا تھا۔ فرخی جس وقت بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر "داغگاہ" میں ہے اسکا مختار کل حمید اسعد بھی وہیں موجود تھا فرخی اس کے پاس پہنچگیا۔ اور قصیدہ جو لکھکر لایا تھا اسے سنایا اور امیر ابو المظفر کی خدمت میں پیش کرنے کی درخواست کی خواجہ اسعد ایک فاضل اور "شاعر دوست" آدمی تھا قصیدہ سنکر اور اس کی صورت دیکھکر اسے سخت تعجب ہوا اس لئے کہ قصیدہ بہت اچھا تھا اور فرخی کی صورت بالکل دیہاتی گنوار کی سی اس لئے حمید اسعد کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قصیدہ اسی گنوار کا لکھا ہوا ہے جس کو شاعری سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ امتحاناً کہا کہ میں تمہیں امیر کی خدمت میں باریاب کر دوں گا مگر پہلے تم داغگاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ لکھکر لاؤ اس نے داغگاہ کا نقشہ کھینچکر بتلایا کہ یہ بہت خوش منظر مقام ہوتا ہے کوسوں تک سبزہ زار چلا جاتا ہے۔ خیموں کی قطار لگی ہوئی ہے چاروں طرف چشمے بہتے ہیں احباب ایک ساتھ بیٹھکر شراب پیتے ہیں۔ جشن کرتے ہیں بادشاہ کے

ایک ہاتھ میں شراب اور دوسرے ہاتھ میں کمند ہوتی ہے شراب پیتا جاتا ہے اور گھوڑے بخشتا جاتا ہے۔ فرخی نے رات بھر میں یہ قصیدہ کہہ ڈالا۔ اور دوسرے دن عمید اسعد کے ساتھ پڑھا اس قصیدہ کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

چوں پرند نیلگوں بر روے پوشد مرغزار | پرنیان ہفت رنگ اندر سرآرد کوہسار
خاک را چوں ناف آہو مشک زاید بے قیاس | برگ را چوں پر طوطی برگ روید بیشمار
دوش وقت صبحدم بوے بہار آورد باد | حبذا باد شمال و خرما بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں | باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوے بیضہ دارد اندر مرسلہ | ارغواں لعل بدخشی دارد اندر گوشوار
تا برآمد جامہائے سرخ مل بر شاخ گل | پنجہائے دست مردم سر فرو کرد از چنار
باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نما | آب مروارید گون و ابر مروارید بار
راست پنداری کہ خلعتہائے رنگیں یافتند | باغہائے پرنگار از داغگاہ شہریار

خواجہ عمید یہ قصیدہ سنکر حیران رہگیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسے اشعار اس کے گوش زد نہیں ہوئے تھے۔ تمام کام چھوڑ چھاڑ فرخی کو اپنے ساتھ لے امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ خداوندا دقیقی کے بعد سے اتبک ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا اور تمام واقعہ بیان کیا غرضکہ ابو المظفر کے دربار میں اُسے جگہ مل گئی اور ابو المظفر نے جوہر قابل دیکھکر کچھ عرصہ کے بعد محمود کے دربار میں پہنچا دیا جہاں اس نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی بیس سیمیں کمر غلام اس کی رکاب میں چلتے تھے (۱)

فرخی کی تعلیم و تربیت دیہات میں ہوئی اس کی شاعری نے بھی اگرچہ بعد میں ترقی

---

(۱) مولنا شبلی نے شعر العجم میں .... زریں کمر لکھا ہے لیکن چہار مقالہ میں سیمیں کمر ہے۔

کے منازل طے کئے لیکن اس کی ابتدائی نشوونما دیہات ہی میں ہوئی۔ اسی لئے اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک فطرتی شاعر میں ہونے چاہئیں۔ زبان کی صفائی روانی اور سلاست اس کے کلام کا عام جوہر ہیں اس کی فطری ذکاوت و ذہانت اور شاعرانہ کمال کی محمد عوفی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے۔

فرخی کہ رخ خوب روئے بلاغت را مشاطۂ فصاحت او جہاں آراست کہ ہیچ قادح انگشت بر حرف آں نہادو شعراو عذب در معنی است باول وصنعت سخن و بدقت معانی کوشیدہ و دراں از اقران سابق آمدو بآخر سخن سہل ممتنع ایراد می کرد۔[1]

دولت شاہ سمرقندی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے فرخی کی تعریف کے سلسلہ میں وطواط کا قول بھی نقل کیا ہے وہ کہتا ہے۔

ذہنے سلیم و طبع مستقیم داشتہ استاد رشید وطواط می گوید کہ فرخی عجم راچناں است کہ متنبی عرب را وایں ہر دو فاضل سخن را سہل ممتنع می گویند[2]

قصیدہ اور واقعہ نگاری میں اس نے کمال حاصل کیا تھا۔ مرثیہ کے اشعار پہلے فارسی میں بہت کم پائے جاتے تھے شاعری کی اس صنف کو بھی اس نے درجہ کمال تک پہنچادیا اس نے سلطان محمود کی وفات کے بعد اسکا زبردست مرثیہ لکھا تھا۔ مولانا شبلی اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور اثر سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور قوانین اس سے منضبط کئے جا سکتے ہیں"[3]

---

(۱) لباب الالباب صفحہ ۴۷

(۲) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۵

(۳) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۸۸

اس مرثیہ کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ہم یہاں درج کرتے ہیں :۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار   چہ فتادست کہ امسال دگرگوں شد کار

کویہا بینم پر شورش و سرتاسر کوے   ہمہ پر جوشن و جوشن در و پر خیل و سوار

مہتراں بینم بر روئے زناں ہمچو زناں   چشمہا کردہ ز خون نابہ برنگ گلنار

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا   دشمنے روئے نہادست دریں شہر دیار

سیر ے خوردہ مگر دی کہ بخفتہ است امروز   دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولاں شہاں آمدہ اند   ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند اکہ برانگیزد ازیں خواب ترا   خفتنی خفتنی کز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود   ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

یکدمک بارے در خانہ بایست نشست   تا بدیدے روئے تو عزیزان و تبار

بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں   تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار

شعرا را بہ تو بازار برافروختہ بود   رفتی و با تو بہ یکبارہ برفت آں بازار

اس کے دیوان کو ماوراءالنہر میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی اسکی ایک تصنیف ہی جو اس نے فصاحت و بلاغت پر لکھی ہی " ترجمان البلاغت " نام ہے[1]۔ لیکن رشید الدین وطواط[2] نے اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہے[3] اور

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۷

(۲) رشید الدین محمد بن عبدالجلیل سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطاب سے جا کر ملتا ہے۔ بہت بزرگ فاضل اور ادیب تھا بہت سے فنون میں مہارت تھی اس کی قابلیت علم کا اعتراف وقت کے تمام اکابر کو تھا اصل مسکن بلخ تھا لیکن خوارزم میں سکونت اختیار کی قطب الدین خوارزم شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی۔ دور دور سے لوگ آ کر شعر و شاعری میں اس سے استفادہ کرتے تھے۔ نہایت تیز زبان اور فصیح تھا فن نقد میں خاص کمال

اور لکھا ہے کہ یہ ایک لغو کتاب ہے

اسدی طوسی

یہ بھی سلطان محمود کی بزم ادب کا ایک اہم رکن ہے شاعری کے اعتبار سے اسکا مرتبہ اپنے ہمعصر شعرا سے کسی طرح کم نہیں ۔ دولت شاہ نے اس کو فردوسی کا استاد لکھا ہے۔ لیکن مولنا شبلی نے اس کی تردید کی ہے اور خود اسدی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کا استاد نہیں بلکہ ہمعصر ہے ۔ محمود کے زمانہ میں وہ خراسان کے شعرا کا استاد تھا۔ اسے بار ہا شاہنامہ نظم کرنے کے لئے مجبور کیا گیا لیکن اس نے ہمیشہ اس سے پہلوتہی کی اور اپنے بڑھاپے کا عذر پیش کرتا رہا۔ البتہ فردوسی سے ہمیشہ شاہنامہ نظم کرنے کی فرمائش کرتا رہا کہ اُسے وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔[1] دولت شاہ نے ایک روایت اور بھی نقل کی ہے یعنی یہ کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر دوسرے مقامات سے ہوتا ہوا اپنے وطن پہنچا ہے تو موت کے کنارے آن لگا تھا۔ اس نے اپنے استاد اسدی کو بلا کر کہا کہ استاد! موت کا وقت قریب پہنچ گیا ہے اور شاہنامہ ہنوز مکمل نہیں ہوا ہے اگر میں مر گیا تو مجھے خوف ہے کہ میرے بعد کسی کو اس کی تکمیل کی ہمت اور توفیق نہیں ہوگی۔ اسدی نے کہا کہ عزیز من کچھ فکر مت کرو اگر زندگی رہی تو تمہارے بعد میں اسے پورا کروں گا فردوسی نے کہا کہ آپ بہت بوڑھے ہوگئے ہیں اس لئے کس طرح آپ اس کام کو انجام دے سکیں گے اسدی نے کہا کہ انشاء اللہ سب ہو جائے گا یہ کہکر وہ مکان پر واپس ہوا اور اسی روز دوسری نماز کے وقت

حاصل تھا اس لئے اکثر شعرا اُس سے ناراض تھے ۔ بہت سے شعرا نے اس کی ہجو بھی لکھی ہے اور طرح طرح کے الزامات بھی قائم کئے ہیں لیکن وہ ان تمام الزامات سے بالاتر ہے ۔ تذکرۃ الشعرا صفحہ ۸۷

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ [illegible]

تک ... بم چار ہزار شعر کہہ ڈالے۔ الیٰ آخرہ[1] لیکن مولنا شبلی نے اس کو بھی نہایت معقول دلائل کے ساتھ فرضی اور غلط ثابت کیا ہے[2]۔ اسدی کا اصلی نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے۔ طوسی وطن میں تعلیم سے فراغت حاصل کرکے عراق آیا اور دیلمیوں کے دربار میں اسکی رسائی ہوگئی یہاں سے آذربائیجان رخ کیا وہاں کے رئیس ابو دلف کا وزیر نہایت قدر شناس تھا اس نے اسے شاہنامہ کے طرز پہ ایک کتاب لکھنے کی ترغیب دی چنانچہ گرشاسپ نامہ سی ترغیب کا نتیجہ ہے[3]

فارسی مصطلحات پر بھی اس کی ایک کتاب ہے اور یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے اور یہ ایک یورپین مستشرق نے اسے چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[4]۔

عسجدی

عسجدی بھی محمود کے دربار کے مقبول شعرا میں تھا دولت شاہ نے اسے "از جملہ شاگردان استاد عنصری[5]" لکھا ہے وطن کے متعلق بھی تذکروں میں اختلاف ہے عوفی اسے مرو کا باشندہ بتاتا ہے[6]، دولت شاہ نے ہروی الاصل لکھا ہے[6]۔ دولت شاہ اس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "قصائد را متین و ملائم می گوید"۔ عسجدی کے دیوان کو شہرت نہیں نصیب ہوئی لیکن اسکا جستہ جستہ کلام مختلف رسائل اور تذکروں وغیرہ میں پایا جاتا ہے محمود نے جب سومنات فتح کیا تو اس نے بھی ایک قصیدہ لکھا چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد — کردار خویش را علم معجزات کرد

آثار روشن ملکاں گذشتہ را — نزدیک عجز داں ہمہ از مشکلات کرد

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۶ (۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۸۳ (۳) ایضاً صفحہ ۱۸۴ (۴) [illegible]

(۵) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۴۷ (۶) ایضاً

بزدود ز اہل کفر جہاں را بزاہل دیں | لشکر دو عا خویشتن از واجبات کرد
محمود شہریار کریم آنکہ ملک را | بنیاد بر محامد و بر مکرمات کرد[1]

یہ مشہور رباعی اسی کی ہے۔

از شرب مدام و لاف مشرب توبہ | از عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و برلب توبہ | زیں توبۂ نادرست یارب توبہ[1]

غضائری

شعرائے عراق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں رتے سے ملازمت کی غرض سے غزنین آیا۔ شاعری کے تمام اصناف پر اسے قدرت تھی۔ صنعت اغراق میں خصوصًا کمال حاصل تھا۔ سلطان محمود کی شان میں متعدد قصیدے کہے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

اگر مراد بجاہ اندر است و جاہ بمال | مرا بہ بیں کہ بہ بینی جمال را بکمال
من آں کسیم کہ بمن تا بحشر فخر کنند | ہر آنکہ بر سر یک بیت بر نویسد قال

اس قصیدہ میں صنعت اغراق ہے جس کے صلہ میں محمود نے سات توڑے دئے جن کی قیمت ۱۴ ہزار درہم تھی۔ اغراق یہ ہے

صواب کرد کہ پیدا نکرد ہر دو جہاں | یگانہ ایزد دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو بہ بخشیدے او بزور سخا | امید بندہ نماندے بایزد متعال

روایت دولت شاہ کی ہے مولانا شبلی نے ، کے بجائے دو توڑے لکھے ہیں اور خود غضائری کے ان اشعار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) یہ بیان تمامتر لباب الالباب جزو دوم اور تذکرہ دولت شاہ سے ماخوذ ہے۔ (۲) شعر العجم جلد اول

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں | بر آں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم | برغم حاسد و تیار بدسگال محال[1]

(۱) عنصری کا بیان بھی لباب الالباب جلد دوم تذکرۃ الشعرا اور شعر العجم حصہ اول سے ماخوذ ہے۔

غزلیات

(از جناب احسان احمد صاحب بی۔اے، ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ)

کئی مہینے ہوئے یہ غزلیں حضرت احسان نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی درخواست پر عطا فرمائی تھیں۔ ادارت کی غفلت سے اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ دینے والے اور دلانے والے دونوں سے معافی کی التجا ہے۔

(۱)

محسوس ہو رہی ہیں خود اپنی تجلیاں | اب کعبہ چاہیے نہ صنم خانہ چاہیے
وہ شمع حسن آج بھی ہے مائل کرم | سوز و گداز سینۂ پروانہ چاہیے
کیا کیا لطافتیں انہی ناکامیوں میں ہیں | احساس لذت غم جانانہ چاہیے
دیکھوں تو پھر حقیقت اوج حریم ناز | اک بیخودی کا نعرۂ مستانہ چاہیے
نغمے عجیب شور سلاسل میں ہیں نہاں | سننے کو لیکن اک دل دیوانہ چاہیے
اس بزم قدس تک تو پہنچنے کے واسطے | زاہد مری یہ لغزش مستانہ چاہیے

اس تشنگی کو میں تو سمجھتا ہوں زندگی — اہل ہوس کو ساغر و پیمانہ چاہیے

یہ نالہ و بکا تو نہیں کارِ عاشقی — ہر مایۂ عزیز کا نذرانہ چاہیے

آساں نہیں ہے جیب و گریباں کا پھاڑنا — اس کے لئے بھی عاقل و فرزانہ چاہیے

اس راہِ عشق میں تو بس اتنا ہے مجھکو ہوش — ہر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

دشواریاں حیات کی احساں کچھ نہیں
فکرِ بلند و ہمتِ مردانہ چاہیے

(۲)

کس کے فیضانِ تجلی سے یہ دل سیراب ہے — آج ہر داغ چمکتا ہے گلستاں ہو کر

راحتِ روح ملی، دولتِ کونین ملی — محرمِ جلوۂ کیفِ غمِ پنہاں ہو کر

دیکھ پھر ہوتی ہے کیا بارشِ انوارِ کرم — مشہدِ عشق میں آ سرمدِ عریاں ہو کر

کر دیا بزمگہِ دہر کو معمور "گداز" — خاکِ پروانہ کے ذرّے دلِ پریشاں ہو کر

وادیٔ عشق ہے یہ، نالہ و شیون کیسا — ہاں، اٹھا گامِ طلب تجدید و رقصاں ہو کر

کر دیا برقِ سرِ طور کو محرومِ جمال — جلوہ ہائے دلِ بیتاب نے عریاں ہو کر

اب تو اس برقِ تجلی سے ہے اک ربطِ لطیف — مجھکو کیا چیز ملی سوختہ ساماں ہو کر

بزمِ اسرار کے پردوں کو الٹنا تھا جسے — رہ گیا ہاتھ وہ پابندِ گریباں ہو کر

دل میں اک رقص تو ہے روح میں اک وجد تو ہے — گرچہ کچھ بھی نہ ملا چاک گریباں ہو کر

کاش رہ جائے مرے سینہ میں یہ داغِ جنوں — اک نشاطِ ابدی کا چمنستاں ہو کر

تجھکو گرنا تھا مرے قلب پہ اے برقِ جمال — کیا ملا طور پہ تجھکو شرر افشاں ہو کر

دو عینکیں

بابو صاحب علیگڑھ کے گریجوایٹ تھے اور بجی میں منصرم تھے۔ مولوی صاحب اپنے استاد مرحوم کے شاگرد تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ بابو صاحب دبلے پتلے آدمی تھے، داڑھی منڈاتے تھے، مونچھیں اتنی بڑی رکھتے تھے کہ دودھ کی بالائی اُن میں اٹک کر رہجاتی تھی۔ مولوی صاحب فربہ اندام تھے۔ انکی داڑھی عرض میں زنخدان تک محدود تھی مگر طول میں بہت دور تک پہنچی تھی۔ مونچھیں صاف رہتی تھیں، یخنی، حریرہ، ہریسہ، ماءاللحم کسی چیز کے پینے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ بابو صاحب گھر پر قمیص اور ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے اور دفتر میں سوٹ سے مشابہ ایک چیز جو چھاؤنی کا درزی انہیں سی کر دیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب گھر پر اور مدرسے میں ہر جگہ نیچا کرتہ اور اونچی ازار پہنتے تھے جو انکی بیوی سیتی تھیں۔ بابو صاحب ولایتی چشمہ لگاتے تھے جس کی کمانی پر سونے کا ملمع تھا مولویصاحب بہت موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے جس میں ٹٹا ہوا دھاگا کمانی کا کام دیتا تھا۔

بابو صاحب پہلے لیڈر کے خریدار تھے مگر جب سے پانیر کا چندہ کم ہو گیا، پانیر منگواتے تھے۔ مولوی صاحب کوئی اخبار خریدتے نہیں تھے مگر اسکول کے دارالمطالعہ میں جتنے اردو اخبار آتے تھے سب کو پڑھا کرتے تھے۔ بابو صاحب کو کتب بینی کا شوق نہ تھا۔ اخبار کے علاوہ اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو اپنے صوبے کی سول لسٹ۔ مولوی صاحب کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی موٹی سی عربی کی کتاب ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بابو صاحب کو سوائے اصلاح معاشرت کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو علاوہ دینیات کے علمی اور سیاسی مسائل سے بھی شغف تھا۔ اور انہیں بھی وہ دینیات کا جزو سمجھتے تھے۔ بابو صاحب اپنے آپ کو آزاد خیال اور مولوی صاحب کو تنگ نظر اور متعصب سمجھتے تھے مولوی صاحب اپنے آپ کو مسلمان اور بابو صاحب کو ملحد کہتے تھے۔

باوجود ان اختلافات کے بابو صاحب اور مولوی صاحب میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے جس میں زنانے کے دو الگ حصے تھے، مگر مردانہ مشترک تھا۔ مردانے میں غسلخانے، پاخانے اور نوکروں کی کوٹھری کے علاوہ چار بڑے کمرے تھے جس میں سے ایک بابو صاحب کی نشستگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس میں دری بچھی تھی اور چند بید کی کرسیاں اور چند مونڈھے۔ دوسرا بابو صاحب کے مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز پر لکھنے کا سامان دفتر کی مسلیں، تار اور منی آرڈر وغیرہ کے فارم، سول لسٹ اور ریل کا ٹائم ٹیبل سب چیزیں قرینے سے رکھی رہتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ اس میں آدھے کمرے میں چٹائی پر ایک بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی تھی صدر میں ایک میلا سا گاؤتکیہ رکھا تھا۔ اس کے آگے چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ کر سوسوا سو کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے کے بقیہ نصف حصے میں نماز کی چوکی تھی اور ایک تخت جس پر مولوی صاحب کے کپڑے اور گھر کی بہت سی چیزیں جن کے رکھنے کا کہیں اور ٹھکانا نہ تھا، پڑی رہتی تھیں۔ چوتھے کمرے میں بابو صاحب کا لڑکا اور مولوی صاحب کا لڑکا جو ہم عمر تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، رہا کرتے تھے۔

مولوی صاحب دونوں لڑکوں کے ساتھ مدرسے سے ساڑھے چار بجے واپس آیا کرتے تھے اور ساڑھے پانچ بجے تک عصر کی نماز سے اور سہ پہر کے ناشتے سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بابو صاحب اپنے دفتر سے لوٹتے تھے۔ بابو صاحب کا معدہ کمزور تھا اس لئے وہ سہ پہر کو ناشتہ نہیں کرتے۔ دفتر سے لوٹ کر وہ منہ ہاتھ دھوتے تھے اور پھر اپنے نشست کے کمرے میں یا گرمی کے دن ہوں تو صحن میں ایک تکیہ دار مونڈھے کے سامنے ایک تپائی رکھ کر دراز ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب بھی آ بیٹھتے تھے اور محلے کے بعض احباب بھی جمع ہو جاتے تھے مغرب تک یہیں نشست رہتی تھی۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس میں مولوی صاحب بہت زیادہ اور بابو صاحب بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اور دوسرے حضرات

جو نماز کے پابند تھے محلے کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور بابو صاحب اور یاران بے نماز بدستور باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے مسجد سے واپس آنے پر سب احباب رخصت ہوجاتے تھے اور مولوی صاحب اور بابو صاحب اور دونوں لڑکے سب مل کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھاکر بابو صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور دفتر سے جو مسلیں ساتھ آتی تھیں انکے ساتھ تین چار گھنٹے مصروف رہتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے کمرے میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عشا کی نماز مولوی صاحب گھر پر پڑھتے تھے اور نماز سے فارغ ہوکر گھر میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ بابو صاحب کو بارہ بجے کے قریب سونا نصیب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب صبح کو تڑکے اٹھتے تھے، نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہوکر ٹہلنے جاتے تھے وہاں سے واپس آکر دونوں لڑکوں اور بعض طالب علموں کو عربی فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے اور ساڑھے نو بجے کھانا کھاکر مدرسے کی راہ لیتے تھے۔ بابو صاحب ساڑھے سات بجے بیدار ہوتے تھے اور ناشتہ کرتے ہی جج صاحب کے گھر چلے جاتے تھے کیونکہ دفتر کے وقت سے پہلے انہیں وہاں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

یوں تو بابو صاحب اور مولوی صاحب میں روز شام کو باتیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ بابو صاحب ذرا محتاط اور خوددار آدمی تھے اس لئے اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنا وہ خلاف مصلحت اور خلاف شان سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کا مزاج بہت تیز تھا اور اور جب ان سے اور کسی شخص سے مجمع میں گفتگو ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں گفتگو مناظرہ بن جاتی تھی اور مناظرہ مجادلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ بہ خلاف اس کے جب وہ کسی سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے تو انکا رد یہ اول سے آخر تک عدم تشدد کا رہتا تھا۔ اس لئے بابو صاحب ان سے اگر کبھی کھل کر باتیں کرتے تھے تو اتوار سے پہلی رات کو جب ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا۔ اس رات کو عموماً دونوں صاحب کام نہیں کرتے تھے اور اکثر کھانے کے بعد دو ایک گھنٹے تبادلۂ خیالات میں صرف کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً معاشرت کے مسائل ہوتے تھے کیونکہ بابو صاحب کسی اور مبحث سے ذوق نہیں رکھتے تھے۔

اس تبادلۂ خیالات کی عجیب شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مولوی صاحب ٹکٹکی باندھ کر چھت کی طرف دیکھتے تھے اور انکی آنکھوں کی چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انکی نظر نامحدود فضاسے گذر کر آسمانی بلندیوں کی سیر کر رہی ہے اور بابو صاحب بڑے گہرے غور و فکر کے انداز سے فرش پر نظر جما دیتے تھے گویا طبقات ارض کے نیچے تحت الثرٰی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں عجب محویت کے عالم میں باری باری سے گفتگو کرتے تھے اور بیچ بیچ میں بابو صاحب اپنے رومال سے اور مولوی صاحب اپنے کرتے کے دامن سے عینک صاف کرتے جاتے تھے۔ اس حالت میں کوئی انہیں دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھتا کہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر یہ زندگی اور یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی عینک کی مدد سے کسی اور طلسمی عالم کا نظارہ کر رہا ہے۔ اور دوسرے کے سامنے اپنے منظر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ان دونوں کے طرز گفتگو سے اس خیال کو اور تقویت ہوتی تھی۔ مثلاً بابو صاحب حکیمانہ شان سے پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا کرتے تھے " مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ ایشیا جہالت اور تعصب کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہوگیا ہے اور اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھ رہا ہے۔ قدامت پرستی اور تنگ نظری قصۂ پارینہ ہوگئی ہے، روشن خیالی کا دور دورہ ہے۔ تہذیب و تمدن کا چاند جو مغرب سے طلوع ہوا تھا مشرق کی تاریکی کو آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے۔ اسکی چاندنی کا دریا دو طرف سے بڑھ رہا ہے امریکہ کی طرف سے اور یورپ کی طرف سے اور ظلمت شرق اس سیلاب میں غرق ہوتی جاتی ہے۔ جاپان اس نور سے منور ہو چکا ہے اور چین اب منور ہو رہا ہے۔ ترکی اور مصر اس کی تابانی سے جگمگا اٹھے ہیں۔ ایران، شام اور عراق، وسط ایشیا اور افغانستان کی نظریں اس کی درخشانی سے خیرہ ہو رہی ہیں۔ ہندوستان پر اس کی کرنیں مدت سے پڑ رہی ہیں اور اس کی روشنی سارے ملک میں پھیل چکی ہے لیکن چونکہ یہاں کی فضا میں غیر معمولی تاریکی ہے اس لئے یہ چاندنی ابتک رندھی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اندھیرا چھٹتا جائے گا اور چاند کی روشنی اُجلی ہوتی جائے گی،، مولوی صاحب یہ سنکر تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انکے

چہرے پر عارفانہ جبروت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور انکی زبان یوں شعلہ نشانی کرتی تھی۔ " میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ایشیا یورپ کی تقلید میں آنکھ بند کر کے ہلاکت کے غار میں گرنے کو تیار ہے۔ عقل شیطانی کے غرور میں ڈوبا ہوا، علم انسانی کے نشے میں بدمست وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو پامال کر رہا ہے اور بہائم کی طرح شرم وحیا کی رسیاں تڑا کر ہوائے نفس کے میدان میں بھاگا چلا جاتا ہے۔ کفر والحاد کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے جو ایمان اور عقیدے کے خرمن کو پھونکے ڈالتی ہے۔ اس کی چمک نے جسے نور کہنا نور کی توہین ہے چین وجاپان، روم وروس، ایران افغانستان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ڈالدی ہے اور اسکی آنچ نے سب کے منہ کو جھلس دیا ہے اسکے شعلے ہندوستان میں زمین کے اندر اندر پھیل رہے ہیں اور ایک دن سارے ملک کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ وہ خدا جس نے ابراہیم پر آگ کو گلزار کر دیا تھا اگر چاہے تو اس بدنصیب ملک کو بچا سکتا ہے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ قوت دے سکتا ہے کہ دہریت کی آگ کو اپنے پیروں سے کچل کر بجھا دیں۔"

بابو صاحب یہ سنکر ذہنی تفوق کے احساس سے مسکراتے تھے اور کہتے تھے " دنیا میں جہالت کی قوتیں ہمیشہ مذہب کے نام سے ترقی اور اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی ہیں مگر کبھی کامیاب نہیں ہوتیں مجھے وہ دن نظر آ رہا ہے جب لوگوں کی آنکھوں سے توہمات کے پردے اٹھ گئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ انکے دینی پیشواؤں نے انہیں صدیوں تک گمراہی میں مبتلا رکھا اپنی کوتاہ بینی اور بزدلی سے انہیں خدا کی بہترین نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد یہ فریب خوردہ بھیڑیں شیر بن گئی ہیں اور فریب دینے والوں کو غضبناک تیور سے گھور رہی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے دیکھ کر دل ہلتا ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے زبان کانپتی ہے۔"

اب مولوی صاحب کا چہرہ روحانی طیش سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اور انکی آواز سارے کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھی " روز ازل سے شیطان اور اس کے پیرو ترقی اور اصلاح

کے بہانے سے احکام خداوندی سے سرکشی کرتے آئے ہیں مگر انکا انجام دائمی ذلت اور ابدی ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ میں وہ دن دیکھ رہا ہوں جب لوگوں کے اعمال میزان عدل میں تولے جا رہے ہیں اور انہیں بہ قدر استحقاق جزا و سزا مل رہی ہے، بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹانے والے اپنے دلوں میں نافرمانی اور غرور کا بیج بونے والے کیفر کردار کو پہنچ رہے ہیں۔ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں ایندھن مانگ رہی ہیں۔ اس کے بعد جو آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے اس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور روح لرزتی ہے"

اس نقطے پر پہنچ کر گفتگو عام مباحث سے ہٹ کر ذاتی مسائل پر آجاتی تھی۔ دونوں حضرات بہ تقاضائے دوستی ایک دوسرے کے عیوب اور نقائص گنانے لگتے تھے اور حق گوئی میں اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ حق کی تلخی کام و دہن کے لئے اور اُس کی بو مشام جاں کے لئے نا قابل برداشت ہوجاتی تھی۔

ایک بار جمعے کے دن مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو مارا کیونکہ اس نے نہانے میں دیر کردی اور نماز جمعہ میں شامل نہ ہوسکا اور اتفاق سے بابو صاحب نے بھی اسی دن اسکول دیر میں پہنچنے کے تصور میں اپنے نور عین کی گوشمالی کی۔ سنیچر کے دن صبح کو دونوں لڑکوں نے آپس میں صلاح کرکے ان پدرانہ مظالم کا انتقام اس طرح لیا کہ مولوی صاحب اور بابو صاحب دونوں کی عینکیں خدا جانے کہاں چھپا دیں کہ لاکھ ڈھونڈھا مگر نہ ملیں۔ عینک نہ ہونے سے دونوں کو دن بھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مولوی صاحب لڑکوں سے درسی کتابوں کا آموختہ نہ سن سکے اور انہیں اس پر قناعت کرنا پڑی کہ صرف و نحو کے پیچیدہ مسائل زبانی سمجھائیں اور لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو قمچی سے ان کی تشریح کریں ادھر بابو صاحب کو مسلیں ایک محرر سے پڑھوا کر سننا پڑیں جس میں بہت وقت ضائع ہوا اور جج صاحب کے سامنے کاغذات پر دستخط کرانے وہ اس دن نہ جاسکے۔ شام کو واپسی کے بعد دونوں صاحبوں نے پھر عینکیں تلاش کیں مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ مجبوراً

یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن تعطیل ہے بازار جاکر دوسری عینکیں خرید لائیں گے۔

کھانے کے بعد حسب معمول دونوں حضرات بابو صاحب کی نشست گاہ میں رونق افروز ہوئے اور پھر وہی ہفتہ وار باتیں چھڑ گئیں۔ پہلے تو کچھ یوں ہی سی ردو بدل ہوتی رہی پھر رفتہ رفتہ دونوں گرمانے لگے اور اپنی اپنی جگہہ سنبھل کر بیٹھ گئے بابو صاحب کی نظر فرش پر جم گئی اور انہوں نے چہرے کو فلسفیانہ ساز و سامان سے آراستہ کرکے اسی پرانے انداز میں گفتگو شروع کرنا چاہی مگر خدا جانے عادت کا اثر تھا یا کوئی اس سے زیادہ گہرا بھید کہ پہلا لفظ منہ سے نکالتے ہی بابو صاحب کا رومال والا ہاتھ عینک کو تلاش کرتا ہوا آنکھ تک پہنچا اور جب عینک نہ ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہوگئی انکے ہاتھ پیر کانپنے لگے ان کی زبان رکنے لگی "مجھے یہ نظر آتا ہے ــ مجھے۔ یہ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اندھیرا۔ ہے۔ ہر طرف۔ اندھیرا۔

بابو صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب بھی سراسیمہ ہوگئے۔ انکے کرتے کا دامن اٹھا اور آنکھ کی طرف بڑھا مگر وہاں عینک کہاں تھی۔ ان کی زبان بھی لغزش کرنے لگی "میں یہ دیکھتا ہوں۔ میں۔ یہ۔ دیکھتا۔ میں۔ مجھے۔ کچھ۔ دکھائی۔ نہیں۔ دیتا۔ کچھ۔ ہے۔ مگر۔ خدا۔ جانے۔ کیا۔"

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے (علیگ)

خوبیِ حسنِ یار کی باتیں
سر بہ سر ہیں بہار کی باتیں

مجھکو دیکھا تو ہنس دیا وہ شوخ
اس تغافل شعار کی باتیں

آہ، وہ ابتدائے عشق کے دن
وہ زمانِ بہار کی باتیں

ذکرِ ایامِ کامرانِ وصل
طالعِ سازگار کی باتیں

چشمِ پرشوق کے پیامِ لطف
نگہِ شرمسار کی باتیں

دلِ مرحوم کی اٹھان کی شان
ہائے اس ہونہار کی باتیں

اب نہ دل ہے نہ دل میں سوز نہ ساز
نہ وہ اس دل فگار کی باتیں

چپ لگے اس کو ایک سال ہوا
ہیں یہ پچھلی بہار کی باتیں

اب نہیں ہے بہار، اب نہ کرو
اس خزاں میں بہار کی باتیں

بے رخی کا کسے یقیں ہو جلیل
یاد ہیں اس کے پیار کی باتیں

شذرات

پچھلے مہینے متعدد قومی اخباروں اور رسالوں میں "عربوں کا تمدن" مورد اعتراض قرار پایا۔ ہم نے مولانا محمد علی صاحب، مولنا ابوالکلام صاحب اور علامہ اقبال سے مشورہ کیا۔ تینوں حضرات نے یہ رائے دی کہ مصنف کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں پر جو تردیدی نوٹ مترجم نے لکھے ہیں وہ کافی مفصل اور مدلل نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ گہری تنقید کی ضرورت ہے۔ جناب شیخ الجامعہ حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں ان کی خدمت میں یہ روداد پیش کی گئی۔ انہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی واپسی پر جو بہت جلد ہونیوالی ہے۔ ہمدردان جامعہ کی شکایت کے رفع کرنیکا معقول انتظام فرمائیں گے۔ ممدوح کی طرف سے اس کا اعلان اس رسالے کے چھپنے سے پہلے اخبارات میں شائع ہو جائے گا۔

۳۰ر نومبر کو الہ آباد یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں سر مالکم ہیلی گورنر صوبجات متحدہ نے ایک مختصر مگر پر مغز خطبہ صدارت پڑھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی اور مشرقی تمدنوں کا امتزاج ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اسکا فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا یہ ملک یورپ کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور علمی نظاموں کو اختیار کر کے ان میں اپنی ضروریات کے مطابق تصرف کرے گا یا اپنی زندگی کی بنیاد اپنی قدیم روایات پر رکھے گا اور مغربی تہذیب سے محض وہ عناصر لے گا جو مشرقی تہذیب میں کھپ سکیں۔ موصوف نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستانی رہنمایان ملت آج اور کل کی فکر میں دور و دراز مستقبل کی طرف سے غافل ہیں اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ جذبات کے جوش سے دل کو خالی کر کے حکیمانہ بے تعلقی سے ان مسائل پر غور کریں اور اس غور کا جو نتیجہ نکلے اُسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ موصوف نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ خود اور دوسرے

انگریز بڑے خلوص اور گرمجوشی سے اس دن کے منتظر ہیں جب ہندوستان راہ ترقی کے دشوار مرحلوں سے گذر کر منزل مقصود تک پہنچ جائے

سرمالکم نے جن مسائل کیطرف توجہ دلائی ہے انکی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہندوستان ایشیا کے اور سب ملکوں کی طرح مشرق و مغرب کے تمدنوں کا جولانگاہ ہے اور اگر اس نے ان دونوں میں مصالحت کی کوشش نہ کی تو انکے آپس میں ٹکرانے سے اس کے پس جانے کا اندیشہ ہے لیکن موصوف کی فلسفیانہ وسعت نظر سے تعجب ہے کہ انہیں وہ مجبوریاں نظر نہیں آئیں جو ہندوستان کو اپنے مستقبل پر غور کرنے میں پیش آرہی ہیں۔ جب ایک ملک اپنی زندگی کے تمام اہم مسائل میں اپنے حکمرانوں کی مرضی کا پابند ہے تو وہ کس بنیاد پر اپنی آئندہ نشوونما کا اندازہ کرے اور کس برتے پر اس کی تشکیل کی تدابیر سوچے۔ جب تک وہ قوت جو دریا کی دھار کو موڑ سکتی ہے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اس کے بہاؤ کا رُخ پہلے سے کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہی احساس ہے جس کی بدولت اکثر ارباب فکر اور ارباب عمل جو واقعی ملک و قوم سے محبت رکھتے ہیں دوسرے کام چھوڑ کر سیاسی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور بعض عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کے ذریعے ملک سے افلاس و جہالت کو دور کرنے کی دھن میں ہیں۔

سرمالکم کی نصیحت سن کر اکبر مرحوم کا ایک شعر یاد آتا ہے

غنیمت ہو شب فرقت کی فرصت   رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

مگر اکبر مرحوم خوب جانتے تھے کہ شب فرقت میں جو کرب اور بےچینی ہوتی ہے اس میں سوائے اختر شماری کے اور کسی قسم کی علمی تحقیقات ممکن نہیں۔ سرمالکم بھی اسے خوب سمجھتے ہیں لیکن ان کی حکمت عملی کا یہی تقاضا ہے کہ ملک کی توجہ کو جس طرح ممکن ہو آزادی کی تحریک سے

ہٹاکر کسی اور طرف لگائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو ہندوستانی حضرات ایسے موقعوں پر خطبات صدارت ارشاد فرماتے ہیں وہ بھی اپنے آقا کی آواز کو دہرایا کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے قومی تحریک پر چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

سر مالکم کی زبان سے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ انگریزوں کو بھی ہماری بہبود و ترقی سے دلچسپی ہے اور وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سفر کی کڑیاں جھیل کر منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہمدرد ترقی کسے کہتے ہیں اور منزل مقصود سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر گول میز کانفرنس جس کا آج ہر طرف شہرہ ہے کبھی منعقد ہوئی تو یہ راز بھی غالباً کھل جائیگا۔

بے اعتمادی بھی عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہم سے کہتا کہ وقتی جھگڑوں میں زیادہ نہ الجھو بلکہ ابدی مسائل کیطرف توجہ کرو یا سیاسی اور اقتصادی آزادی پر زیادہ زور نہ دو بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی کی کوشش کرو تو ہم اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے لیکن سر مالکم کی زبان سے یہ باتیں سن کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں لامکان ولا زمان کا خواب اس لئے تو نہیں دکھاتے ہیں کہ زمان و مکان کو اپنے لئے محفوظ کرلیں، کہیں موصوف کی یہ کشادہ دلی اس بڑے بھائی کی فیاضی تو نہیں ہے جس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آں من
از سقف بام تا بہ ثریا از آں تو

The Cultural Side of Islam

Madras Lecture on Islam

(No. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1929

———o———
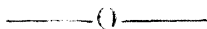
CONTENTS.

Price-/8/-
Bound-/12/-

Tobe had of:--

National Muslim University Book Depot,

KAROL BAGH

DELHI.

نمبر ۱۸۵۲

رجسٹرڈ

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۳

بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر ۶

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi

1927
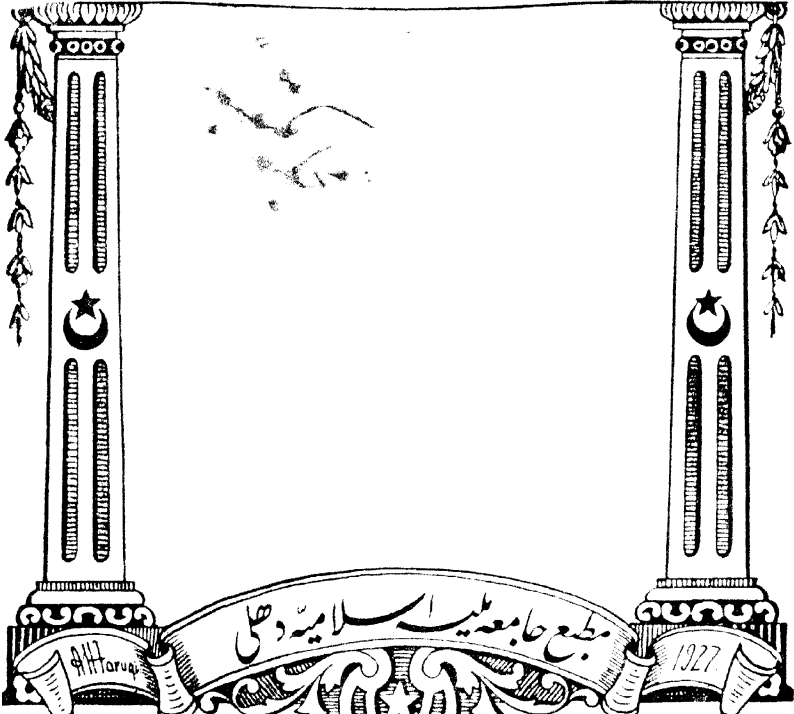
زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲ (بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء) نمبر ۶

فہرست مضامین

مسئلہ قضا و قدر

تعلیم یافتہ اور باخبر مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سید جمال الدین افغانی، اور اُنکے زندہ کارناموں سے واقف نہ ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ سید صاحب موصوف اپنے مذہب و ملت کے کیسے سچے فدائی، غم خوار اور مسلمانوں کے کتنے بڑے محسن تھے۔

یہ مضمون انہیں کے پرزور، حقیقت شناس قلم اور حساس فکر کا نتیجہ ہے جسے محمد فواد منقارہ طرابلسی نے جو جامعہ ازہر مصر کے متعلم تھے سنہ ۱۳۴۱ھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک رسالے کی صورت میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے نشر و اشاعت کا فخر مصر کے مشہور مطبعۃ المنار نے حاصل کیا، چونکہ غرض اس کی اشاعت سے ناشر کی ہے، اسی نے مجھے بھی اس کی اشاعت پر آمادہ کیا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی بد قسمتی سے قسمت اور تقدیر کے معنی نہایت ہی غلط سمجھ رکھے ہیں۔

علامہ سید افغانی (رح) نے مسئلہ قضا و قدر کے ذیل میں جن حکیمانہ باتوں کو حوالہ قلم کیا ہے کہ ہر متنفس مسلمان بلکہ ہر مشرقی شخص کا ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مولنا کے زور قلم کی داد نہ دینا بھی انصاف کا خون کرنا ہے۔

محوی

اپنی مخلوقات میں خدائے تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انسان کے دلی عقائد کا جسمانی اعمال پر زبردست اثر ہوتا ہے یعنی افعال میں جو کچھ برائی یا بھلائی ہوتی ہے اُسکا اصل سرچشمہ عقیدے کی عمدگی یا خرابی ہے۔ اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عقیدہ انسان کے تمام خیالات پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ دوسرے عقائد اور معلومات بھی اسی کے تابع بن جاتے ہیں اور انسان کے تمام اعضا اور جوارح سے اسی عقیدے کے موافق ایسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں

جس کا اثر نفس انسانی پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر خواہ کیسا ہی مفید اور بہتر اصول پیش کیا جائے کیسی ہی بہتری کی بات بتائی جائے، خواہ وہ تعلیمی ہو یا تبلیغ مذہب کے لئے لیکن وہ اسے قبول کرنے میں تامل کرتا ہے اور اس کی بھلائی میں شبہ کرتا ہے۔ اور یہ شبہ بدستور اسے اصل عقیدے کے بالکل منافی اعمال میں مبتلا رکھتا ہے، اصل عقیدے کی ظاہری و معنوی صورت بدل جاتی ہے اور اپنی غلط فہمی یا خبث استعداد کی بدولت اُن سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ ان کا معتقد تو ہو گیا مگر یہ نہیں جانتا کہ اس کے غلط اور گمراہ کن اعتقاد نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ ظواہر کا فریب خوردہ انسان سمجھتا ہے کہ میرے تمام اعمال اُس مبارک اور سچے اعتقاد کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کے انحراف عقیدہ سے مذاہب و ادیان کے بعض اصولی اعتقادات میں تحریف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً کیا بلکہ یقیناً یہی چیز ہر مذہب میں بدعت و گمراہی کی اصلی علت ہے۔ اکثر و بیشتر یہی انحراف عقیدہ اور اس کے توابع دوسری بدعتیں انسانی طبائع کی بربادی اور اُن سے بدترین اعمال کے ظہور کا سبب ہو جاتی ہیں۔ خدا جسے اس نامبارک بلا میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بلا اُسے ہلاکت و تباہی تک پہنچا دیتی ہے، اور یہ انسان کا بدترین مآل کار ہے "اللہم احفظنا"۔ یہی چیز اُن لوگوں کو جو اصل راز سے بے خبر ہیں ایک سچے اور پاک مذہب پر لعن طعن کی زبان کھولنے اور صحیح و حق عقیدے پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس لعن و طعن کی بنیاد زیادہ تر اُن سادہ لوحوں کے اعمال ہوتے ہیں جو اس دین کے نام لیوا ہوتے ہیں۔

اسی قسم کے عقائد میں سے ایک عقیدہ قضا و قدر بھی ہے جو اسلام کے سچے اور حق مذہب کے اصولی عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت سے یوربین غفلت کیش نکتہ چینوں نے چیخ پکار مچائی ہے اور بہت خیال آرائیاں کیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ جس قوم کے افراد میں یہ عقیدہ متمکن ہو گیا ہے اس نے ساری قوم کی ہمت و قوت سلب کر لی ہے۔ اور ان میں ضعف و انحطاط پیدا کر دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس قسم کی بہت سی صفتوں سے

منسوب کرکے نشانہ ملامت اور ہدف ذلت بناتے ہیں، اور اُس کی علت غائی عقیدۂ قضا و قدر کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ وہ دنیا کی تمام قوموں سے جنگی اور سیاسی قوتوں میں پیچھے ہیں۔ ان میں کثرت سے اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ جھوٹ بولنا، باہمی نفاق، بدعہدی و خیانت۔ ایک دوسرے پر حسد، اور بغض و کینہ۔ ان کا شیرازہ اتحاد منتشر ہوچکا ہے۔ وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بالکل بے خبر ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کیا چیز اُن کے لئے مفید اور کیا ضرر رساں ہے۔ وہ ایسی زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کا خیال بھی کبھی اپنے دلوں میں نہیں لاتے۔ البتہ جب کبھی کوئی مسلمان اپنے کسی مذہبی بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ و قادر ہوتا ہے تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اُن کا خوف و رعب آپس ہی میں ایک دوسرے پر مسلط ہے۔ اور اُن کی قوتیں باہم صرف ہو رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری بیدار قومیں لقمہ لقمہ کرکے ان کو چباتی ہیں اور نگلتی جا رہی ہیں۔ مگر وہ ہر پیش آنے والی مصیبت پر راضی اور ہر حادثے کو انگیز کرنے پر آمادہ ہیں، وہ اپنے مکانوں کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں نہایت سکون کے ساتھ رہتے ہیں صبح اپنی چراگاہوں میں جاتے ہیں اور شام کو اپنے دارالامن (گھروں) میں پلٹ کر آتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی کا معیار ہے اور بس۔

مسلمان امرا، دولت کے نشہ میں مست ہیں، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی عزیز زندگی کی منزلیں آرام سے قطع کر رہے ہیں، حالانکہ اُنکے لئے اور بھی بہت سے فرائض ہیں، جن کے ادا کرنے میں انہیں اپنی عمریں صرف کردینی چاہئیں۔ مگر یہ ان فرائض کا ادنٰے حصہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اپنی عزیز دولت کو صرف اُن چیزوں پر اٹھاتے ہیں جن میں اپنی حیات کے عزیز لمحات کاٹ رہے ہیں، وہ بھی نہایت فضول خرچی و بے دردی کے ساتھ۔ اُن کے مصارف نہایت وسیع ہیں، مگر مصارف کے ذیل میں کوئی ایسی مد نہیں

جس کا نفع قوم وملت کو پہنچتا ہو۔ اپنے ذاتی مصالح اور فوائد پر وہ عمومی مصلحتوں اور فائدوں کو بیکار جانکر نہایت بے دردی سے قربان کر دیتے ہیں۔ ان سے نفرت کرتے اور پس پشت ڈالتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات دو امیروں کا باہمی تنافر پوری قوم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک امیر دوسرے کو خوشی سے برباد کرتا ہے اور اس پر اسکی کسی ہمسایہ حکومت کو مسلط کر کے مسرور ومطمئن ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک اجنبی حکومت محسوس کر لیتی ہے کہ ان میں ایک فانی قوت اور ضعف قاتل پیدا ہو گیا ہے تو دونوں امیروں کے مقبوضات سے اتنا حصہ ملک خود ہڑپ کر لیتی ہے جن سے بظاہر اُن کو کوئی تکلیف وتکلف نہ ہو۔ مسلمانوں میں خوف ورعب عام طور پر پھیل گیا ہے۔ بزدلی وکاہلی اُن پر چھا گئی ہے، وہ ہنگامے سے گھبراتے ہیں۔ ذرا سی مصیبت سے چیخ اٹھتے ہیں۔ دوسری قوموں اور حکومتوں کو جو شوکت وقوت حاصل ہے اُسے خود حاصل کرنے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس باب میں وہ کھلم کھلا غلطی پر ہیں وہ اپنے احکام دین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ اپنی ہمسایہ قوموں کے اقدام کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ جو قومیں اُنکے اقتدار واثر میں تھیں وہ بھی اُن سے آگے نکل گئی ہیں اور اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے پر بجا طور پر فخر کر رہی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی دشمن دست درازی کرتا ہے تو دوسرے ملک کے عاقل مسلمان اُن کی مصائب کو دور یا کم کرنے میں بالکل حصہ نہیں لیتے۔ نہ اُس مظلوم کی امداد کے لئے اٹھتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی ملکی وملی انجمنوں کا وجود نہیں ہے نہ ایسی خفیہ یا علانیہ مجلسیں ہیں جن کے مقاصد میں یہ باتیں داخل ہوں: ۔ مذہبی غیرت اور جوش کو زندہ کرنا، قومی حمیت کے جذبے کو ابھارنا۔ کمزوروں کی دستگیری کرنا، غربا، اور کمزوروں کے حقوق کو طاقتوروں اور سرکشوں کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دینا۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ...... وغیرہ وغیرہ ؎

غرض ایسی بہت سی باتوں سے ارباب مغرب مسلمانوں کو متصف کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی

کہتے ہیں کہ اس کا سبب اصلی اور حقیقی سرچشمہ مسلمانوں کا عقیدۂ قضا و قدر ہے یعنی وہ اپنے تمام اہم مقاصد اور معاملات کو قدرت خداوندی کے سپرد کر دینا،، ان لوگوں کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان اس عقیدے پر یونہیں ہمیشہ قائم رہے تو ایک دن دنیا میں اُنکا کوئی مرکز و مرتبہ نہ رہے گا۔ اور نہ وہ کبھی عزت کے اعلیٰ مدارج پر قائم ہو سکتے، نہ اپنے حقوق پا سکتے، نہ دوسروں کے مظالم اور حقوق کی پامالی کو دور کر سکتے نہ اپنے کسی بادشاہ کی حمایت کے لئے اٹھ سکتے بلکہ برابر اُن کا قومی زوال بڑھتا اور اُن کے نفوس میں گھن کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔ اُن کے دلوں کو پیچھے ہٹاتا رہے گا۔ یہانتک کہ اُن کو منتہائے فنا تک پہنچا دے گا۔ (معاذ اللہ خدانخواستہ) خود اُن میں سے ایک دوسرے کو اپنی ذاتی خصومتوں کی بدولت ہلاک کرے گا۔ اور جو کچھ اُس کے ہاتھوں سے بچ رہے گا اُسے اغیار جھپٹ لیں گے۔

دانایان مغرب کا یہ خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ عقیدۂ قضا و قدر، اور عقیدۂ جبریہ میں (جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال میں مجبور محض ہے) کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان اس عقیدۂ تقدیر کی بنیاد پر بالکل اُس تنکے کے مانند ہیں جو ہوا میں معلق ہو۔ ہوا اُسے جھکولے دیتی رہتی ہے اور جدھر چاہتی ہے جھکا دیتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اُس کو قول، فعل، حرکت، سکون، غرض کسی میں بھی کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ وہ مجبور محض ہے، اور یہ سب ایک زبردست طاقت، ایک قوی قدرت کے ہاتھ میں ہے تو یقیناً اس قوم کے تمام قوے بالکل معطل اور بیکار ہو جائیں گے اور خدائے تعالیٰ نے مدارج اور عقل انسانی کا جو حصہ انہیں دیا ہے وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ اُن کے دلوں سے سعی و عمل کا پاک جذبہ فنا ہو جائے گا۔ اس صورت میں تو ایسی قوم کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ اس عالم وجود سے ہمیشہ کے لئے سیدھا عالم عدم کا رستہ لے۔

یورپ ہی کے ایک گروہ کا یہ خیال خام اور ذوق فاسد نہیں بلکہ بہت سے ضعیف العقول مشرقی بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں، مگر میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتا کہ یہ

گمان بالکل جھوٹ ہو، یہ خیال سرتاپا غلطی پر مبنی ہے، اور یہ وہم تمامتر باطل و بے سروپا ہے۔ یہ گروہ خدائے پاک اور تمام مسلمانوں پر افترا کرتا اور جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک متنفس بھی، شیعہ، سنی، زیدی، اسماعیلی، وہابی یا خارجی ایسا نہیں جو محض جبر کا قائل ہو۔ اور اپنے کو بالکل غیر مختار جانتا ہو۔ بلکہ ان تمام اسلامی فرقوں میں ہر ایک کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمیں اپنے اعمال میں یقیناً اختیار کا بھی ایک جز حاصل ہو۔ اور اس فرد کو وہ "کسب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے۔ ان سب کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ خدا نے جتنا اختیار کا حصہ دیا ہے، اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اُن سے تمام خداوندی احکام کی بجا آوری اور ممنوعات ربانی سے بچنے کا مطالبہ ہوگا۔ یہی اوامر و نواہی دراصل فلاح و خیر کی جانب انسان کو لیجانے والے ہیں اور یہی ہر بہبودی کی طرف راہ نما ہیں۔ اختیار کی یہی وہ قسم ہے جسے تکلیفات شرعیہ کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اور اس پر حکمت و نصفتِ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہاں، بیشک، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جسے "جبریہ" کہتے ہیں۔ اُس کا یہ مسلک تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال میں ایسا مجبور ہے کہ اُسے اختیار کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کھانے اور چبانے کے لئے اپنے جبڑوں کو جو حرکت دیتا ہے، شدت سردی سے کپکپاتا ہے، اس میں بھی مجبور محض ہے مگر عام مسلمان اسے "لاادریہ" کے جاہلانہ اور فاسدانہ نزاعات میں شمار کرتے ہیں۔ اس عقیدے کے قائل چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے، اُن کا نام و نشان تک آج صفحۂ ہستی پر باقی نہیں۔ "عقیدۂ قضا و قدر" بعینہٖ "عقیدۂ جبر" ہرگز نہیں ہے۔ اور نہ اس عقیدے کے وہ نتائج اور مقتضیات ہیں جو یہ مغربی وہمی اور خیالی پلاؤ پکانے والے سمجھے ہوئے ہیں۔

اب رہا "عقیدۂ تقدیر" اس کی تائید ایک زبردست دلیل سے ہوتی ہے۔ بلکہ خود فطرت اس کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ جس کو غور و فکر کا مادہ قدرت نے دیا ہے۔

اس کے لئے یہ کچھ دشوار نہیں کہ ہر پیش آنے والی چیز کی طرف ایک نگاہ ڈالے اور ذرا التفات سے کام لیکر یہ سمجھے کہ ہر پیش آنیوالی چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، جو دنیا میں اُس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ غور و فکر کرنے والا اس سلسلۂ اسباب میں انہیں اسباب کو دیکھ سکتا ہے جو خود اُس کے پیش نظر ہوں۔ اور ان کے ماضیات کو اُس خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا جو خود اس کے نظام کو عدم سے وجود میں لانیوالا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک سبب کا اپنے آگے آنے والے واقعات میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ خود خدائے عزیز و علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ انسانی ارادہ اس سلسلہ کی کڑیوں میں سے صرف ایک کڑی ہے۔ یہ ارادہ بھی آثار و ادراک کا ایک نشان و اثر ہے اور ادراک کیا چیز ہے؟ نفسانی خواہشات کا علم جو حواس اور شعور پر صادر ہوتی ہیں اور جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں اُن سے نفس کی اثر پذیری کائنات کے ظاہری حالات کو ارادہ و فکر پر جو قدرت و تسلط حاصل ہے اُس سے کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقلمند آدمی! ۔ جن اثرات کو تم مظاہر میں موثر دیکھتے ہو۔ ان سب کا مبدا اُس کائنات کے مدبر اعظم کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے تمام اشیاء کو اپنی حکمت و مصلحت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ اور ہر نو پیدا کو اپنی ہی بہیے کا تابع بنایا ہے۔ گویا وہ اس کا ایک بدل ہے۔ خاصکر عالم انسانی میں۔

اگر ہم فرض کرلیں کہ ایک جاہل ایسے معبود کے ماننے سے منکر ہے جو اس عالم کا بنانے اور ایجاد کرنے والا ہے، پھر بھی اُس کے امکان سے یہ باہر ہے کہ بشری ارادوں میں حوادث زمانی اور موثرات طبعی کی تاثیر کو ماننے سے وہ پہلو تہی کرے۔ کیا کسی انسان کے امکان میں یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا کے اس قانون و قاعدے سے الگ رکھ سکے۔ جو اس کی مخلوق میں جاری اور نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے تمام طالبان حق و صداقت مانتے ہیں۔ واصلین کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

اس کے علاوہ یورپ کے بعض فلاسفہ اور علمائے سیاست خود قضا و قدر کی طاقت و سطوت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے بہت تفصیل سے اثبات

قضاو قدر پر اپنے بیانات و مضامین میں کام لیا ہے۔ مگر ہمیں اُن کی آرا، وافکار سے سند و شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہو۔

تاریخ کے لئے روایت سے بالا تر ایک علم اور ہے۔ جس کی طرف ہر قوم وملت کے علمار نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو قوموں کے عروج و زوال، انحطاط واقبال کے باب میں اُن کی اخلاق وسیرت سے بحث کرتا ہے، اور اہم ترین حوادث کے عام وخاص وجوہ، اصلی راز و خصائص سے پتا چلاتا ہے کہ اُن کے عادات او رخیالات کیا ہوں گے۔

اس کے تابع قوموں کے نشوو ارتقا اور نئی حکومتوں کا وجود میں آنا۔ یا بعض قوموں کا فنا ہونا، کہنہ وفرسودہ ہونا، غرض کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں۔ کیا کیا صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہم اور بلحاظ فائدہ سب سے بالا تر قرار دیا ہے۔ اس علم کی بنیاد بحث عقیدۂ قضاؤ قدر پر ہے اور اس یقین وایمان پر کہ تمام بشری طاقتیں، مدبر کائنات (باری تعالیٰ) ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جو کائنات کا منتظم اور واقعات وحادثات کو عمل میں لانے والا ہے اور اگر قدرت بشری بلحاظ اثراندازی کچھ قادر و موثر ہوتی تو نہ کوئی بلند مرتبہ آدمی زوال کا شکار ہوتا۔ نہ کوئی ضعیف وکمزور طاقت ور ہوسکتا نہ کوئی اپنے مرتبے سے گرتا اور نہ کسی سلطنت و سطوت کا بھی خاتمہ ہوتا۔

قضاو قدر کا مسئلہ اگر جبر محض کی بد اثری سے الگ ہو تو یہ حقیقت ہی کہ اس کے ساتھ ہی جرأت و اقدام کی صفت اور بہادری ودلاوری کی خصلت ظہور میں آتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ہلاکت آفریں معاملات میں گھس پڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ وہ معاملات جن سے بڑے بڑے شیروں کے دل لرزتے اور جن سے دلاور چیتوں کے پتے پانی ہوجاتے ہیں۔ یہی اعتقاد نفوس انسانی کو ثبات کا خوگر، مصائب کی برداشت کا عادی، اور ہولناک مہمات میں کود پڑنے کا متحمل بنا دیتا ہے۔ انسان کو سخاوت ودریا دلی کے نفیس زیوروں سے آراستہ کردیتا ہے۔ ہر اُس چیز پر آمادہ کردیتا ہے۔ جو آدمی پر گراں ہوسکتی ہے بلکہ انہیں اپنی جانیں فدا کر ڈالنے، شادابی

حیات سے کنارہ کش ہوجانے تک پر بخوشی تیار کر دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حق و انصاف کی راہ میں صرف اُسکا عقیدۂ قضاؤ قدر ہی آمادہ کرتا ہے۔

جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زندگی محدود ہے۔ رزق مقرر ہے۔ تمام اشیاء اور اُن کا نظام خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے تصرف میں لاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا آدمی حق و صداقت کے لئے مدافعت کرنے میں موت کی کیا پروا کرسکتا ہے، اپنی قوم و ملت کا بول بالا ہونے نیز خدا نے جو فرض اُس پر عائد کیا ہے اُس کے بجالانے میں موت سے کیا ڈر سکتا ہے۔ اپنے عزیز مال و دولت کو حمایتِ حق، اور اپنے مجد و شرف کے استحکام میں صرف کرنے پر، اور وہ بھی اوامر خداوندی کے بموجب، نیز انسانی تمدن و اجتماع کے موافق، وہ تنگ دستی و فقر کے خوف سے کیا اثر پذیر ہوسکتا ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے اس عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں کی تعریف کی اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے:۔

الذین قالوا ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم
فزادہم ایماناً وَ قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ہ
فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضلٍ لم یمسسہم سوءٌ
واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ہ

مسلمانوں نے اپنی نشأت اولین میں اقطار عالم کی طرف پیش قدمی کی اُن کو فتح و تسخیر کرتے، اور اُن پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ قائم کرتے چلے گئے۔ اس شان سے کہ انسانی عقلیں محو تعجب رہ گئیں اور فہم و خرد سراپا تصویر تھی۔ یہ دیکھکر کہ بڑی بڑی با جبروت حکومتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور زبردست قوموں کو مغلوب کرلیا۔ اُن کی حکومت کا سکہ برنیز کے پہاڑوں سے، جو اسپانیا اور فرانس کے درمیان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوار چین تک رائج ہوگیا باوجودیکہ اُن کی تعداد قلیل تھی اور مختلف آب و ہوا کے خوگر، رنگا رنگ ممالک کے موسمی اثرات کے

عادی نہ تھے۔ بڑے بڑے گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑ وادیں۔ پرشوکت قیصروں اور کسراؤں کو مجبور و مقہور کر دیا۔ اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں جو اسّی سال سے زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ حقیقت میں یہ چیز خوارق عادات، اہم ترین معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ یہ مافوق الفطرت ہے۔ مسلمانوں نے بڑے بڑے ممالک کو زیرنگیں کیا۔ سربفلک دھسوں اور ٹیلوں کو ملیامیٹ کر دیا، زمین کے اس ساتویں طبقے پر جنگی گرد وغبار سے ایک آٹھواں طبقہ اور کھڑا کر دیا۔ انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اور اُن کی جگہ اُن کی سطوت کے خلاف سر اٹھانے والوں کے سروں سے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کر دیئے ہر دل کو لرزا دیا۔ اور ہر شانے کو پھڑکا دیا۔ دیکھو تو ان کو ان مہموں میں آگے بڑھانے والا عقیدۂ قضا و قدر کے سوا کون تھا۔

یہ اعتقاد ہی وہ زبردست قوت ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے قدم اُن جرار لشکروں کے سامنے جمے رہے اور نہ ڈگے۔ جن سے قضائے الٰہی برہم تھی۔ اور یہ بسیط ارض ان پر تنگ ہوگیا تھا۔ پس ان جاں باز ٹکڑیوں نے دشمنوں کو اُنکے مرکزوں سے ہٹا دیا۔ اور پیچھے پاؤں لوٹا دیا۔

اسی اعتقاد کی بدولت مشرق میں اُن کی خارا شگاف تلواریں چمکیں اور اُنکے جہاں سوز شعلوں نے جنگ کی آندھیوں میں مغرب کے برگشتہ نصیبوں کو خاک کر دیا۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں کو اپنی دولت اموال لٹا دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ اور اپنی تمام املاک کو محض اپنی قومی حکومت کے اعلائے کلمہ (بول بولا) کے لئے خرچ کر کے نہ وہ فاقے سے ڈرتے تھے۔ نہ فقر کے اندیشے سے سراسیمہ و پریشان ہوتے تھے۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں پر یہ اثر کیا کہ وہ اپنی بیویوں، بچوں، اور جو کچھ اُن کی گودوں میں تھا۔ سب کو جدال و قتال کے میدانوں میں لیکر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہ بھی دنیا کے بالکل آخری سرے تک اور اس طرح جیسے سیر و تفریح کے لئے باغوں کو جا رہے ہیں، گویا وہ اپنی جانوں کا ہر آفت و بلا سے خدا کے

بھروسہ کا بیمہ کرا چکے تھے۔ اور اپنی عزیز جانوں کے گرد انہوں نے خدا پر اعتماد کا ایک مضبوط حصار تیار کر لیا تھا۔ وہ حصار حوادث کی آنے والی تاریکیوں میں آنے والی مصیبت سے اُن کو، اُن کے بچوں، اور بیویوں کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہ بیوی، بچے جنہیں یہ مٹھی بھر مسلمان اپنی فوج ظفر موج کو پانی پلانے اور دیگر مایحتاج کی فراہمی وخدمت پر مامور کرتے تھے۔ ان معرکوں میں عورتیں اور بچے جوانوں اور بوڑھوں سے الگ نہیں رہتے تھے۔ نہ اُن میں کوئی مابہ الامتیاز فرق رکھا جاتا تھا۔ نہ عورتوں پر کوئی خوف طاری ہوتا تھا۔ نہ بچوں پر کوئی خطرہ کی حالت یہی وہ اعتقاد تھا جس نے مسلمانوں کو اس حد پر پہنچا دیا تھا کہ اُن کا نام لینا دلوں کو دہلا دیتا تھا۔ اور جگر کے ٹکڑوں کو پراگندہ کر دیتا تھا۔ یہانتک کہ وہ صرف رعب سے فتح حاصل کر لیتے تھے اور اپنے دشمنوں کے دلوں کو نشانہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ وہ محض اپنی سپاہ رعب وسطوت سے دشمنوں کو شکست دیدیتے تھے۔ قبل اس کے کہ دشمن اُن کی تلواروں کی بجلیوں کو کوندتا ہوا دیکھیں۔ اور اُن کے بھالوں، برچھیوں اور نیزوں کی تڑپ اور چمک کا روح فرسا نظارہ کریں بلکہ اس سے بھی پہلے کہ دشمنوں کے حدود میں مسلمانوں کے لشکر پہنچیں۔

میں روتا ہوں اُن بزرگوں پر اور نوحہ و ماتم کرتا ہوں ان اسلاف پر۔ کہاں ہو تم اے حزب اللہ؟ کہاں ہو تم اے انصار اللہ! کہاں ہو تم اے بہادری اور دلاوری کے اٹل جھنڈو! کہاں ہو تم! اے قوت وشوکت کے بلند ستونو؟ کہاں ہو تم اے شرفاء کی اولاد امجاد؟ اور مصیبت کے وقتوں میں مظلوموں کے فریاد کو پہنچنے والو؟! کہاں ہو تم اے

خیر اُمّۃٍ اخرجت للناس تأمرون
بالمعروف وتنہون عن المنکر؟

کہاں ہو تم اے شرفاء ومعزز لوگو؟! اے عدل وانصاف کے علم بردارو! اے مساوات کے قائم کرنے والو! اے حکمت کی بات بولنے والو! اے امت کی بنیاد رکھنے اور مضبوط کرنے والو! تم اپنی قبروں کے شگافوں سے کیا نہیں دیکھتے کہ تمہارے خلف کس درجہ کو پہنچ گئے ہیں؟ اور تمہاری

اولاد کس مصیبت کا شکار ہے ؟ تمہارے لگائے ہوئے پودے میں کیا گھن لگ رہا ہے ؟ آہ !
یہ تمہارے نقوش قدم سے ہٹ گئے ، یہ تمہارے طریقوں سے دور ہو گئے ، تمہارے راستے سے
الگ جا پڑے ہیں ، ٹکڑیاں ٹکڑیاں ہو گئے ہیں ، ضعف و انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے ہیں ۔
اُن پر افسوس و تاسف سے دل پانی پانی ، رنج و حزن سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے
ہیں ۔ وہ آج غیر قوموں کے شکار ہیں ۔ آج اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اپنے دائرہ حکومت سے
مدافعت کر سکیں ۔ دشمنوں کو اپنے احاطۂ مملکت سے باہر نکال سکیں ۔ کیا تمہارے برزخوں میں
کوئی اتنا پکار کر کہنے والا نہیں جو غافلوں کو ہشیار اور سوتوں کو بیدار کرے ۔ گمراہوں کو سیدھا
راستہ بتائیے ۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

میں کہتا ہوں ، اور کسی ایسے خام خیال سے نہیں ڈرتا جو مجھ سے میرے اس قول میں
بحث کرے ، کہ انسانی تمدن و اجتماع کے آغاز تاریخ سے آجتک کوئی ایسا زبردست فاتح
نہیں پایا جاتا ۔ اور نہ ایسا جنگجو گزرا جو متوسط طبقے میں پیدا ہوا ہو ۔ اور محض اپنی ہمت سے ترقی
کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا ہو ۔ کہ بڑے بڑے سورما اُس کے آگے جھک گئے ہوں اور
گردنیں اُس کے آگے خم ہو گئی ہوں ۔ اُس نے ملک و حکومت کو اتنا وسیع کر لیا ہو کہ موجب حیرت
ہو ۔ اور اپنی فکر کو حصول منافع کے لئے انتہائی حد تک جولانی دی ہو ۔ مگر یہ کہ وہ قضا و قدر کا
ضرور قائل ہوگا " سبحان اللہ " انسان اپنی زندگی پر حریص ہے ، وہ فطرت و جبلت کے موافق
اپنے کو زندہ و برقرار رکھنے کا آرزومند ہے ، پھر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو اُس کے لئے ہولناکیوں
میں گھس پڑنے ، اور خطرناک مہموں میں در آنے ، موت و فنا سے دو بدو مقابلہ کرنے کو آسان کر دے ۔
اور کچھ نہیں صرف یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے ۔ اور دل کو اس اعتقاد پر ثابت رکھنا ! ۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کورش فارسی (کے خسرو) جو تاریخ قدیم میں دنیا کا پہلا فاتح تھا ۔
اُس کے وسیع ترین فتوحات کے سلسلے کو جس چیز نے جاری رکھا وہ یہی قضا و قدر کا اعتقاد تھا ۔
اس اعتقاد کی وجہ سے کوئی خطرہ اُسے ہراساں اور کوئی مصیبت اس کے عزم کو سست نہیں

کرتی تھی۔ یونان کا اسکندر اعظم بھی انہیں لوگوں میں تھا جن کے دلوں میں یہ عقیدۂ جلیلہ راسخ تھا چنگیز خاں تاتاری، صاحب فتوحات مشہورہ بھی اس عقیدے کے لوگوں میں تھا۔ بلکہ نپولین اول بوناپارٹ (فرانسیسی) قضا وقدر پر سب سے زیادہ اعتماد رکھنے والا سردار تھا۔ یہی عقیدہ تو تھا جو اُس کے مختصر سے لشکر کو ایک ٹڈی دل پر بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا۔ اُس کے فتح ونصرت کے سامان پیدا کر رہا تھا، اور وہ حسب آرزو فتح حاصل کرتا چلا جاتا تھا۔

پس کیا اچھا اعتقاد ہے وہ، جو نفوس انسانی کو نامردی و بزدلی کی کثافت سے پاک کرے۔ وہ بزدلی جو اپنے مبتلا کو اس کے طبقے میں درجۂ کمال پر پہنچنے سے سب سے پہلا مانع ہو۔ ہاں! بیشک! میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ اس عقیدے کو بعض عوام مسلمانوں کے دلوں میں عقیدۂ جبر کے شائبوں سے مخلوط کر دیا ہے۔ اور یہی خلط ملط بعض مصائب میں ان کے گھر جانے کا سبب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے آخری صدیوں میں اُن کو چند حوادث نے گھیر لیا۔

اب ان علماء عصر سے جو راسخ العقیدہ ہیں۔ ہماری یہ استدعا ہے کہ اس مبارک عقیدے پر جو بدعات وغیرہ طاری ہو گئے ہیں۔ اُن سے اسے چھڑانے اور بچانے پر کوشش و توجہ مبذول کریں۔ عامۃ الناس کو سلف صالحین کے عقیدے یاد دلائیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے۔ ان میں بھی اس کا رواج پھیلائیں۔ ہمارے ملت کے امام جیسے غزالی اور اُن کے مانند دیگر علماء نے جو کچھ بیان کیا ہے کہ قضا و قدر پر توکل و تکیہ کا اصل مفہوم کیا ہے۔ اس کو سمجھائیں کہ شریعت غرار تو ہم سے عمل میں توکل چاہتی ہے نہ کہ غفلت اور کاہلی و سستی میں ہمیں خدا نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ اپنے فرائض کو چھوڑ دیں۔ جو ہمارے حیاتی و قومی واجبات ہیں، خدا پر توکل کر کے اُن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ یہ دلیل تو دین سے نکل جانے اور پھر جانے کی ہے۔ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہر مسلمان مکلف پر "دفاع عن الملۃ" فرض عین ہے۔ اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کو اُن کے عقائد حقہ کی طرف ملتفت کرے،

اُن کی جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرے اُن کی عزت و عظمت کو دوبارہ دلائے، اپنی پہلی شان دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُن کی غیرتوں کو ابھارے۔ سو اعلماء کی بہترین دعوت کے۔ اور یہ انہیں علماء کے ذمے اور انہیں کی توجہ پر منحصر ہے۔

اب رہا مسلمانوں کا انحطاط، اور دوسری قوموں سے پیچھے رہنا، اس کا سبب نہ یہ عقیدہ ہے اور نہ اسلامی عقائد میں سے کوئی اور دوسرا عقیدہ۔ اس عقیدے کی طرف مسلمانوں کے قومی انحطاط کی نسبت کرنا، گویا ایک نقیض کی نسبت دوسری نقیض کی طرف کرنا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسا ہے جیسے حرارت کی نسبت برف کی طرف اور برودت کی آگ کی طرف۔ ہاں! مسلمانوں کی نشأت کے بعد اُن کی فتح و ظفر کو دھچکا لگا اور اُن کے اقتدار و عظمت کو صدمہ پہنچا۔ وہ یہ کہ مسلمان اس عالم ترقی میں تھے کہ اچانک دو زبردست صدمے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مشرق سے۔ یہ تاتاریوں یعنی چنگیز خاں اور اس کے اخلاف کی غارتگری تھی۔ دوسرا صدمہ مغرب کی جانب سے۔ یہ یورپین اقوام کا اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر حملہ تھا۔ بڑھتی ہوئی حالت میں ایکدم ایسا صدمہ انسان کی صحیح رائے کو کھو دیتا ہے۔ اور بتقاضائے فطرت دہشت و خوف اور پھر غشی و بے ہوشی کا سبب ہو جاتا ہے۔ آخر یہی ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں مختلف حکومتیں رہیں۔ امارت نااہلوں کے ہاتھ آئی۔ اور رمہات کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو ریاست کے حسن و خوبی سے بیگانہ تھے۔ یہی حکام اور امراء مسلمانوں کے اخلاق اور طبائع میں نقائص پیدا کرنے والے جراثیم تھے۔ اور اُن پر ادبار و بدبختی کی بلا لانے والے۔ اس سے مسلمانوں کے نفوس میں ضعف جاگزیں ہو گیا۔ اور اُن میں سے بہتوں کی نظریں جزئیات تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ جو موجودہ لذت و لطف سے متجاوز نہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی کھوپری پکڑ لی اور ہر پہلو، ہر صورت سے اس کو نقصان پہنچانے اور تباہی و خرابی میں مبتلا کرنے کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ وہ بھی بغیر کسی صحیح و مناسب سبب، اور کسی قوی و واقعی باعث کے اس کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے لگے۔ آخر اُن کا ہر شعبۂ حیات ضعف و یاس تک پہنچ گیا، جو آج نظر آ رہی ہے۔

مگر میں یہ دیکھتا اور کہتا ہوں کہ یہ قوم کبھی مردہ نہیں ہوسکتی۔ جبتک یہ پاکیزہ عقائد اس قوم کے دلوں میں راسخ اور اپنے صحیح مرکز پر ہیں اور جب تک ان عقائد کے نقوش انکے ذہنوں میں تاباں نظر آتے ہیں۔ اس وقت جو مرض بھی عقلی ہو کہ نفسی ان کو عارض ہوگیا ہے ان عقائد صحیحہ کی قوت اُسے دفع کرے گی۔ وہ انشا راللہ پھر اُسی حالت پر پہنچ جائیں گے جس پر پہلے تھے۔ اور اپنے مضبوط بندھنوں سے کھل جائیں گے۔ اپنے ممالک کو نجات وآزادی دلانے میں طامع وحریص اقوام کو مرعوب وخوف زدہ کرنے میں حکمت وبصیرت کے جو طریقے ہیں وہ اختیار کریں گے۔ اور انہیں اُن کی حد پر رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ یہ تمسکل آسان ہو نادور نہیں ہے، تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ تم ذرا انہیں ترکوں کو دیکھو۔ جو اسی قوم کے زبردست صدمات اور نقصانات کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔ (یعنی تاتاری اور صلیبی جنگوں کے بعد) انہوں نے اپنے جرار لشکر اطراف عالم میں دوڑادیے۔ اور فتوحات کے میدان اُن کے لئے برابر وسیع ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے ملکوں کو روند ڈالا۔ گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوا دیں۔ اور یورپ کی حکومتوں کی گردنیں اپنی سطوت وجبروت کے آگے جھکوادیں۔ حتیٰ کہ دول یورپ عثمانی سلطان کو ”سلطان اعظم“ کے نام سے یاد کرتی تھیں۔

پھر اب ذرا نظر پھیر کر دیکھو! تم اب بھی ان میں ایک لہر اور ایک حرکت پاؤ گے۔ آخری حادثات کے انجام، اور نامبارک نتائج کے بعد جو خوفناک اثرات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ترکوں میں یہ حرکت اُن سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ حرکت ترکوں کے ارباب دانش وبصیرت کے افکار وخیالات میں سراری ہوگئی ہے۔ انکے ملک کے اکثر حصوں میں، مشرق ومغرب میں حمایت حق کے لئے بہترین لوگوں کی جماعتیں بن گئی ہیں۔ جنہوں نے اپنی جانوں پر عدل وانصاف کی مدد، شریعت وقانون کی اعانت، اور سعی وعمل کو فرض کرلیا ہے۔ اپنے افکار وخیالات پھیلانے اور اتحاد کے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ متفرق ٹکڑیوں کو ملانے پر کامیاب ہوگئے ہیں آنہوں نے اپنے کاموں کی فہرست میں سب سے چھوٹا کام ایک عربی اخبار کا اجرا

قرار دیا ہے ، تاکہ جو کچھ اُس میں لکھا جائے دور دراز مقامات پر رہنے والوں تک پہنچ جائے۔ اور دوسرے اُن کی نسبت جو کچھ دل میں لئے ہوئے ہیں وہ اُن تک منتقل ہو جائے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہترین سیاسی انجمنوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان انجمنوں کو ان کے ارادوں میں کامیابی ہو ۔ ان کا جو سچا اور حق مقصد ہے۔ تائید الٰہی اس کے شامل حال رہے ۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے مجھے یہ بھی توقع ہے کہ ان انجمنوں کی حسن سعی کا کوئی ایسا اثر مرتب کرے جو مشرقیوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے مفید ہو گا ۔ انشاءاللہ ۔

ادبیات ایران کی ترقی میں
سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

محمود غزنوی کی علمی قدردانیاں اس سے پہلے آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ محمود غزنوی کی ادبی قدردانیوں نے ایرانی شاعری اور زبان کو عروج کمال پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس نے ادبی قدردانی اور شعرا نوازی پر ہی اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ وہ علماء کا بھی ویسا ہی قدردان تھا۔ اگر ایک طرف عنصری فردوسی اور فرخی جیسے مایۂ ناز شعرا اس کے دربار کی زینت تھے تو دوسری طرف البیرونی احمد بن حسن میمندی اور بیہقی اور ابن الخمار جیسے مشہور اہل علم اس کی قدرافزائیوں کے خوشہ چیں تھے۔ علماء کی صحبت سے فیض حاصل کرنیکا اسے شوق نہیں حرص تھی۔ مشہور علماء کو اپنے دربار میں لانے کے لئے وہ اپنی پوری کوشش صرف کر دیتا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خوارزم شاہیوں سے معرکہ آرائی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بیرونی اور دوسرے علماء کو حاصل کرے۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے بو علی سینا کو بھی اپنے دربار میں بلانیکی کوشش کی لیکن اس نے متعدد مصالح کی بنا پر اس کو قبول نہیں، اور بدقسمتی سے محمود کا دربار ایک ایسے نادرۂ روزگار عالم سے محروم رہا۔ بیرونی کے علاوہ اس کے دربار میں احمد بن حسن میمندی اور دیگر علماء بے وقت بھی موجود تھے گو انہوں نے کچھ ایسی نمایاں شہرت حاصل نہیں کی لیکن کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے وقت کے کامیاب لوگوں میں تھے اور محمود کے دربار کی زینت تھے۔ یہاں مختصر طور سے محمود کے دربار کے بعض مشہور علماء کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بیرونی[1]

البیرونی کی پیدائش خیوا یا خوارزم[2] کے ایک قریہ میں ہوئی۔ سنہ پیدائش ۳۶۲ھ (۹۷۳ء) ہے بعض مورخین نے اسکا وطن سندھ بتایا ہے لیکن انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے سندھ میں نیرون (بالنون) ایک قصبہ تھا جسے بعض مورخین نے بیرون پڑھ لیا اور بیرونی کو اسی بیرون کا باشندہ سمجھ لیا لیکن یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ مضافات خوارزم کے ایک قریہ کا رہنے والا تھا جس کا نام غالبًا بیرون تھا (یا وہ بیرون شہر کا رہنے والا تھا) بیرونی کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں اتنا معلوم ہے کہ اس کی ابتدائی تربیت آل عراق (خوارزم کا شاہی خاندان) کی سرپرستی میں ہوئی۔ خصوصًا ابونصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف خاص توجہ کی افسوس ہے کہ باوجود بہت کچھ تلاش و تفحص کے بیرونی کا سلسلہ نسب دریافت نہ ہو سکا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والدین کی کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں تھی۔ کسی معاصر شاعر نے اس کے مجہول النسب ہونیکا طعنہ بھی دیا ہے لیکن بیرونی نے اسکا نہایت معقول اور مناسب جواب دیا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اسکی عظمت و شہرت بجز ذاتی کمال کے کسی دوسری چیز کی مرہون منت نہ تھیں۔

بیرونی نے جس زمانہ میں جنم لیا تھا وہ عجمی ممالک میں علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے

---

[1] "البیرونی" کے نام سے انجمن ترقی اردو کی جانب سے بیرونی کی سوانحعمری شائع ہو چکی ہے (نوشتہ سید حسن برنی علیگ) ہم نے اسی کتاب کو زیادہ تر اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ (کتاب الہند مرتبہ زاخو وغیرہ) بھی دو تین کتابیں پیش نظر ہیں لیکن زیادہ تر مدد اسی سے لی گئی ہے حسن برنی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ بیرونی جیسی عظیم الشان شخصیت کی ایک مستند سوانح حیات لکھکر انہوں نے علمی طبقہ پر احسان عظیم کیا ہے۔

[2] مقدمہ کتاب الہند از زاخو۔

نہایت شاندار دور تھا ۔ وسط ایشیا کا ہر ہر حصہ علوم و فنون کا مرکز بن رہا تھا ۔ بیرونی سے پہلے ان ممالک میں علم و فضل میں ممتاز شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں ۔ خود بیرونی اور ابن سینا اس کا زندہ ثبوت ہیں ۔ بیرونی کی تربیت بھی تمامتر علمی ماحول میں ہوئی ۔ ابو نصر منصور جس نے اس کی تربیت کی جانب خاص طور پر توجہ کی تھی خود بھی اس زمانہ کا زبردست فاضل اور علوم ریاضی کا ماہر تھا ۔ اس نے بیرونی کے نام متعدد کتابیں بھی معنون کی تھیں ۔ بیرونی نے ایک قصیدہ میں اپنے مربیوں کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اور آل عراق کے سلسلہ میں ابو نصر منصور کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

مضیٰ اکثر الایام فی ظل نعمتہ

علی رتب فیہا علوت کراسیا

فآل عراق قد غذونی بدرہم

ومنصور منہم قد تولی غراسیا

۲۳ سال کی عمر تک بیرونی اپنے وطن میں حکومت کی زیر سرپرستی علمی تحقیقات میں مصروف و منہمک رہا ۔ بالآخر اس کے مربیوں کی حکومت ختم ہو گئی تو اسے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا کئی سال تک وہ پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا ۔ آخر کار شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار میں کسی طرح اس کی رسائی ہو گئی ۔ یا یہ کہ شمس المعالی نے خود اسے اپنے ہاں مدعو کیا ۔ شمس المعالی خود ایک بڑا ادیب اور فاضل تھا ۔ علوم حکمیہ سے اسے خاص تعلق تھا اسی لئے اس نے بیرونی کی زیادہ سے زیادہ عزت کی لیکن وہ ایک سخت گیر حکمران تھا بیرونی کو بھی اُس کی حرکات پسند نہیں تھیں اس لئے وہ زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہا ۔ اس زمانے میں علی بن مامون خوارزم کا حکمراں تھا اُسے جب بیرونی کی قدر و منزلت معلوم ہوئی ۔ نیز شمس المعالی سے اس قدر تقرب کے حالات سنے تو اس نے خود اپنے یہاں مدعو کیا ۔ اپنے ہی قصر میں اسے فروکش کیا ۔ اور اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ۔ دیگر والیان ملک کی

طرح وہ بھی علم وفن کا شائق اور اہل علم کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی[۵۱] جو وزارت کے عہدہ پر فائز تھا علوم حکمیہ کا خاص ذوق رکھتا تھا علی بن مامون کے بعد اس کا بھائی ابوالعباس مامون تحت حکومت پر متمکن ہوا وہ بھی نہایت ذی علم اور قدردان علم وفن بادشاہ تھا۔ اس کی علمی قدردانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دربار ماہرین علم کا مرکز بن گیا تھا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ علوم حکمت میں تاریخ اسلامی کی سب سے بڑی شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں[۵۲] یعنی ابوریحان بیرونی اور بوعلی سینا ان دونوں میں عرصہ تک علمی بحثیں بھی چھڑی رہیں خوارزم کے بعد ابن سینا اور بیرونی کو پھر کبھی باہم مجتمع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر ناساعدت روزگار سے یہ علمی مجلس درہم برہم ہوگئی۔ محمود غزنوی نے خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابوالعباس مامون اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوا اور

---

۵۱ السہیلی خوارزم کے اکابرین سے تھا اور اسکا خاندان ریاست و وزارت کا گھرانہ تھا۔ ثعالبی نے لکھا ہے کہ وہ وزیر بن وزیر تھا اور ریاست کے ساتھ علوم و آداب میں بھی امتیاز رکھتا تھا۔ اور کرم و حسن خلق کے لئے مشہور تھا۔ کتاب روضۃ السہیلیہ اس کی تصنیف تھی۔ اسی کے حکم سے الحسن بن الحارث نے کتاب السہیلی تصنیف کی تھی جس میں فقہ شافعی و حنفی سے بحث کی گئی تھی۔ وہ شعر بھی کہتا تھا۔ ابن سینا نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ وہ علوم حکمیہ کا محب تھا۔ اور اسی کے توسط سے ابن سینا بخارا سے آکر علی بن مامون کے دربار میں پہنچا۔ الخ البیرونی صفحہ ۵۵

۵۲ نظامی سمرقندی لکھتا ہے۔

ابوالعباس مامون خوارزم شاہ وزیرے داشت نام او ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی۔ وے حکیم طبع و کریم نفس و فاضل۔ خوارزم شاہ ہم چنیں حکیم طبع و فاضل دوست بود۔ و بسبب ایشاں چندے حکیم و فاضل براں درگاہ جمع شدہ بودند چوں بوعلی سینا و ابوسہل مسیحی و ابوالخیر خمار و ابوریحان بیرونی و ابونصر عراق الخ (چہار مقالہ مطبوعہ یورپ)

خوارزم کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اس کے دربار کے علما، کچھ تو پہلے ہی محمود غزنوی کی خواہش کے مطابق اس کے دربار میں منسلک ہوگئے تھے[۱]، کچھ اس انقلاب کے کے بعد محمود کی معیت پر مجبور ہوئے۔ البیرونی نے اس موقع پر جب کہ ابوالعباس مامون

---

[۱] نظامی عروضی نے اس شاندار علمی مجلس کی تباہی اور انتشار کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :۔

روزگار بر نہ پسندید و فلک روانہ داشت آں عیش بر ایشاں منغص شد و آں روزگار بر ایشاں بزیاں آمد از نزدیک سلطان یمین الدولہ محمود معروفے رسید با نامہ آں کہ شنیدم کہ در مجلس خوارزم شاہ چند کس اند از اہل فضل کہ عدیم النظیر اند چوں فلاں و فلاں۔ باید کہ ایشاں را بہ مجلس ما فرستی تا ایشاں شرف مجلس ما حاصل کنند تا بعلوم و کفایات ایشاں مستظہر شویم و آں منت از خوارزم شاہ داریم و رسول وے خواجہ حسین بن علی میکال بود کہ یکے از افاضل و اماثل عصر و اعجوبہ بود در رجال زمانہ و کار محمود در اوج ملک او رونقے داشت و دولت او علوے۔ و ملوک زمانہ او را مراعات ہمی کردند و شب روبہ اندیشہ ہمی خفتند۔ خوارزم شاہ خواجہ حسین میکال را بجائے نیک فرود آورد و شگرف فرمود و پیش از انکہ او را بار داد حکما را بخواند و ایں نامہ بر ایشاں عرضہ کرد و گفت محمود قوی دست است و لشکر بسیار دارد و خراسان و ہندوستان ضبط کردہ است و طمع در عراق بستہ من نمی خواہم کہ شما او را امتثال نمائم و فرمان او را بہ نفاذ نپیوندم۔ شما دریں چہ گوئید۔ ابوعلی و ابوسہل گفتند ما نرویم اما ابونصر و ابوالخیر و ابوریحان رغبت نمودند کہ اخبار صلات و ہبات سلطان ہمی شنیدند۔ پس خوارزم شاہ گفت شما دو تن را کہ رغبت نیست پیش از انکہ من ایں مرد را بار دہم شما سر خویش گیرید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روز دیگر خوارزم شاہ حسین علی میکال را بار داد ۔ ۔ ۔ ۔ و گفت نامہ خواندم و بر مضمون و فرمان پادشاہ توقف افتاد۔ بوعلی و ابوسہل برفتہ اند لیکن ابونصر و ابوریحان و ابوالخیر بسیج می کنند کہ پیش خدمت آیند الخ (چہار مقالۂ نظامی مطبوعہ یورپ)

کی سلطنت خطرہ میں پڑی ہوئی تھی اور محمود اس کو فتح کرنیکی فکر میں تھا۔ بادشاہ کے لئے بہترین مشیر ثابت ہوا اگر اس کی تدبیریں اور مشورے سلطنت کے استحکام میں کارگر نہ ہوئے تو یہ قصور اسکا نہیں مامون کی قسمت کا ہے کہ خود اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔

خوارزم کی فتح کے بعد بیرونی بھی دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کی طرح محمود کے ساتھ غزنین پہنچا۔

محمود اور بیرونی کے تعلقات[۱]

اس خصوص میں ہم محمود کے بیان میں تفصیلی بحث کر آئے ہیں اس لئے یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ جناب سید حسن برنی صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عام طور پر محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ ایسا نہیں تھا کہ اس سے کسی خاص شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود محمود کے علم میں اسقدر گہرائی نہیں تھی کہ وہ اس کی قدر پہچانتا۔ اور اس کے شایاں شان اس سے سلوک کرتا۔

شروع میں انہوں نے معجم الادبا اور خود اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اقتباسات دئیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ کس قسم کا تھا مسئلہ کی وضاحت کے

---

[۱] زاخو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود اور بیرونی کے تعلقات آخر تک ناخوشگوار رہے اس سلسلے میں اس نے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں مثلاً بیرونی سے احمد بن حسن کی رقابت۔ احمد کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کر دینا۔ کتاب الہند کا انتساب سلطان مسعود کی جانب حالانکہ کتاب سلطان محمود کے زمانے میں لکھی گئی نیز کتاب میں جہاں کہیں محمود کا تذکرہ آیا ہے وہاں بجائے سلطان کے امیر لکھا ہے برخلاف اسکے اپنے گذشتہ محسنین کا جو محمود سے کہیں فروتر تھے نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ محمود کی فتوحات کے متعلق اسکا خیال تھا کہ اس نے ہندوستان کی خوشحالی کو تباہ کر دیا اور ایسے حیرت انگیز حملے کئے جن سے ہندی مثل ذروں کے تمام طرف بکھر گئے۔ لیکن برنی صاحب نے زاخو کے اس خیال کی تردید کی ہے تفصیل کیلئے دیکھو البیرونی (طبع دوم)

: مقدمہ زاخو بر کتاب الہند

ہم یہ دونوں اقتباسات ذیل میں نقل کرتے ہیں :۔

(۱) بیرونی نے ابوالفتح بستی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں اس نے محمود کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے ۔

ولم یقبض محمود علی بنعمۃ	محمود نے کسی نعمت کو مجھ سے دریغ نہیں کیا ۔ مجھے مالا
فاغنی واقنی مغضیا عن مکاسیا	مال کر دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی ۔
عفا عن جہالاتی وابدی تکرما	میری جہالتوں کو معاف کیا اور میری توقیر کرنے لگا ۔
و، د، و، وطری بجاہ رونقی ولباسیا	اور اس کے جاہ سے میری رونق اور لباس تازہ ہو گئے

(۲) یاقوت الحموی نے محمد بن محمود النیشاپوری سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے محمود اور بیرونی کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔

ولما استبقاہ السلطان الماضی لخاصۃ امرہ	چونکہ سلطان ماضی (محمود) نے البیرونی کو اپنے خاص کام
وحوجار صدرہ کان یفاوض فیما یسنح لخاطرہ	اور دلی حاجت کے لئے محفوظ رکھا تھا اس لئے امور
من امر السمار النجوم فیحکی انہ ورد علیہ رسول	سماوی نجوم کے متعلق جو بات اس کے دل میں آتی تھی
من اقصی بلاد الترک وحدث بین یدیہ بما	اس کے تفویض کرتا تھا ۔ اس لئے ایک قصہ بیان کیا
شاہد فیما ورا ر البحر نحو القطب الجنوبی من	جاتا ہے کہ اقصےٰ بلاد ترک سے ایک ایلچی آیا اور اس
دور الشمس علیہ ظاہرۃ فی کل دورہا فوق	نے محمود کے روبرو بیان کیا کہ میں نے سمندر پر قطب
الارض بحیث یبطل اللیل فنا زع علی عادتہ	جنوبی کے قریب دیکھا کہ سورج کا پورا دور وہاں زمین
فی التشدد فی الدین الی نسبۃ الرجل الی الحاد	پر ظاہر رہتا ہے اور رات نہیں ہوتی ۔ یہ سنکر محمود نے
والقرمطۃ علی براءۃ اولئک القوم عن ہذہ	بوجہ اپنی تشدد دینی کی عادت کے فوراً اس شخص کو
الآفات حتی قال ابونصر مشکان ان ہذا لا یذکر	ملحد اور قرمطی قرار دیدیا ۔ حالانکہ ترک ان آفات سے
ذلک من رای برئیۃ ولکن عن مشاہدۃ یحکیہ	محفوظ ہیں ۔ اس پر ابونصر مشکان نے کہا کہ یہ شخص

وتلا قوله عزوجل وجدها تطلع على قوم لم نجعل لهم من دونها ستراً فسال ابا الريحان عنه فاخذ يصف له على وجه الاختصار ويقرره على طريق الاقناع وكان السلطان فى بعض الاوقات يحسن الاصغار ويبذل الانصاف فقبل ذلك وانقطع الحديث بينه وبين السلطان وتقتنذ (معجم الادبا بحواله البيرونی)

اپنی طرف سے کسی رائے کو پیش نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن شریف کی یہ آیت وجدھا تطلع الخ پڑھی۔ محمود نے اس کے متعلق ابوریحان البیرونی سے پوچھا تو البیرونی نے مختصر مگر شافی طریق پر اس بحث کو سمجھا دیا۔ سلطان محمود بعض اوقات بغور سنتا اور انصاف کرتا تھا۔ اس نے اس کو تسلیم کرلیا اور وہ بات اسوقت وہیں ختم ہوکر رہ گئی۔

بیرونی کے علمی کارنامے بیرونی کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ یہ مختصر مضمون اسکا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ابتدائے عمر سے لیکر موت کے آخری دم تک وہ علمی تحقیق و تفحص میں منہمک رہا۔ اوپر کسی موقع پر ہم بیان کرآئے ہیں کہ اس کی تربیت ابونصر منصور کی سرپرستی میں ہوئی جو خود بہت ذی علم اور علوم حکمیہ کا ماہر تھا۔ البیرونی ایک غیر معمولی ذہن و دماغ لیکر پیدا ہوا تھا اسپر شفیق اور علم دوست استاد اور مربی کی سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اور بہت جلد اس زمانے کے مشہور علماء میں اس نے امتیاز پیدا کر لیا اور علمی دنیا میں اس کا ایک خاص وقار قائم ہوگیا۔ غیر معمولی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کا ذوق تفحص اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ایک کتاب کے لئے وہ ۴۰ سال تک سرگردان رہا ہے[1]۔

علم و فن کے ہر شعبہ میں اسے یکساں مہارت حاصل تھی، فلسفہ، علم ہیئت، ریاضی، جغرافیہ تاریخ، تمدن، علم آثار اور علم المذاہب سب میں اسے کامل دسترس تھی۔ ان تمام شعبہ ہائے علوم میں اس کے کارنامے آج بھی حیرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اپنی

---

[1] البیرونی صفحہ ۲۱۴

علمی تصنیفات کے سلسلہ میں اسے اور بھی بہت سی زبانیں سیکھنا پڑیں۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ عربی چونکہ اس وقت کی تصنیفی زبان تھی اس لئے اس میں بھی اس نے پوری دستگاہ حاصل کی۔ ہندوستان میں اسے سنسکرت زبان سے واسطہ پڑا جو اس وقت کی مشکل ترین زبانوں میں تھی لیکن اس نے اس پر بھی عبور حاصل کر لیا اور غالباً عبرانی اور سریانی زبانوں سے بھی واقفیت پیدا کر لی[۵۱]۔ ان زبانوں کے سیکھنے میں اسے کیا کچھ دقتیں نہیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ اسکی طالبعلمانہ شوق اور محنت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنسکرت اس نے پچاس برس کی عمر میں سیکھی۔ شب و روز وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رہتا تھا شہرزوری اس کے علمی انہماک اور محویت کے متعلق لکھتا ہے۔

> "بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو، دیکھنے سے آنکھ کو اور فکر سے دل کو کبھی جدا نہیں کرتا تھا مگر سال میں صرف دو روز یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کے سامان کو مہیا کرتا تھا[۵۲]"

بیرونی کے علمی کارناموں کا "البیرونی" میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے یہاں انکا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آخر عمر تک اس نے تقریباً ۱۴۷ کتابیں لکھیں جن میں مختصر رسائل اور ضخیم کتابیں سب کچھ شامل ہیں۔ اس کی ان تالیفات و تراجم میں ہر علم و فن کی کتابیں ہیں اور تقریباً تمام علوم و فنون کو محتوی ہیں[۵۳]۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار کس قدر افسوسناک ہوگا کہ ان بے شمار کتابوں میں سے ہندوستان یورپ اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں ہنوز صرف ۱۲ کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ بہت سے مشہور علما نے خود اس

---

[۵۱] البیرونی صفحہ ۲۱۳ [۵۲] شہرزوری بحوالہ البیرونی صفحہ ۲۱۴

[۵۳] تفصیل کے لئے دیکھو البیرونی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹ ایضاً ۱۲۹

کے نام پر بھی اپنی کتابیں معنون کی ہیں ان میں ابونصر منصور اور ابوسہل مسیحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو بیرونی سے کس قدر محبت و عقیدت تھی۔ اسکی بعض کتابیں کتاب الہند وغیرہ یورپ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اب ہندوستان میں بھی اس طرف توجہ ہوئی ہے چنانچہ قانون مسعودی کو (مع ترجمہ انگریزی و اُردو) مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا جارہا ہے انجمن ترقی اُردو سے کتاب الہند کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے انکے بعد دوسری کتابوں کی طرف بھی توجہ ہو۔

خواجہ احمد بن حسن میمندی

خواجہ احمد بن حسن میمندی کے ابتدائی حالات افسوس ہے کہ تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے وہ محمود غزنوی کا بہت کامیاب وزیر تھا۔ زاخو کا خیال ہے کہ اس کے اور بیرونی کے تعلقات نہ صرف کشیدہ تھے بلکہ اسی کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کیا گیا تھا لیکن محمود کے دربار میں حسنک نام ایک اور ہستی بھی تھی اس کی تربیت خود محمود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لئے وہ اسکا خاص خیال رکھتا تھا۔ حسنک اور احمد بن حسن کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی اور اسکا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بن حسن کو بھی ہندوستان کے قیدخانوں میں ڈلوا دیا گیا۔ محمود کے انتقال کے بعد مسعود اور احمد دونوں بھائیوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی جس میں مسعود کو فتح اور محمد کو شکست ہوئی۔ حسنک محمد کا طرفدار تھا اس لئے اس پر قرمطی ہونیکا الزام لگا کر پھانسی دیدی گئی، خواجہ احمد بن حسن کے دن پھرے اور ہندوستان کے قیدخانہ سے رہائی ملی۔ مسعود نے تمام بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر کیا لیکن وزیر اعظم کی جگہ ہنوز خالی تھی۔ سب کی نظریں احمد بن حسن میمندی پر پڑ رہی تھیں۔ مسعود نے ابوسہل ہمدانی کے ذریعہ پیام بھیجا لیکن احمد بن حسن بوڑھا ہو گیا تھا اور گوشہ عافیت اختیار کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ابوسہل پر ٹالدیا کہ اس کام کے لئے تم مجھ سے زیادہ انسب ہو آخر مجبور ہو کر سلطان مسعود نے خود اس سے درخواست کی اسے تخلیہ میں بلا کر دیر تک گفتگو کی اور کہا

"خواجہ آپ کیوں نہیں اس فرض کو اپنے ذمہ لیتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ آپ میرے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں میرے سرپر اس وقت بہت سے اہم کام ہیں اور یہ مناسب نہیں کہ ایسے موقع پر آپ اپنی قابلیت سے مجھے محروم رکھیں۔

احمد بن حسن نے ضعیفی کا عذر پیش کیا لیکن مسعود کا اصرار برابر جاری رہا اس نے وعدہ کیا کہ بجز سیر و شکار اور شراب و کباب کے سلطنت کے تمام معاملات اسی پر چھوڑ دے گا بالآخر خواجہ احمد بن حسن نے چند شرائط کے ساتھ اسے منظور کر لیا۔ تفویض منصب کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ادا کی گئی اور نہایت اہتمام سے خلعت اور قلمدان وزارت تفویض کیا گیا۔

خواجہ نے نہایت تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا۔ باوجودیکہ امراء اور اہل دربار میں باہمی نزاع اور مخاصمت بھی جاری رہی لیکن محض خواجہ احمد بن حسن کے اثر سے مملکت کے نظم و نسق پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے مشورے سے تمام بڑے بڑے خودسر جنرل معزول کر دئے گئے جس کی وجہ سے سلطنت میں کسی بغاوت اور شورش نے جڑ نہیں پکڑی

بیہقی

پورا نام ابوالفضل بن الحسن البیہقی۔ پیدائش ۳۸۶ھ (۹۹۵ء) وفات ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) اپنے وقت کا مشہور عالم و فاضل اور تاریخ کا ماہر تھا اس کی کتاب کا نام "تاریخ بیہقی" یا "تاریخ آل سبکتگین" ہے تمام جلدیں مجلدات بیہقی کے نام سے موسوم ہیں۔ ابتدائی حصہ یعنی ناصرالدین سبکتگین کے متعلق "تاریخ ناصری" کے نام سے، مسعود کے متعلق حصہ "تاریخ مسعودی" اور محمود کے متعلق "تاج الفتوح" کے نام سے بھی علیحدہ علیحدہ طور پر موسوم کیا جاتا ہے "روضۃ الصفا" کے مقدمہ میں ہے کہ یہ کتاب کل ۳۰ جلدوں میں ہے۔ مصنف کا ذکر حیدر رازی۔ ضیاءالدین برنی۔ ابوالفضل اور جہانگیر نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ باوجود اس قدر مشہور ہونے کے

تمام جلدوں کا کہیں پتہ نہیں بچی کچی جلدیں بھی اب ہندوستان میں نایاب ہیں صرف تین نسخہ یہاں تھے جو ایک انگریز مستشرق مسٹر مارے نے حاصل کئے اور تین اور نسخوں کی مدد سے جو یورپ کے کتب خانوں میں تھے۔ ایک ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں ۷، ۸، ۹ مکمل اور ۶، ۱۰ کے کچھ اجزا شامل ہیں۔

بیہقی کی تاریخی فضیلت اس کے ان الفاظ سے عیاں ہوسکتی ہے۔

آدمی، آدمی کے دل سے پہچانا جاسکتا ہے۔ دل قوی یا ضعیف ہوتا ہے جو کچھ کہ وہ سنتا ہے یا دیکھتا ہے اور جب تک کہ وہ برا یا بھلا نہیں سنتا یا دیکھتا اس وقت تک وہ اس دنیا کی رنج و خوشی سے بے خبر رہتا ہے لہذا معلوم ہونا چاہئے کہ آنکھ اور کان (انسان کے) دل کے پاسبان اور مخبر ہیں وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں۔ اس کی خبر وہ دل سے کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھاکر عقل کو پہنچادے جو نیک و بد کی تمیز کرسکتی ہے اور پہچان سکتی ہے کہ کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر۔ یہ غرض ہوتی ہے جس کے لئے انسان مخفی باتوں اور اُن چیزوں کا جن کے متعلق اس نے کبھی کچھ سنا ہے اور نہ دیکھا ہے اور ان باتوں کا جو زمانہائے ماضی میں واقع ہوئی ہیں علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ابوالخیر الحسن

ابوالخیر الحسن بن سوار بن بابا بن بہرام (وبقول ابن ابی اصیبعہ بہنام) المعروف بابن الخمار ۳۳۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا۔ یحیٰی بن عدی مشہور منطقی سے فلسفہ پڑھا۔ بعدازاں خوارزم میں مامون کے دربار میں پہنچا جہاں خوارزم شاہیہ کے کنف حمایت میں انکے انقراض حکومت تک بسر کرتا رہا سنہ ۴۰۷ھ (۱۰۱۶ء) میں خوارزم کی تباہی کے بعد وہ محمود کے ساتھ چلا گیا محمود اس کی کمال تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ یہاں تک مشہور ہے کہ اس کے سامنے زمیں بوس ہوتا تھا۔ ابوالخیر نہایت منکسر

مزاج تھا لیکن سلاطین و امرا سے تزک و احتشام سے ملتا تھا تین سو غلام رکاب میں رہتے تھے۔ اہل علم اور زہاد کی خدمت میں پا پیادہ جاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس پیادہ روی کو جابرون اور فاسقون کی عبادت کا کفارہ قرار دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ محمود کے دربار سے واپس آتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ضربات کے صدمہ سے ایسا بیمار رہا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔

ابو الخیر اخیر زمانے میں عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا وہ سریانی سے عربی میں کتب حکمت کا ترجمہ کرتا تھا اور اپنے زمانے کے مشہور حکما میں شمار ہوتا تھا۔[۵]

اس مضمون کے لکھتے وقت مندرجہ ذیل کتابیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ تذکرۃ الشعرا مطبوعہ یورپ
۲۔ چہار مقالہ "
۳۔ لباب الالباب "
۴۔ شعر العجم حصہ اول و چہارم
۵۔ مقالات شبلی
۶۔ البیرونی
۷۔ مقدمہ زاخو بر کتاب الہند
۸۔ ایلیٹ
۹۔ آثار الکرام
۱۰۔ محمود غزنوی کی بزم ادب
۱۱۔ تنقید شعر العجم از محمود شیرانی

مضمون مولانا مسلم عظیم آبادی (رسالہ جامعہ)

---

۵ البیرونی صفحہ ۵۸

طولسطائے اور میکائیلووچ کی خط وکتابت

لیو طولسطائے اور نواب اعظم نکولائی میکائیلووچ کی یہ خط وکتابت جو اب تک شائع نہیں ہوسکی اس صدی کی ابتدا سے متعلق ہے۔ روسی زبان سے ہر۔ ی۔ لیون نے جرمن میں ترجمہ کیا ہے جو سہ ماہی رسالہ "سیاست وتاریخ" میں شائع ہوا ہے۔ خاکسار اسے اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب سے پہلے جرمن مترجم کا ایک نوٹ ہے اس کے بعد ایک خود نواب اعظم کا۔ اور پھر وہ خطوط ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ جرمن مترجم کا جو مقدمہ ہے اس کے ترجمے میں میں نے ذرا اجمال سے کام لیا ہے اور صرف ضروری حصوں کا ترجمہ "جامعہ" کے ناظرین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مگر نواب اعظم کے مقدمے اور خطوط کا پورا پورا ترجمہ کیا گیا ہے۔

محمود

دیباچہ مترجم

اس خط وکتابت کے متعلق بعض تشریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ نواب اعظم نکولائی میکائیلووچ، زار روس نکولا اول کا نواسا تھا۔ اور زار سکندر سوم کا چچا زاد بھائی عام سیاسی کاموں میں اس نے کبھی کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اس فوجی خدمت کے بعد جو شاہی خاندان کے ہر رکن پر فرض ہوتی تھی اس نے اپنی زندگی روسی تاریخ کے لئے وقف کر دی۔ اس نے روس کی تاریخ جدید یعنی سکندر اول کی حکومت پر جس سے اسے خاص ذوق تھا کئی معرکۃ الآرا تصانیف کی ہیں۔ اسکی بعض تصانیف کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ روسی تاریخی مجلس کا صدر تھا۔ ۱۹۱۹ء کی ابتدا پر شاہی خاندان کے بعض دوسرے ارکین کے ساتھ اسے بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا حالانکہ سیاسیات میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

نواب اعظم کے بعض پرانے کاغذات میں جو ابھی حال میں دستیاب ہوئے ہیں طولسطائے کے خطوط اور انکے جوابات ملے ہیں۔ نواب اعظم اور طولسطائے کی پہلی ملاقات ۱۹۰۱ء میں کریمیا میں ہوئی۔ طولسطائے کی عمر اس وقت ۷۳ سال کی تھی۔ نواب اعظم کو طولسطائے کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بالکل غلط اور بے بنیاد تھیں۔ ان کی پہلی گفتگو کا موضوع فرقہ "دوخوبور" تھا (اس لفظ کا ترجمہ اُردو میں معقولئے اور انگریزی میں Rationalist کیا جا سکتا ہے) اس فرقے کے متعلق انیسویں صدی کے آخر میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ روس میں اس فرقے کی ابتدا سترہویں صدی ہی میں ہو چکی تھی۔ یہ لوگ تمام مذہبی اصولوں کی بنیاد عقل پر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں کلیسا کے ناقابل تبدل اصولوں اور ہر طرح کی پابندیوں، یہاںتک کہ سیاسی اور فوجی فرائض اور لگان کی ادائگی میں بھی عذر تھا۔ اس فرقے اور حکومت کے تعلقات میں ۱۸۳۰ء ہی سے کشیدگی شروع ہوگئی۔ اور اس جماعت کے اراکین کو خاص طور پر "خطرناک" سمجھا جانے لگا ۱۸۴۰ء میں ان سے بعض کو جلاوطن بھی کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اختلافات نے اور بھی شدید صورت اختیار کرلی اور طولسطائے اور اس کے ساتھیوں کے مشورے کے مطابق اس جماعت کے ۷۰۰۰ اشخاص کنیڈا چلے گئے۔ طولسطائے کو ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی۔ ان لوگوں کے اصول کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ کنیڈا میں بھی وہاں کی حکومت انکے لئے بعض قوانین بنانے پر مجبور ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ تو وہاں رہنے پر راضی ہوگئے اور کچھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برطانی کولمبیا چلے گئے۔ ان معقولین کی ہجرت کے مسئلہ پر طولسطائے اور میکائیلو وچ میں بہت گفتگو ہوئی ہے۔

طولسطائے نے نواب اعظم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں ایک دوسرے نہایت اہم مراسلے کا ذکر ہے جو طولسطائے نے زار نکولائی دوم کے نام لکھا تھا۔ اور جو نواب اعظم نے زار تک پہنچایا تھا۔

طولسطائے ہنری جارج کے مسلک کا پیرو تھا۔ اس کی کتاب "اجتماعی مسائل" کے روسی ترجمہ پر طولسطائے نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہنری جارج کے خیال میں تمام مصائب کی وجہ زمین کی تقسیم ہے۔ زمین پر ہر شخص کو وہی حق حاصل ہے جس طرح ہوا اور سورج کی روشنی پر۔ زمین پر جو لگان ہوگا وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ ریاست کی ملک ہوگا اور سب کے کام آئے گا۔ ریاست کو اس کے بعد کسی اور قسم کی آمدنی کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی اور اس کی ضروریات کے لئے یہی رقم کافی ہوگی۔ ہنری جارج کے اس طریق کو Single Tax System یا "وحدانی طریقہ مالگذاری" کہا جاتا ہے۔

طولسطائے ہنری جارج کا ہم خیال تھا۔ اس نے زار کے نام جو خط بھجوایا تھا اس میں اس سے اسی طریق پر کاربند ہونے کی درخواست کی تھی۔ اس خط میں اس نے حکومت وقت کی اچھی طرح خبر لی ہے اور زار کو جسے خط میں وہ "برادر عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ قوم کو آزادی رائے اور آزادی تقریر عطا کرے۔ خط میں طولسطائے یوں رقمطراز ہے :-

"اگر روسی قوم کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لاسکے تو میرے خیال میں وہ اس وقت یہی کہے گی۔ سب سے پہلے تو مزدور پیشہ لوگوں کا مطالبہ ہوگا کہ تمام غیر مساوی قوانین ختم ہو جانے چاہئیں جنہوں نے ان کی حیثیت "اچھوت" کی سی بنادی ہے اور جن کی وجہ سے انہیں وہ تمام حقوق حاصل نہیں جو اور شہریوں کو حاصل ہیں۔ انہیں اس بات کی آزادی ہو کہ وہ جہاں چاہیں آباد ہوسکیں، جو چاہیں پڑھیں اور اپنی روحانی ضروریات کے مطابق جس عقیدہ کی چاہیں پیروی کریں مگر جو سب سے بڑی بات ہے وہ یہ ہے کہ تمام کے تمام دس کروڑ نفوس بیک زبان یہ کہیں گے کہ زمینداری کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ زمین پر سے شخصی قبضے کے اٹھنے کا سوال ایسا ہے جو میری رائے میں تمام روسی قوم کے پیش نظر ہے۔ زندگی کے ہر دور میں انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک قدم آگے اعلیٰ معیار

کی طرف لے جائے ۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ قدم روس سے غلامی کا ملیامیٹ کرنا تھا۔ آج یہ قدم یہی ہے کہ مزدور پیشہ لوگ اس جماعت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو بلا وجہ انکے سر پر سوار ہے روس میں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ کھیتی سے پیٹ پالتا ہے یہ ممکن نہیں کہ محض کارخانوں اور فیکٹریوں کو قومیانے (nationalise) سے یہ مشکلات دور ہوجائیں۔ روسیوں کے لئے تو ناگزیر ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ زمین مخلوق خدا کی ملکیت ہے۔ یہی ہے وہ آرزو جو آج روسیوں کے دل میں جگہ کئے ہوئے ہے اور تمام قوم حکومت سے اس بات کی توقع ہے کہ وہ اسے واقعہ کی صورت دے گی ۔ پھر رعایا کو روز روز دبانے کے لئے نئے ہتھیاروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۔ حکومت کا بھی وہی مقصد ہوگا جو قوم کا ہے ۔ اور وہ مقصد بس یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلائی جائے ۔ میرا پختہ یقین ہے کہ آج یہ "ارضی جائداد" اسی قدر بے انصافی پر مبنی ہے جتنی آج سے پچاس سال پہلے "جسمانی جائداد" تھی ۔ اور میں خیال کرتا ہوں اس کے دور ہو جانے سے روسی قوم اپنی آزادی، خوشحالی اور اطمینان کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ جائے گی ۔ میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حکومت نے اس قسم کا قدم اٹھایا تو روز کے ان تمام انقلابی اور اجتماعی جھگڑوں کا خاتمہ ہوجائیگا جو آج مزدور پیشہ جماعت کو بھڑکا رہے ہیں اور جو قوم اور حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہیں ۔"

یہ ہے وہ خط جو طولسطائے نے زار کے نام لکھا اور نواب اعظم کو بھیجا جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے زار تک پہنچایا ۔ اس موضوع پر خود نواب اعظم نے دو خطوط طولسطائے کو لکھے ہیں جن میں انہوں نے طولسطائے سے اپنا اختلاف رائے ظاہر کیا ہے ۔ مگر انکا بھی یہ خیال تھا کہ سرکاری عمال اور محکموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ یہ بھی واضح ہونا چاہئے کہ خطوط پہلے روسی انقلاب (۱۹۰۵ء) سے بھی پہلے کے لکھے ہوئے ہیں ۔ خطوں پر جو تاریخیں ہیں وہ پرانی روسی جنتری کے حساب سے ہیں جسے یورپی کیلنڈر سے ۱۳ دن پیچھے سمجھنا چاہئے ۔

طولسطائے اور نواب اعظم کے خطوط سے پہلے اسی موضوع پر نواب اعظم نے ایک نوٹ لکھا ہے جسکا ترجمہ درج ذیل ہے۔

مقدمہ خط و کتابت

میں عرصہ سے لیو طولسطائے سے نیاز حاصل کرنے کا متمنی تھا، خزاں ۱۹۱۰ء میں بمقام کریمیا مجھے اسکا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ میں وہاں دو ہفتے کے لئے اپنے بھائی سکندر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ طولسطائے بیگم پانین[۱] کے مکان میں جو پاس ہی تھا مقیم تھے۔ میں ۲۲ر اکتوبر کو کریمیا پہنچا۔ میں نے سنا تھا کہ طولسطائے اکثر پیدل اور گھوڑے پر سیر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سے ملاقات کے خیال سے میں بے نتیجہ روزانہ ادہر اُدہر گھوما کیا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چل سکتا تو پھر فیصلہ کیا کہ انکے نام ایک پرچہ لکھ کر خود دریافت کروں کہ کیا میں مل سکتا ہوں۔ اسکا جواب میں نے ان سے صاف صاف اور بے تکلفانہ مانگا۔ ادہر زبان پر بات آئی اور اس نے واقعہ کی صورت اختیار کی۔ میں نے ۲۶ر کی صبح کو خط بھیجا اور میرے پاس فوراً جواب آیا کہ میں اسی دن ایک بجے ان سے مل سکتا ہوں۔ میں پہنچا تو بیگم طولسطائے نے میرا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان کے شوہر ابھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے ہیں۔ دو منٹ میں طولسطائے تشریف لے آئے مجھے نہایت محبت سے سلام کیا اور مجھ سے اس بات کی معافی چاہی کہ انہوں نے میرے پرچے کا جواب تحریری نہیں بلکہ ٹیلیفون کے ذریعے دیا۔ لیکن اس کا سبب یہ بتایا کہ وجع مفاصل کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں درد تھا۔ بیگم صاحبہ چلی گئیں، ہم دونوں پاس پاس بیٹھے اور گفتگو شروع ہوئی۔ ان کی جسمانی حالت کے متعلق پہلی نظر میں تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت معمر اور ناتواں ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ خوب تندرست اور

---

[۱] انقلاب سے پہلے بہت رئیس عورت تھی اور اپنی فیاضی اور نیک دلی کے لئے مشہور تھی۔

توانا ہیں۔ انکا لباس سادہ تھا۔ ایک خاکی رنگ کا کرتہ اور پیٹی ۔ اسی رنگ کا چوڑے پائنیچے کا پاجامہ سادے جوتے جن کا اوپر کا حصہ پائنچوں کو ڈھک لیتا تھا ۔ اگر کوئی کہے کہ طولسطائے کا لباس میلا کچیلا اور جسم صاف نہیں رہتا تو اسکا اعتبار نہ کرنا چاہیئے ۔ برخلاف اس کے وہ نہایت صاف ستھرے ۔ ان کے ہاتھ پاکیزہ اور ناخون بالکل ٹھیک ہیں ۔ البتہ ان کی زبردست سفید ریش میں کسی قدر شاعرانہ بے ترتیبی پائی جاتی ہے ۔ مگر اس میں بھی کنگھی کی ہوئی ہوتی ہے جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ ان کی نیلے رنگ کی آنکھیں ہیں ۔ انکی نگاہ دل کے پار ہوجاتی ہے ۔ آنکھیں کسی قدر بیٹھی ہوئی ہیں اور گال خوب ابھرے ہوئے ہیں ۔ اس وجہ سے اور بھی اثر ہوتا ہے ۔ آنکھوں سے خوش اخلاقی اور کسی قدر رنج مگر اس کے ساتھ ہی فہم وعقل پختگی تیز اور اصابت رائے کا اظہار ہوتا ہے ۔ نہ تو ان کی آنکھوں میں کج نگہی اور نہ انکے طرز عمل میں کسی قسم کی خرابی ہے ۔ تمام چیزیں نہایت مناسب اور موزوں ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ دوران گفتگو میں ان کی نگاہ مخاطب پر جمی رہتی ہے ۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب انہیں کسی بات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہو اور اسے وہ تشریح کے ساتھ بیان کر رہے ہوں ان کی نگاہ مخاطب کی آنکھوں پر جم جاتی ہے ۔ مجھے تو ان کی شخصیت بہت ہی بھلی معلوم ہوئی ۔

ہماری گفتگو تین مسائل پر ہوئی :۔

۱۔ زار سکندر اول اور فیودر کسیچ[1] ۔

۲۔ کوہ قاف کے دوخوبور

۳۔ میرا اپنا نجی مسئلہ

---

[1] فیودر کسیچ ۔ پیدائش ۱۷۶۳ء ۔ سکندر اول کی موت کے بعد لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ بوڑھا دراصل سکندر اول ہے ۔ اور سکندر اول کا انتقال ہوا ہی نہیں ۔ ان کی جگہ کسی اور کو دفن کر دیا گیا ہے ۔ بعض مورخین نے بھی اس شبہ کا اظہار کیا ہے ، خود نواب اعظم نے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھی ہے ۔

یہ آخری سوال ان کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا۔ انہوں نے بہت داد دی اور میری طرف محبت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا کہ "یہ سوال بہت نادر اور یہ واقعہ نادر تر ہے" مگر میں اب اس اجمال کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرے موضوع کے سلسلہ میں طفلس کے سابق گورنر نواب شیروا کلدزے کے رویے اور خود طولسطائے نے اس میں جو حصہ لیا اس پر ان میں اور مجھ میں اختلاف تھا۔ یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ طولسطائے اپنی رائے میں پکے تھے اور مجھ پر اعتراضات کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی انکی آواز بلند نہ ہوئی اور اس طرح وہ مجھے ہمیشہ موقع دیتے رہے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ گورنر کے متعلق طولسطائے مجھے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ ویسے وہ نہایت نیک آدمی ہیں مگر حاکم اچھے نہیں۔ دوخوبوروں کے طفلس میں آباد ہوجانے کے بعد وہ حالات کو سدھارنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایک طرف تو ریاست کے تمام کل پرزوں کا ڈھیلا ہوجانا اور دوسری طرف خود طولسطائے کی تعلیمات جن کی وجہ سے اس جماعت کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایسی مشکلات تھیں جنہوں نے نواب کے کام کو بہت دشوار بنا دیا۔

مگر طولسطائے مجھے یہی یقین دلا رہے تھے کہ اس جماعت کو روسی سرحد میں رکھنے کے لئے خود ان سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے کیا۔ مگر جب انہوں نے حکومت کی بے پرواہی کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو ان کی بھلائی کی خاطر انہیں غیر ملک میں جانے کا مشورہ دیا۔ طولسطائے کی رائے میں اب دوخوبور کناڈا میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر میری معلومات اس کے برعکس ہیں، ہاں جب میں نے کہا کہ دوخوبوروں کے نواب شیروا کلدزے سے اب بھی اچھے تعلقات ہیں اور وہ انہیں کنیڈا سے خطوط لکھتے ہیں تو طولسطائے بہت پریشان ہوئے۔ میں نے خاص طور پر طولسطائے کے دو شاگردوں چلکو اور برجکو کا ذکر کیا جو اکثر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور جن کا اس جماعت پر ہمیشہ اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اس پر طولسطائے نے دبی زبان سے

یہ تسلیم کیا کہ ان کے شاگرد انہیں ہمیشہ اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں مگر بہرحال وہ حکام اور عمال سے تو بہتر ہی ہیں۔

سکندر اول پر ہماری گفتگو نے بہت طول کھینچا۔ طولسطائے نے کہا کہ ان کا اپنا ارادہ تھا کہ اس روایت پر جو سکندر اول کی موت اور پھر فیودر کسیچ کے بھیس میں سائبیریا میں زندگی بسر کرنے کے متعلق مشہور ہے کچھ لکھیں۔ اگرچہ ابھی تک اس روایت کی نہ صرف تصدیق نہیں ہو سکی ہے بلکہ اکثر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال طولسطائے کو سکندر اول کی زندگی سے بہت دلچسپی تھی اور واقعی اس میں بہت کچھ جدت، الجھاؤ اور دورنگی پائی بھی جاتی ہے طولسطائے کے خیال کے مطابق اگر سکندر نے اپنی زندگی تنہائی ہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی تو واقعی اس نے پورا پورا جرمانہ ادا کر دیا۔

اسی سلسلے میں ذاتی فراج کی بحث چھڑ گئی جس کے متعلق مجھے خاموشی اختیار کرنی چاہئے اس کے بعد ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہوئی جنہیں ہم دونوں جانتے ہیں مثلاً بیگم ہیلینے اولوناشو والوا اور بیگم الیزابتھا اونا چرتکوزا۔ یہ دونوں لارڈ رڈ اسٹوک[۱] اور پچکو[۲] کی تعلیمات کی پیرو ہیں۔ ان تعلیمات کے بارے میں طولسطائے نے کہا کہ چاہے ان کی نیت اچھی ہو مگر ان کی تعلیمات بنیادی طور پر غلط اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے رخصت چاہی۔ پہلی ملاقات میں میں انکا زیادہ وقت نہ لینا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے دروازے تک پہنچایا اور کہا کہ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔

دوسری مرتبہ شام کے کھانے سے قبل میں طولسطائے سے ملنے گیا۔ انہوں نے

---

[۱] انگریز نواب۔ ایک طرح کے مذہبی و اخلاقی استباغ کا مروج۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے بہت سے پیرو تھے۔

[۲] لارڈ رڈ اسٹوک کی موت کے بعد اس کے خیالات کی اس شخص نے روس میں ترویج و اشاعت کی۔

مجھے اوپر خلوت خانہ میں بلایا ۔ اور میرا ان الفاظ سے استقبال کیا : ۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے حد درجہ مسرت حاصل ہوئی ۔ مجھے آپ کا انتظار تھا میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کچھ کر رہے ہیں اس پر آپنے اچھی طرح غور بھی کر لیا ہے کہ نہیں ؟ اس لئے کہ آپ مجھ سے پہلی مرتبہ ملے تھے ۔ میں بذات خود طاعون ہوں ۔ مجھے کلیسا سے نکال باہر کیا گیا ہے ۔ لوگ مجھ سے خوف زدہ ہیں اور آپ پھر بھی میرے پاس آتے ہیں ۔ میں پھر دہرا دوں کہ میں طاعون ہوں ۔ مجھے ایک طرح کی وبا خیال کیا جاتا ہے ۔ آپ کو میری وجہ سے کہیں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ لوگ آپ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھیں گے کہ آپ ایسے شخص سے ملتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے بہت مشکوک ہے ۔"

اس غیر متوقع تمہید کا جواب میں نے یہ دیا کہ "میری عمر اس وقت ۴۲ سال کی ہو چکی ہے ۔ شادی میری ہوئی نہیں ۔ لوگ مجھ سے خوب واقف ہیں ۔ مجھے نتائج کا ذرہ برابر خوف نہیں ۔ اور پھر جہاں تک حکومت کا تعلق مجھے اس کے متعلق آپ کی نسبت ذرا زیادہ حسن ظن ہے ۔"

پھر وہی دوخوبورون اور شیر واشدنرے کا قصہ شروع ہوا ۔ مگر طولسطائے میری رائے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ میں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ان کو اپنے مختلف النوع شاگردوں اور پیروؤں کی بات ہمیشہ بلا چون و چرا نہ تسلیم کر لینا چاہئے ۔ ان کی وجہ سے طولسطائے کی حیثیت نازک ہو جاتی ہے ۔ اکثر تو یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور اکثر ان کا عمل طولسطائے کی مرضی کے سراسر خلاف ہوتا ہے ۔ طولسطائے اپنے شاگردوں میں سے جرتکو[۱] اور برجلکو کو نہایت ہوشیار اور عقلمند تصور کرتے ہیں ۔

ان میں سے پہلے سے میں بھی واقف ہوں ۔ گو وہ صاف دل ، ایمان دار اور مخلص سہی مگر میری رائے میں وہ غیر معمولی طور پر کم سخن ہیں ۔ اس کے بعد ہم نے وقت کی مشہور

---

[۱] طولسطائے کا مشہور شاگرد اور اس کی تصانیف کا ناشر ۔

شخصیت میکا اسٹاخووچ[۵۱] اور مسئلہ ضمیر پر اس کی جو معرکۃ الآرا تقریر ہوئی ہے اس پر گفتگو شروع کی۔ اگرچہ طولسطائے کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ روس کو آزادیٔ ضمیر حاصل ہو جائے مگر میکا اسٹاخووچ کے متعلق ان کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ اسے شہرت کا بندہ اور کم ظرف انسان تصور کرتے ہیں مجھے یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی اس لئے کہ میری بھی اس کے متعلق یہی رائے تھی۔ کہ وہ محض ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہتا ہے ورنہ اسے خود اپنی بات پر یقین نہیں!

پھر روس کی موجودہ صورت حال مثلاً انتشار حکومت، طریق کار کا فقدان، وزرا کی ضد اور ناعاقبت اندیشی۔ سپ یاگنس[۵۲] کی ناقابلیت۔ وٹس کی گستاخی۔ عام لا مذہبیت وغیرہ پر بات چیت ہوتی رہی۔ طولسطائے نے لا مذہبیت پر بہت تفصیل سے گفتگو کی اور اسی کو تمام موجودہ مصیبتوں کی اصل وجہ قرار دیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی تصانیف کے اکثر قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ آپ روح کے دوام کے قائل ہیں" تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "کیا واقعی ان میں سے بعض کی یہ رائے ہے اور میرے خیالات کی وہ اس طرح تعبیر کرتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے تو سوائے افسوس کے میرے لئے اور کیا چارہ کار رہے۔ مجھے خود اس بات کا احساس ہے کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں مجھے اب پہلے کی طرح القا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری لے دے کر ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں بنی نوع انسان کی مدد کروں۔ آج کل

---

۵۱ مجلس قانون ساز کا رکن۔ رئیس۔ خیالات میں لبرل "آزادیٔ ضمیر" پر تقریر کرنے کے بعد تمام روس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں بحالت ہجرت انتقال ہوا۔

۵۲ ۱۹۰۰ء میں وزیر داخلہ مقرر ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں کسی اجتماعی نے کام تمام کر دیا۔

۵۳ مشہور سیاسی۔ وزیر مال

میں ایک کتاب " ایمان " کی تصنیف میں منہمک ہوں ۔ میری آرزو ہے کہ اسے میں اپنی موت سے پہلے تکمیل کو پہنچا دوں ۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہو گی اگر میں موت سے پہلے اسے اختتام تک پہنچا سکا ۔ تقریباً دو تہائی حصہ ختم ہو چکا ہے ۔ ایک تہائی باقی ہے ۔ مگر اس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہے ۔ طبیعت موزوں ہی نہیں ہوتی ۔ اکثر بیمار رہتا ہوں اور اسی وجہ سے یہ کام پڑا ہوا ہے "

طولسطائے کی گفتگو میں موت کا اکثر ذکر آیا گیا ۔ یہ سوال اس وقت انہیں بہت پریشان کر رہا ہے ۔ گو وہ صاف صاف نہیں کہتے مگر پھر بھی انہیں اپنی زندگی کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا ہے اسکا اظہار اکثر انکے الفاظ سے ہو جاتا ہے ۔

اس دفعہ میری ملاقات ٹھیک دو گھنٹے تک جاری رہی ۔ اور ہمیں دونوں میں گفتگو ہوا کی ۔ طولسطائے کی گفتگو کا وہ حصہ خاص طور پر دلچسپ تھا جو سکندر اول کی سوانح اور اس کے عہد کی عام زندگی سے متعلق تھا ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ناول " جنگ و صلح " کا بھی ذکر کیا ۔ اس تمام بات چیت کا مجھ پر جو خاص اثر ہوا وہ یہ تھا کہ مجھے یقین آگیا کہ وہ بالکل بے تکلفانہ بول رہے ہیں اور انہیں میرے سامنے کسی طرح بننے کا خیال نہیں ۔ انہوں نے نہایت بے باکی سے تمام مسائل پر گفتگو کی اور میں ان کی ملاقات سے حد درجہ متاثر ہوا ۔

جس روز میں وہاں سے رخصت ہونے والا تھا تو صبح کے پہر میں آخری مرتبہ اس قابل تعظیم بزرگ سے ملاقات کی غرض سے گیا ۔ ملاقات کا سلسلہ پھر گھنٹہ بھر رہا ۔ اس مرتبہ طولسطائے نے جنگ کریمیا (۱۸۵۳-۱۸۵۶ء) کا تفصیل سے ذکر کیا جس میں وہ خود نوجوان کی حیثیت سے شریک تھے ۔ اور جس میں سے محاصرہ سیباسٹوپل کا انہوں نے اپنی بعض مشہور تصانیف میں بھی ذکر کیا ہے ۔ یہ یادگار انکے حافظے میں اس طرح محفوظ ہے کہ واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ اور اس کے سننے میں طبیعت کو عجیب حظ حاصل ہوتا ہے ۔

اس کے بعد انہوں نے موجودہ زار نکولاؤ دوم کا ذکر کیا ۔ طولسطائے کو ان سے بہت ہمدردی ہے اور وہ ان کی بڑی خوشی سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ انہیں شہنشاہ نہایت بھلے مانس ۔

نیک طبیعت اور مدد کرنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ساری مصیبت انکے اردگرد کے لوگ ہیں۔ انہوں نے مرحوم زار سکندر سوم کا بھی اچھے الفاظ میں ذکر کیا اور کہا کہ "اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ ذلیل پادری مجھے کلیسا سے نکال باہر نہ کرپاتے" پھر انہوں نے مجھ سے میرے والد [۱] کی خیریت دریافت کی جن سے ان کی ملاقات ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں فوجی افسر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ طولسطائے نے انکے مزاج کی بابتہ دریافت کیا اور یہ سب اتنے پیارے اور بھلے انداز میں کہ میں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طولسطائے کو "نراجی" کہنا ظلم ہے۔ ایک بات اور کہہ کر میں مقدمہ ختم کرتا ہوں اور وہ یہ کہ طولسطائے، مصنف کی حیثیت سے ایک ہیں اور انسان کی حیثیت سے دوسرے۔ اور میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ انہیں بچشم خود دیکھ سکا۔

- - - - - - -

۵ اپریل کو طولسطائے نے نواب اعظم کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا ہے:۔

مہربانم نکولائی میکائیلوویچ۔ مجھے آپ کا تار ملا۔ میں فوراً ہی جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھے صاحب فرش ہونا پڑا۔ دو مہینے تک بستر سے اٹھنے اور قلم ہاتھ میں لینے سے قاصر رہا۔ فوراً میں یوں لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ آپ نے میری درخواست پوری کی باوجود اس کے کہ اس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور جو خط آپ نے پہنچایا ہے اور جسے آپ نے غالباً میری درخواست کے بموجب پڑھا بھی ہوگا، وہ آپ کے خیالات کے صریح مخالف اور طبیعت کو ناگوار رہا ہوگا۔ اگر اس میں میں غلطی پر ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ میرے شکوک کو معاف فرمائیں، بہرحال آج جبکہ پہلی مرتبہ طبیعت سنبھلی ہے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چرتکو کے ذریعہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرا خط خندہ پیشانی کے ساتھ وصول کیا گیا (یہ بہت خوب) اور یہ وعدہ کیا گیا کہ اسے کسی کو نہ دکھایا

---

[۱] یعنی نواب اعظم میکائیل نکولائیوویچ، زار سکندر کے بھائی جو عرصہ تک کوہ قاف کے حاکم رہے۔

جائے گا۔ مگر میں نے تو اس قسم کی کوئی درخواست نہ کی تھی۔ اب آپ نے اسے ضروری خیال کیا تو آپ کے پاس اس کے وجوہ بھی ہوں گے اور مجھے اس میں کوئی خاص عذر نہیں۔

اب میں اپنے بعض ان خیالات کی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے اور جو میں خط میں اچھی طرح نہ کر پایا تھا۔ اور یہ اس امید پر کہ اگر آپ میرے ہم خیال نہ بھی ہو جائیں تو کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ سکیں اور میری تجاویز کو ایک غیر عملی شخص کے تخیل کی بلند پروازی نہیں۔ (اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکاری حلقوں میں مجھے یوں ہی سمجھا جاتا ہے) بلکہ سنجیدہ اور طویل فکر و خیال کا نتیجہ سمجھیں۔ میرا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو اس مطلق العنانی کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت ترقی کی ان تمام خواہشات کو جن کے حصول کی کوشش میں لوگ لگے ہوئے ہیں اپنا بنالے اور اپنی قوت سے رعایا کے مقاصد کی تکمیل کرے۔ میرے خیال میں روسی قوم کے سامنے اس قسم کا جو مطمح نظر اب تک رہا ہے اور آج بھی یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلانی چاہئے۔ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی اور لکھا جائے گا۔ مگر بنیادی طور پر اس سوال سے امریکن مصنف ہنری جارج نے اپنی بڑی کتاب "ترقی اور افلاس" اور چھوٹے سے رسالے "اجتماعی مسائل" میں بحث کی ہے۔ یہ سوال میرے خیال کے بموجب اسی قدر اہم اور حل کا محتاج ہے جتنا اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں غلامی کا مسئلہ تھا۔ مگر وقت یہ ہے کہ آج اسکا حل تو درکنار اسکا ذکر بھی بدیں وجہ ممنوع ہے کہ یورپ اور امریکہ کے امراء اور امرا ہی نہیں تمام جائداد رکھنے والے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہے اس بات کے کوشاں ہیں کہ یہ مسئلہ یہیں کا یہیں ختم کر دیا جائے اور اس پر سرکاری حلقوں میں گفت و شنید بھی نہ ہو۔ اس مسئلہ کا حل صرف روس میں مطلق العنانی کے وجود کی وجہ سے ممکن ہے اور روس میں اسے خاص اہمیت بھی حاصل ہے اس وجہ سے کہ روسی قوم کا بڑا حصہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے اور اس کے لئے زمین کی کمی اور غیر مساوی تقسیم نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہنری جارج کا بتایا ہوا طریقہ جسے "وحدانی طریقہ مالگذاری"

کہا جاتا ہے اور جس کا غالباً آپ کو علم ہوگا نہایت آسان اور قابل عمل ہو - اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تمام زمین پر اس کی پیداوار کے مطابق لگان مقرر کر دیا جائے جو زمین جوتنے والے سرکار کو خود ادا کر دیا کریں - یہی ریاست کی آمدنی ہو، اور وہ تمام دوسری محصولوں کی جگہ لے لیں اس کا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ سرکاری فرمان کی رو سے ایک مرکزی بورڈ اس غرض سے بنایا جائے جو زمین پر سے شخصی ملکیت اٹھالے - اور حکومت کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو زمین پر لگان لگائے اور دوسرے امور کی انجام دہی کرے - جو روسی شہنشاہ صرف روسیوں کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے یہ خدمت انجام دے گا وہ کتنا بڑا کام کرے گا - اور وہ کتنی خوبی کے ساتھ روز کے اجتماعیوں کے جھگڑے اور انقلابیوں کی چالبازیوں سے محفوظ ہو جائے گا - وہ اپنے آپ کو اپنی جگہ پر کس قدر محفوظ محسوس کرے گا - قوم کے بہترین افراد اسے مدد دیں گے اور اسی طرح عام رعایا جو اپنی سب سے اہم اور دلی خواہشات کو اس کے ذریعے پورا ہوتے ہوئے دیکھے گی - اور وہ خواہش یہی ہے کہ ہر شخص اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے زمین سے اپنی خوراک حاصل کرے جو خدا نے کسی ایک کو نہیں بلکہ بلا تفریق ہر ایک کو عطا کی ہے - یہ ہی میرا ایمان - مگر جیسا میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں یہ بہت ممکن ہو کہ میں غلطی پر ہوں اور کوئی اور مطمح نظر ہو جسے حاصل کرنے کی دھن میں انسان لگا ہوا ہے اور جو حکومت کا بھی مطمح نظر ہونا چاہئے یہ تو ممکن ہے مگر ایک چیز بہر حال ناممکن ہو اور وہ یہ کہ ایسی حکومت ہرگز زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی جو موجودہ طریقہ پر چل رہی ہے، جو اپنی زندگی میں لوگوں سے بے تعلق ہو چکی ہو اور جو اپنے آپ کو رعایا کی خدمت کے لئے پیش کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ رعایا کی اس مقصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کا حصول واقعی اسے خوشحالی دے سکتا ہے -

کل سپایگنس[1] کے قتل کی اطلاع ملی - یہ واقعہ بہت تکلیف دہ ہے - خاص طور پر نفرت

---

[1] ۱۸۵۳ء تا ۱۹۰۲ء وزیر داخلہ - ۱۹۰۲ء میں کسی انقلابی نے قتل کر دیا۔

غصہ اور انتقام کے ان جذبات کی وجہ سے جنہوں نے اسکا ہونا لازمی بنا دیا - یہ بات بہر حال ایک دن ہونیوالی تھی - اور اگر حکومت نے اپنے رویہ میں پوری پوری تبدیلی نہ کی تو در اصل یہ اور بھی آنے والی تباہی کا پتہ دیتی ہے - کامل نظم و نسق صرف معقول سمجھوتے اور محبت پر قائم ہو سکتا ہے۔ قوت، مقاتلہ اور انتقام پر کسی چیز کی بھی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی -

مجھے معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کو اتنا بڑا خط پڑھنے کی تکلیف دی، مگر اس سے میرا مقصد صرف اس قدر تھا کہ آپ میرے مطلب کو سمجھ سکیں - کچھ تو کمزوری کی وجہ سے جس کا اندازہ آپ اسی سے کر سکتے ہیں کہ میں لیٹے لیٹے لکھ رہا ہوں اور خاص طور پر سپ یاکنس کے مظلومانہ قتل کے واقعہ کی وجہ سے میں غیر معمولی بے قراری محسوس کر رہا ہوں - یہ واقعہ جانبین میں دشمنی اور سختی کے جذبات کو اور بھی بھڑکائے گا حالانکہ اس کو دور کرنا کس قدر آسان تھا -

اچھا اب رخصت - میں تہ دل سے آپ کی جسمانی تندرستی اور روحانی مسرت و اطمینان کی دعا کرتا ہوں -

آپکا مخلص

لیو طولسطائے

ان خطوں کے جواب میں نواب اعظم نے طفلس سے دو خط لکھے ہیں جہاں ان دنوں انکا قیام تھا - پہلا خط ۵ ار نومبر کا لکھا ہوا ہے :-

صدیقی لیو نکولائیوچ - آپ کے خط نے جو مجھے کل ملا - مجھے حد درجہ خوشی بخشی - ایک تو اس وجہ سے کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ اب اتنے تندرست ہیں کہ خط لکھ سکیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ مجھے آپ کے جس خط کا انتظار تھا وہ عین ایسٹر کے موقع پر ملا - آپ کی صحت کے متعلق اب تک جو اطلاعات شائع ہوئیں انکا میں بڑی توجہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں اور خیال تھا کہ میں خود اب اپنی خاموشی کو توڑوں اور ڈھائی مہینے کے بعد کہ اس زمانہ میں سفر بھی کیا اور آرام بھی - آپ کو پھر اپنی بکواس سے تکلیف دوں -

اب آپ اپنے خط کا جواب سنئے ۔ ۲۲ جنوری کو جب میں پیٹرس برگ پہنچا تو دوسرے ہی دن آپ کا خط ملا ۔ ظاہر ہے کہ اسے میں نے پڑھا ۔ اس کی ایک نقل کی اور خیال کیا کہ میں اسے بلا پس و پیش اس تک پہنچا سکتا ہوں جس کے نام وہ لکھا گیا تھا[۱]

جب میں نے قیصر سے پوچھا کہ کیا میں خط آپ تک پہنچا سکتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا "یقیناً" ۔ چنانچہ تین دن کے بعد جب ایک خاندانی دعوت ہوئی تو اس کے اختتام پر میں نے خود انہیں آپ کا خط دے دیا ۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی طرف سے یہ بھی کہا کہ "لیو نکولائے وچ کی عزت کے خیال سے میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں جسے اگر شرف قبول بخشا گیا تو مجھے دلی مسرت ہوگی ۔ اور وہ درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے وزرا میں سے کسی کو بھی یہ خط پڑھنے کے لئے نہ دیں ۔ یہ میری اپنی درخواست ہے" قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ خط کسی کو نہ دکھائیں گے اور فرمایا کہ وہ اسکا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے ۔ اس کے بعد مجھے کوئی اور موقع نہ مل سکا کہ میں اس خط پر ان سے گفتگو کر سکتا اور خود اس موضوع پر ان سے گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا ۔

میں اس بات سے ان کی نوازش کا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے خط پہنچانے کی اجازت دی اور پھر اسے بڑی مہربانی کے ساتھ راز میں رکھنے کا وعدہ کیا ۔ ہمارا قیصر واقعی نہایت نیک دل اور دوسروں کی مشکل میں کام آنے والا انسان ہے ۔ ساری مصیبت تو وہ لوگ ہیں جو اس کے رازدار ہیں ۔ میں نے جب قیصر سے درخواست کی کہ وہ خط کسی اور کو نہ دکھائیں تو یہ محض آپ کی عزت کے خیال سے تھا ۔ اور اس خواہش کی بنا پر کہ ہزار قسم کی افواہوں اور وزرا کی تشریحات کا سدباب ہو سکے جن کا ہمیشہ یہ مقصد رہتا ہے کہ وہ قیصر کے سامنے آپ کی نہایت بھیانک تصویر پیش کریں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے ۔

---

[۱] یعنی زار نکولائی دوم کے نام

موجودہ حکومت اور مادر وطن کو اس انتشار کی حالت سے نکالنے کے لئے آپ اپنے ۵ راپریل کے خط میں جو نسخہ تجویز کرتے ہیں اس کے متعلق اگر آپ براہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ کا تخیل بہت زیادہ بلند ہے۔ اور اس کے محض تخیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ روس میں اس بات کو ممکن سمجھتے ہیں جس کا یورپ اور یہانتک کہ امریکہ میں بھی کوئی شخص خیال تک دل میں نہیں لاتا۔

مانا کہ ہر کسان اپنی چھوٹی سی ملکیت کا خود ہی ذمہ دار ہو اور اسکا لگان ادا کرے۔ مگر جہانتک میں سمجھ سکا ہوں آپ کا منشا تو یہ ہے کہ تمام جائداد مع اپنی تمام آمدنی کے ریاست یعنی شاہی خزانہ کی ملک ہو جائے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مالکوں کی پوری جماعت یعنی ہر قسم اور رتبے کے مالک اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی کا ایک حصہ انکے لئے مخصوص ہوگا اس پر راضی بھی ہو گئے تو آپ کو خود کسانوں کی نہایت خوفناک مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اتنے عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لئے ایک غیر معمولی زار کا وجود لابدی شے ہے۔ مثلاً پیٹر اعظم پھر اس کے ساتھ ایسے ہی دوسرے مدد کرنے والے ہوں نہ کہ وہ جو آج نکولاؤ دوم کے احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔ آج وہ محکمے جن کے قیام کو سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں، مجلس قانون ساز، مجلس مدبرین اور وزارت، ان کی از سر نو اصلاح اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لئے یہ اشد ضروری امر ہے۔

میں اس موضوع کو اسپر ختم کرتا ہوں کہ آپ کے خیالات جس قدر بلند اور ہمدردانہ ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اسی قدر دشوار ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ "کل جگ" اصلاح کا محتاج ہے۔ مگر اصلاح قابل ہونا چاہئے نہ کہ عجلت پسندانہ۔ اب سب سے اہم سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اصلاح کا کام شروع کہاں سے کیا جائے۔ کتنے مسائل ہیں۔ تعلیم، تربیت، مدرسین، اساتذہ مزدور، نقصان پہنچانے والے افسر، جماعت حکام، عام مصیبتیں، دولت پیدا کرنے کا سوال ناقابل برداشت فوجیت، ضابطہ کا فقدان۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل کیا کم ہیں کہ آپ کا منشا کے

کی اصلاح کا مسلہ بھی چھیڑنا ممکن خیال کرتے ہیں۔ انسان جماعت کا ساتھ دے کر ہی تو لڑائی لڑ سکتا ہے مگر آپ کو اس کی کوئی نہیں کہ آپ اس معاملہ میں تنہا ہیں۔ اس لیے کہ جب آپ کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا سوال آئے گا تو وہ لوگ بھی جو آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ میرے خیال میں تو ہماری سوسائٹی اس قدر قعر مذلت میں جا چکی ہے کہ اس کی اصلاح صرف حکومت کی مستحکم اور مسلسل کوشش اور اس کی پوری پوری رضامندی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ میری رائے میں شہنشاہیت اب بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو ۱۳ کروڑ انسانوں کے سامنے کم کرے اور وزرا کی ذمہ داری بڑھاوے۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ انیسویں صدی میں زندگی اور اس کی ضروریات کہیں آگے نکل گئیں مگر ہمارے سرکاری محکمے وہیں کے وہیں رہے۔ اس کی اگر اصلاح ہوئی اور اسے پھر زندہ کیا گیا تو پھر اسکا بھی امکان ہوگا کہ اس پیچیدہ مسلہ پر جو آپ نے چھیڑا ہے غور کیا جائے اور یہ بلند تخیل خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہن سکے۔

آپ کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سپاگنس کے قتل کی وجہ سے جوش اور غصے کے ایسے جذبات پیدا ہوں جو نہ ہونے چاہئے تھے۔ اب مجھے تو یہ دیکھنے کا شوق ہے کہ پلیوے[1] معاملہ کو کیونکر طے کرتا ہے۔ مجھے تو فن لینڈ اور کوہ قاف میں اچھی علامات نظر آ رہی ہیں۔ خدا کرے میں اپنے اس خیال میں غلطی پر نہ ہوں۔ اب وانوسکی[2] کے استعفے پر کیا رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ کیا اپنی ہر دلعزیزی کی خاطر اور خود اپنی مرضی سے اپنے قیصر کو ایسے وقت میں خیرباد کہنا

---

[1] ورک۔ پلیوے۔ جو سپیاگنس کی جگہ وزیر داخلہ مقرر ہوا تھا اور ۱۵ جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک انقلابی کے ہاتھ مارا گیا۔

[2] وانوسکی (۱۸۲۲ء تا ۱۹۰۴ء) ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۸ء تک وزیر جنگ تھا، اس زمانہ میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ ۱۹۰۱ء میں جب وزیر تعلیم کے قتل کا واقعہ ہوا تو اسے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ ایک سال تک نوجوانوں کی انقلابی تحریکوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی جگہ سے مستعفی ہو گیا۔

اور اس کے لئے اور دشواریاں پیدا کرنا مناسب تھا؟

مگر میں نے اپنے خط کو بہت طول دیا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ اسے پڑھتے پڑھتے تھک نہ جائیں۔ میں اس طویل تحریر کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے لکھئے۔ مجھے جانچ پڑتال کا ذرہ برابر خوف نہیں اور مجھے آپ سے گفتگو کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔ آپ کی ۵ر نومبر کی سطروں کا تہ دل سے شکریہ جنہوں نے مجھے اطمینان اور یقین دلایا ہے کہ آپ کے دل میں میرے لئے جگہ ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد دوبارہ تندرست و توانا ہو جائیں۔ آپ اپنی صحت کا بہت خیال رکھئے۔ اور بغیر سوچے سمجھے زیادہ تفریح کے لئے باہر نہ جائیے۔ نہ پیدل اور نہ گھوڑے پر۔ براہ کرم اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پہنچا دیجئے۔ میں آپ سے پوری قوت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا نہایت ہی مخلص

نکولا ئیوِیکا ئیلووچ

نواب صاحب کا دوسرا خط یہ ہے:-

جینیبی لیو نکولائی وچ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ملیریا کے حملہ کی وجہ سے دوبارہ کمزوری محسوس کر رہے ہیں۔ مگر امید ہے کہ موسم گرما کے ساتھ ساتھ آپ کی قوت بھی عود کر آئے گی۔ آپ نے از راہ کرم مجھے جو خط لکھا ہے اس میں اس قدر اہم، بنیادی اور دلچسپ سوالات سے بحث کی گئی ہے کہ میں نے اسے کئی بار پڑھا، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں آپ سے بہت سی باتوں میں متفق نہیں ہو سکتا۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ہنری جارج کی کتاب کے متعلق پوری معلومات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے مطالعہ سے قاصر رہا اور میرے ذہن میں اس کتاب کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ مجھ پر اتنی نوازش کیجئے کہ مجھے اس کتاب کا روسی یا فرانسیسی ترجمہ بھیج دیجئے۔ اس لئے کہ اگر میں انگریزی میں پڑھوں تو جلد پڑھنے میں بہت سے الفاظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اختلاف کی دوسری وجہ غالباً زراعتی معاملات سے میری

ناواقفیت ہی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر میرے تمام دلائل کچھ زیادہ وقیع نہیں ہو سکتے۔ اور خصوصاً آپ کے سامنے کہ آپ نے اتنی کثرت کے ساتھ اور بغیر دم لئے ہوئے ان مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ تجربہ اور علم اشیا آپ کی پشت پر ہیں اور میری طرف صرف مباحثہ کی قابلیت۔

اگر مجھے روزانہ کے مسائل سے دلچسپی ہو بھی تو میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ میں اس کی طرف صرف اس وقت توجہ کرتا ہوں جب مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد کیجائے۔ لیکن آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے ان معاملات سے کتنا واسطہ ہے اور پیٹرس برگ کے سرکاری حلقوں سے میں اپنے آپ کو کس قدر دور رکھتا ہوں۔ لہٰذا مخلوق کے معاملات میں کسی طرح کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کا سوال تو جاتا رہا۔ البتہ میں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر نظریے بنا سکتا ہوں اور آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھ سے خط وکتابت پر آمادہ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے آپ نے گذشتہ خزاں کے موقع پر مجھ سے چند گھنٹوں کے لئے ملاقات کی ہے اور آپ کا دل میری طرف سے مطمئن ہو گیا ہے۔ اس وقت سے آپ میرے حال پر جو عنایت فرماتے ہیں اسے میرا دل اچھی طرح محسوس کرتا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ مسائل پر خط وکتابت، آمنے سامنے گفتگو کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کی نسبت بدرجہا دشوار ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ نہ معلوم اسکا موقع مل سکے گا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور جی بھر کے گفتگو کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت میں آپ کے پیش کردہ مسائل کے متعلق مجھے جو غلط فہمیاں یا شبہات ہیں وہ فوراً رفع ہو جائیں گے۔ مگر کاغذ پر یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آپ کے خط کی بعض باتوں کا جواب نہ دوں:-

۱۔ اگر آپ مطلق العنان حکومت کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی زراعتی اصلاحات کر سکے جن کا خاکہ ہنری جارج نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے تو پھر گویا آپ اس کی موجودہ ساخت کو بھی اس قابل سمجھتے ہیں۔ مگر آپ تو خود ہی فرماتے ہیں کہ موجودہ اہل کار اس قابل نہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے۔ اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ صاف ہے۔

یعنی یہ کہ ان کی جگہ اوروں کو مقرر کرنا چاہیئے ۔ مگر کیسے ؟ کیا شاہ نکولاؤ دوم کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ حکومت کا تمام عملہ بیک وقت بدل سکے ؟ آپ پرانے محکموں کو پرانے زمانہ کی یادگار تو سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ " پرانی قمیص پر نئے پیوند لگانا ،، آپ مناسب نہیں خیال کرتے ۔ پھر میری سمجھ میں کوئی دوسرا حل نہیں آتا کہ نئے عناصر کیونکر ان اجسام میں داخل کئے جا سکتے ہیں جو اپنی زندگی ختم کر چکے ہیں ۔

۲ ۔ اب فرض کیجئے ہمیں ایسے اشخاص مل بھی گئے کہ جو کام کر سکیں اور روس سے اچھی طرح واقف ہوں ۔ (یہ دوسری شرط میں اپنی طرف سے لگاتا ہوں) آپ کے خیال میں تو ایسے لوگوں سے " روس بھرا پڑا ہے ،، مگر میں اسے بآسانی یقین نہیں کر سکتا ۔ میری رائے میں یہ بہت مشتبہ امر ہے ۔ مگر پھر بھی فرض کیجئے کہ آپ کو ایسے اشخاص مل گئے تو کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ان تمام کے تمام دس یا بیس عہدہ داروں کے دل میں بھی زراعتی اصلاح اور اس کے فوائد کا خیال گھر کرلے ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر نکولاؤ دوم کے ذہن میں آپ کی تجاویز کے فوائد آ گئے اور اس نے انہیں پورا بھی کرنا چاہا تو سب سے پہلے راہ میں جو رکاوٹ آتی ہے وہ عہدہ داروں کا انتخاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ پھر وہی " گھڑیال ، راج ہنس ، اور جھینگے ،، کی کہانی اپنے آپ کو دہرائے گی ۔

۳ ۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو لکھا ہے کہ اس قسم کی بلند پایہ اصلاح کے لئے (اگر اسے عنقا نہ سمجھا جائے) تو پیٹر اعظم جیسی شخصیت کی ضرورت ہے یعنی ایسا شہنشاہ جو قوی ہو ، آزاد ہو ، اپنی تجاویز پر آخری دم تک اڑا رہنے والا ہو اور پھر لوگوں کے انتخاب کا ملکہ رکھتا ہو ۔ محض نیکی اور خوش خلقی کے ذریعہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس میں سے عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اس پر میرا پورا پورا یقین ہے ۔ اس لئے کہ شہنشاہ کی یہ خوبیاں دراصل اس کی مطلق العنانی کے قیام کی بنیادیں ہیں ۔

۴ ۔ حقیقت یہ ہو کہ انسان کی موجودہ حالت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیئے اور یہ نہیں کہ

زار نکولاؤ دوم سے ناممکنات کا مطالبہ کیا جائے ۔ ضروری یہ امر ہے کہ اس کی مدد کی جائے ۔ اور یہی ہر اس روسی کا اولین فرض ہے جو اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کو عزیز رکھتا ہے ۔ ہاں ابھی پھر اعلیٰ محکموں کی نئی اصلاحات کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا ۔ یہ کام وزرا کے ذمہ کر دینا چاہئے ۔ مگر آپ پوچھیں گے کہ وہ کس کے سامنے ذمہ دار ہوں ؟ اسکا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ رائے عامہ کے سامنے کوئی وجہ نہیں کہ سرکاری اطلاعات میں مجلس قانون ساز کے اجلاس اور اس کے محکموں کی ٹھیک ٹھیک کارروائی شائع نہ کی جائے ۔ جب ہر وزیر کو اس کا علم ہوگا کہ جو لفظ بھی اس کی زبان پر آئے گا ۔ اس کا رعایا کو علم ہو جائے گا ۔ تو پھر اسے کہنے سے پہلے ذرا اچھی طرح غور کر لینا ہوگا ۔ اس صورت میں کام کی مقدار زیادہ ہو جائے گی اور فضول گوئی کم ۔ اور اسی سے ایک طرح کی اخلاقی جوابدہی کی ابتدا ہو سکے گی ۔ ایک طرف زار کے سامنے اور دوسری طرف پبلک کے سامنے ۔

موجودہ محکموں کی تعداد اور یہ تمام لکھا پڑھی جو حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے کیوں نہ کم کر دی جائے ؟ اور ایسے حکام جو بے لگام چھوڑ دئے گئے ہیں اور جن کی حیثیت اس کیڑے کی سی ہے جو درخت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے ۔ وہ حکام جنہیں جب بھی موقع ملتا ہے حکومت کے نام پر بٹہ لگاتے ہیں ان کو کیوں نہ اچھی طرح قابو میں رکھا جائے ؟ بہت کچھ جو ابتک زار کی آنکھ سے پوشیدہ ہے پھر وہ اس کے سامنے آئے گا ۔ اور اس کی آنکھیں کھلیں گی ۔ تب اس کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ معتبر اور اپنی مرضی کے مطابق حکام کا انتخاب کرے ۔

اس طرح تمام اعلیٰ محکموں کی از سر نو ترتیب کے ساتھ نئے لوگ بھی خود بخود سامنے آئیں گے اور شاید آپ کی تجاویز واقع کی صورت اختیار کر سکیں گی ۔ گذشتہ صدی میں بھی آخر لوگ تھے ہی جو اس بات کے کوشاں تھے کہ زندگی میں نئی روح پھونکیں ۔ کیا آپ کی نظر اسپرانسکی[۵۱]

---

۵۱ اسپرانسکی ۔ (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۹ء) مشہور روسی سیاست داں ۔ روس میں بہت سی اصلاحات کا

ن۔ س۔ موردوینو[۵۱] نواب کانکران[۵۲]، ن۔ ا۔ ملیوتن[۵۳]۔ اور خود قیصر سکندر دوم کی شخصیتوں پر نہیں جاتی؟۔ اس طرح زار سکندر سوم نے اپنے خاص روسی انداز میں تمام چیزوں کو روسی رنگ دینے کی کتنی کوشش کی؟ اندرونی سیاست میں ہمیشہ ریاست کی بھلائی ان کے پیش نظر رہی اور بیرونی سیاست میں ان کے ۱۳ سالہ عہد میں روس نے وہ حیثیت حاصل کی جو اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری روسی زندگی میں مطلق العنان بادشاہ کو کتنا اہم درجہ حاصل ہے۔ مگر میں پھر دہرادوں کہ محض نیکی اور نرمی سے کام نہیں چل سکتا۔

میں نے پھر اپنے شبہات اور بعض فروعات کے بیان میں طول کو بہت دخل دیا اور پھر بھی مجھے خوف ہے کہ میں آپ کو ذرہ برابر بھی مطمئن نہیں کر سکا ہوں۔ مگر میں دوبارہ عرض کروں کہ میں ہمیشہ وہی ایمانداری کے ساتھ لکھ دیتا ہوں جو کچھ میرے دماغ میں آتا ہے۔ بہر حال اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں کہ موجودہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی نہیں۔ اور اگر یہ دھرا یوں ہی چلتا رہا تو تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اب اس مرض کے علاج کے متعلق مجھ میں اور آپ میں اختلاف ہے۔ میرے لئے یہی بات اطمینان بخش ہے کہ میں آپ سے صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور آپ اسے صبر کے ساتھ سن لیتے ہیں۔

ذمہ دار۔

[۵۱] نواب ن۔ س۔ موردوینو (۱۷۵۴ء تا ۱۸۴۵ء) اعتدال پسند روسی سیاست داں۔

[۵۲] نواب ا۔ ف کانکرن (۱۷۷۴ء تا ۱۸۴۵ء) المانی النسل، ۲۲ سال کی عمر میں روس گیا اور وہاں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۲۳ء تک وزیر مالیات رہا۔

[۵۳] ن۔ ا۔ ملیوتن (۱۸۱۸ء تا ۱۸۷۲ء) سکندر دوم کے عہد کا مشہور مدبر۔

آخر میں پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ بہت احتیاط سے کام لیں۔ اور جب تک طبیعت بالکل صاف نہ ہو جائے کسی قسم کی مشقت نہ کریں۔ مجھے امید ہے کہ کریمیا کی آب و ہوا اور موسم گرما کا آپ کی صحت پر اچھا اثر ہوگا۔ میں آپ سے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص ترین نیاز مند
نکولائیو میکائیلوؤچ

غزل

(از حضرت احسانؔ)

نہاں ہے جسکی ہر اک موج میں پیام سروش — وہ ہم شکستہ دلوں کا ہے نغمۂ خاموش
نگاہ شوق لطافت سے ہو اگر معمور — تو رقص گاہ تجلی ہے درد کا آغوش
نظر سے بچ نہ سکا کوئی نکتۂ فطرت — جنون عشق میں اللہ رے یہ عالم ہوش
ابھی نصیب کہاں ذوق بیحسی دل کو — اک اضطراب ہے پھر بھی یہ اضطراب خموش
نکل گئے ہیں بہت دور تیرے دیوانے — غضب ہوا جو کہیں انکو آگیا پھر ہوش

بنیادی اصلاح

(ایفم زوزلیا جدید روس کا مشہور افسانہ نگار ہے ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا، بچپن ایک صنعتی شہر میں گزرا۔ لڑکپن کا زمانہ اوڈیسا میں ایک مدرسہ میں کاٹا اور اپنے وطن میں آن بسا۔ بچپن ہی سے اُس کی نظر بہت تیز اور زبان بہت شوخ تھی۔ انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا، اس لئے کئی مرتبہ قید خانہ میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس نے ۱۸ سال کی عمر میں افسانے لکھنا شروع کر دئے تھے لیکن پھر کچھ عرصہ کے لئے اس شغل کو ترک کر دیا۔ اس کی طنزیہ تحریریں روس میں تلوار کا کام کرتی ہیں، بولشوکوں نے اسے اپنا لیا ہے، لیکن یہ ان پر بھی وار کر ہی دیتا ہے۔ ذیل کا افسانہ نہ معلوم روس کے انسانوں کی ہجو ہے یا ان کے مصلحین کی!)

اشتہار

گھر بھی روز جیسے ہیں۔ گلیاں بھی۔ سر پر وہی نیلا آسمان۔ سڑک کے پتھر اُسی پرانے مٹیالے لباس میں ہیں۔ مگر کچھ آدمی ہیں، بدحواس و پریشان، جو دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں کر رہے ہیں آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں اور لیئی کی بالٹی میں جو سیڑھی کے ڈنڈے میں لٹکی ہے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

اشتہار کی عبارت نہایت سادہ ہے، بے رحم اور بے پناہ۔ ملاحظہ ہو:-

ہر شخص کے لئے

بلا استثنا

عدالت العالیہ نے ایک خاص تحقیقاتی کمیشن کا تقرر فرمایا ہے۔ جو شہر کے باشندوں کا امتحان کریگا۔ نیز محلہ محلہ تحقیق کر کے فیصلہ کریگا کہ شہریوں

میں کس کس کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے۔ جو باشندے مد زائد میں درج کئے جائیں گے اور جن کا وجود غیر ضروری قرار پائے گا انھیں برخاستی کا حکم ملے گا اور انہیں ۲۴ گھنٹے کے اندر دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ حکم برخاستی کے خلاف ۴ گھنٹے کے اندر مرافعہ دائر ہو سکتا ہے۔ مرافعہ تحریری ہونا چاہیئے۔ یہ درخواست مرافعہ عدالت العالیہ کی مرکزی کوٹھی کے سامنے پیش کر دیجائیگی۔ تین گھنٹے کے اندر فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ غیر ضروری انسان جو قوت ارادہ کے ضعف یا زندگی سے محبت کے باعث زندگی ترک کرنے پر بخوشی آمادہ نہ ہونگے اُن کے متعلق عدالت العالیہ مناسب کارروائی کرے گی اور اُن کے دوستوں، پڑوسیوں، یا خاص مسلح ٹولیوں کے ذریعہ تعمیل حکم کرائے گی۔

نوٹ:۔ ۱۔ باشندگان شہر پر واجب ہے کہ کمال اطاعت کے ساتھ عدالت عالیہ کے اراکین کے احکام کو مانیں۔ ان کے سوالات کے جواب صحیح صحیح دیں۔ ہر غیر ضروری شخص کے خصائص کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ بھی شائع کی جائے گی۔

۲۔ اس حکم پر بلا رد و رعایت عمل ہوگا۔ انسانی فضلہ جو زندگی کو عدل و مسرت کی بنیادوں پر تعمیر نہیں ہونے دیتا اُسے بے رحمی کے ساتھ صاف کرنا ہے۔ یہ اعلان بلا امتیاز سب کے لئے ہے۔ مرد عورت، غریب امیر کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ حق زندگی کی تحقیقات کے دوران میں شہر چھوڑ کر جانا سخت ممنوع ہے۔"

"ارے بھائی، تم نے پڑھا؟"

"تم نے پڑھا بھی ؟"

"کیوں جی، پڑھا، یہ پڑھا؟"

"تم نے پڑھا ؟"

"پڑھا ؟ پڑھا ؟"

شہر میں ہر جگہ آدمیوں کا جھگٹھ۔ راستے بھیڑ سے بند۔ کسی کے پاؤں جواب دے گئے، اشتہار پڑھتے پڑھتے وہیں دیوار کا سہارا لے لیا۔ کوئی زار و قطار رو رہا ہے۔ کوئی غش کھا کر گر پڑا۔ شام تک بے تعداد لوگوں کو ضعف کے دورے پڑ گئے۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ جو ہے بس یہی "تم نے پڑھا، تم نے سنا ؟"

"ارے کیسا غضب ہے۔ کسی نے ایسا اندھیر نہ سنا نہ دیکھا۔"

"کیوں، بھائی ہمیں نے تو عدالت عالیہ کو منتخب کیا تھا، ہمیں نے تو انھیں سارے اختیارات دئے تھے!"

"ہاں، یہ تو سچ ہے"

"اس مصیبت کے ہمیں ذمہ دار ہیں، ہمیں ہیں، جی ہیں"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔ قصور تو اپنا ہی ہے۔ ہمیں نے تو بہتر زندگی کی خواہش کی تھی۔ مگر یہ کسے خبر تھی کہ اس کی تدبیر ہوگی۔ عدالت نے جو سہل اور سخت طریقہ نکالا وہ کسی کے خیال میں بھی نہ تھا۔"

"نام تو دیکھو، کمبختوں کے نام، جو اس کمیٹی میں ہیں۔ اللہ اللہ کیا لوگ ہیں؟"

"کون، کون۔ تمہیں کیا خبر؟ کیا نام بھی نکل گئے؟"

"ایک جان پہچان والے سے سنا ہے۔ کمیٹی کا صدر "آک" ہے۔"

"سچ؟ خدا کا شکر ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی جانو۔"

"ہاں ہاں۔ وہی صدر ہے۔"

"یہ بڑا ہی اچھلا ہے - واللہ کیا آدمی ہے!"

"ٹھیک - پھر زیادہ فکر نہیں - وہ تو واقعی فضلہ ہی کو صاف کرے گا - وہ ناانصافی نہیں کرنے کا۔"

"بھائی کیا کہتے ہو - مجھے چھوڑ دینگے ؟ میں تو اچھا خاصہ آدمی ہوں - خبر ہے ؟ ایک دفعہ ایک جہاز ڈوبا تو بیس آدمیوں نے ایک کشتی میں اپنی جان بچائی - مگر کشتی اتنے آدمیوں کا بوجھ نہ سہار سکی اور سب کے سب ڈوبنے ہی کو تھے - پندرہ کشتی میں بیٹھ سکتے تھے - ان کی جان بچانے کے لئے پانچ کو سمندر میں کودنا ضرور تھا - میں ان پانچ میں پہلا تھا - میں سب سے آگے کودا - دیکھتے کیا ہو، یقین نہیں آتا ؟ اب بڈھا ہو گیا، کمزور ہو گیا - کیوں تم نے کیا واقعی یہ بات پہلے نہیں سنی تھی ؟ اس وقت تو سارے اخبار کے اخبار اس سے بھرے پڑے تھے - میرے چار ساتھی تو مر گئے - میں اتفاق سے بچ گیا - کیوں کیا سمجھتے ہو ؟ مجھے چھوڑ دینگے ؟ "

"اور مجھے ؟ اور مجھے ؟ میں نے اپنا سارا مال دولت غریبوں کو دے ڈالا - بہت دن ہوئے - میرے پاس ثبوت کے کاغذ موجود ہیں۔"

" بھائی کیا خبر - یہ سب اُس پر منحصر ہے کہ عدالت کے پیش نظر کیا چیز ہے ؟ "

"اجی حضرت - میں عرض کرتا ہوں کہ اپنے پڑوسی کو تھوڑا سا فائدہ پہنچا دینے سے آدمی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملجاتا - یوں تو پھر ہر بیوقوف انّا اور دائی کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے - یہ تو پُرانے دقیانوسی خیالات ہیں - زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے - آپ ہیں کہاں ؟ "

"اچھا تو پھر آدمی کی اصلی قدر و قیمت کاہے سے ہے ؟ "

"ہاں، واقعی بتائیے، کاہے سے ہے ؟ "

"میں کیا جانوں، کاہے سے ؟"

"خوب، یہ خوب رہی۔ جب نہیں جانتے تو پھر خواہ مخواہ ہر بات میں اپنی ناک کیوں گھسیڑتے ہو؟"

"معاف کیجئے گا۔ میں جو سمجھتا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"لوگو، لوگو، ذرا دیکھو تو، دیکھو تو! سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ گڑبڑ تو دیکھو! ہنگامہ!!"

"یا اللہ، یا اللہ...... اوہو، افوہ...... جان بچاؤ، جان۔"

بھاگڑ

سڑکوں اور گلیوں میں بھاگڑ پڑی تھی۔ آدمیوں کے غول کے غول ادھر سے اُدھر دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ لال لال منہ والے نوجوان، چہروں پر ہوائیاں۔ دفتروں اور دوکانوں کے بیچارے غریب منشی اور محرر۔ نئے نئے کھڑ کھڑاتے جوڑے پہنے ہوئے دولھا۔ گویّے۔ نچکیّے۔ بانکے۔ قصہ گو۔ اٹّیں کھیلنے والے۔ ہر شام کو سینما میں جانے والے۔ سفارشی ٹٹو، بدکار، بدمعاش، ٹھگیے، سفید پیشانی اور گھونگردار بالوں والے۔ لچّے، شہدے، لفندرے، نشہ باز۔ ٹھٹھے لگانے والے، ہلڑ مچانے والے، شوقین چھیلے، عشاق، سائیکلوں پر چڑھنے والے! ہٹے کٹے جھگڑالو جنھیں بیکاری کی وجہ سے سوائے ٹھٹے ٹلکلی کے کوئی کام نہیں، باتیں بنانے والے؛ نرمی لمبے لمبے بال والے مکار کپٹی پاکھنڈی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آہ سرد بھرنے والے، غمگین اداس آنکھوں والے جنکے غم کے پردہ میں بس کچھ نہیں۔ نوجوان بانگڑو گنوار، بھرے بھرے چہرے، لال لال ہونٹ والے، چکنی چپڑی باتیں کرنے والے، شیخی باز، بدگو، نیک دل بھولے ناکام لوگ، اور چالاک خراباتی۔

موٹی موٹی، ٹھوس ٹھوس کر کھانے والی سست عورتیں بھی دوڑ رہی تھیں

اور پتلی دبلی لڑاکو جھگڑالو عورتیں بھی چنچل چلبلی، کان کھاؤ مغز چاٹ، عقلمندوں کی بیویاں اور بیوقوفوں کی؛ بے وفا، باتونی، حاسد، لالچی، خوف کے مارے سب کے چہرے بگڑے ہوئے۔ مگری مدیغ آگنیں؛ نیک پارسا مگر بیکلد عورتیں، جو بیکاری ہیں اور کچھ نہیں تو اپنے بال ہی رنگا کرتی ہیں؛ بے وارث و بے یار، بے سہارے اور بے مددگار عورتیں؛ بیشرم بے لاج عورتیں، فقیرنیاں، بھک منگیاں؛ مارے ڈر کے سب خراب حال، شائستگی پاس لحاظ سب بالائے طاق۔

کمر جھکے بوڑھے بھی دوڑ رہے تھے، اور موٹے ہٹے کٹے بھی۔ ٹھنگنے بھی لمبے بھی۔ خوبصورت بھی بدصورت بھی۔ طوائف خانوں کے مالک، مال گروی رکھنے والے، لوہار؛ بڑھئی، بنئے بقال، جیل خانوں کے منتظم، سربراہ کار، سلیقہ شعار بڈھے بڈھے خدمتگار؛ اچھے کھاتے پیتے گرہست، لوگوں کو دھوکہ دے دیکر موٹے ہونے والے، معزز ٹھگ، مقدس ڈاکو۔

سب کے سب دوڑ رہے ہیں۔ ایک پر ایک چڑھا جاتا ہے۔ بدن پر، ہاتھوں میں، سر پر، کپڑے گدڑے لدے ہیں۔ منہ سے بھاپ نکل رہی ہے۔ خاموش اور افسردہ گھروں سے ان کے چیخنے چلانے، رونے پیٹنے کی صدائے بازگشت اٹھ رہی ہے۔ بتیرے ہیں کہ اپنا سارا مال اسباب لئے جارہے ہیں۔ کسی کی انگلیاں اپنے تکیہ ہی میں گڑی ہیں۔ کوئی اپنا صندوق گھسیٹ رہا ہے۔ کوئی زر و جواہر لئے جا رہا ہے۔ کوئی اپنے بچوں کو کھینچ رہا ہے۔ ایک گھر سے چلاتا پیٹتا نکلا، پھر لوٹا، سر پیٹنے لگا، اور پھر سڑک پر دوڑا۔

مگر سب کو لوٹا دیا جاتا تھا۔ سب کو۔ انھیں کے سے دوسرے انسان ان پر بے دریغ گولی چلا رہے تھے؛ ان کا راستہ روک رہے تھے، ڈنڈوں سے خوب پیٹ رہے تھے؛ گھونسے بھی چل رہے تھے، پتھر بھی، کوئی تو گتھ جاتا تھا اور دانتوں

کے استعمال کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایسا شور، ایسا ہنگامہ، الاماں۔ آخر کو شہریوں کو لوٹنا پڑا۔ پھر گھروں کی طرف بھاگے اور میدان میں اپنے زخمیوں اور مردوں کو چھوڑ آئے۔

شام ہوتے ہوتے شہر میں پھر کچھ سکون سا ہو گیا۔ روتے کانپتے لوگ گھروں کو واپس آئے اور اپنے بستروں پر پڑ پڑ کر سو گئے۔ سر سب کے ایسے گرم تھے جیسے آگ جل رہی ہو، مگر ان میں تھوڑی دیر کے لئے امید کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سیدھی سادی کارروائی

"تمہارا نام؟"

"بسو"

"عمر؟"

"تینتالیس برس"

"پیشہ؟"

"سگریٹ بناتا ہوں"

"سچ بولو، جی!"

"حضور سچ عرض کرتا ہوں۔ میں نے ایمانداری سے ۱۴ برس یہی کام کیا ہے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کی ہے۔"

"بال بچے کہاں ہیں؟"

"یہ حاضر ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میرا لڑکا ہے۔"

"ڈاکٹر، بسو کے بال بچوں کا امتحان کرو۔"

"جی، کر چکا۔"

"پھر، کیا کہتے ہو؟"

"شہری لبو کے بدن میں خون کی کمی ہے۔ عام حالت اوسط۔ اس کی بیوی کو سر کے درد اور گٹھیا کی شکایت ہے۔ لڑکا تندرست ہے۔"

"اچھا، ڈاکٹر، تم جا سکتے ہو۔ شہری لبو، تمہاری دلچسپیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا چیزیں پسند ہیں؟"

"مجھے سب آدمی پسند ہیں۔ زندگی پسند ہے۔"

"زیادہ واضح بات کرو۔ ٹھیک ٹھیک، صراحت سے!"

"مجھے پسند .... ہاں، کیا پسند ہے؟ .... مجھے اپنے لڑکے سے محبت ہے .... وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا ہے ..... مجھے کھانا پسند ہے .... یہ نہیں کہ میں کوئی پیٹو ہوں ..... مجھے عورتیں پسند ہیں ..... عورتوں اور لڑکیوں کو سڑک پر چلتے دیکھنا اچھا لگتا ہے ..... جب تھک کر شام کو گھر آتا ہوں تو آرام کرنا مجھے بھاتا ہے .... مجھے سگریٹ بنانا پسند ہے ...... مجھے زندگی پسند ہے۔"

"بس بس سنبھلو۔ روں روں مت کرو ..... کیوں نفسی صاحب، آپ کیا کہتے ہیں؟"

"فضول بکتا ہے۔ کچرا ہے کچرا۔ نہایت معمولی ہستی۔ لغو مخلوق۔ طبیعت کچھ بلغمی کچھ دموی۔ چستی کم۔ درجہ: آخری۔ ترقی کی اُمید۔ مفقود۔ مجہولیت: ۵، فی صدی۔ مسز لبو اس سے بھی پست۔ لڑکا بھی معمولی ہے مگر شاید .... کیوں جی، تمہارے لڑکے کی کیا عمر ہے۔ روں روں کیوں کرتے ہو؟"

"تیرہ برس"

"گھبراؤ مت۔ فی الحال تمہارا لڑکا زندہ رکھا جائیگا۔ رہے تم سو ..... خیر یہ میرا کام نہیں۔ آپ صاحبان فیصلہ صادر فرمائیں۔"

"عدالت عالیہ کی کمیٹی کی طرف سے جو حیات انسانی کو کچرے اور فضلے سے پاک کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے میں تم کو حکم دیتا ہوں، شہری لبو، اور تمہاری بیوی کہ تم دونوں

۲۴ گھنٹے کے اندر زندگی سے رخصت ہو لو۔ بس چپ رہو۔ چلاؤ مت۔ داروغۂ صفائی، تم عورت کو چپ کرو۔ سنتری کو بلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلا خارجی مدد کے تعمیل حکم نہیں کر سکیں گے۔"

فضول اور فالتو لوگوں کی خصوصیات

بھورا کمرہ

عدالت العالیہ کی غلام گردش میں ایک طرف کو ایک بھوری کوٹھری تھی ایک کوٹھری جیسی بہتیری کوٹھریاں ہوتی ہیں، چھوٹی جس میں دم گھٹے۔ لمبائی چوڑائی کوئی ڈھائی ڈھائی گز ہوگی، چھت بھی کچھ زیادہ اونچی نہ تھی۔ لیکن اسی چھوٹی سی کوٹھری میں کئی ہزار انسانوں کی قبر تھی۔ ایک الماری تھی جس پر موٹا موٹا لکھا تھا: "غیر ضروری آدمیوں کی فہرست"۔ اس فہرست کے کئی حصے تھے، منجملہ اُن کے ایک حصہ "بلا امتیاز اثر پذیر لوگوں" کے لئے تھا؛ ایک چھٹ بھیئے طرفداروں کے لئے؛ ایک مجہولوں کے لئے؛ ایک توازن بگڑوں کے واسطے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کی خصوصیت نہایت مختصر لکھی گئی تھی اور بالکل بے تعلقی کے ساتھ۔ بعض بعض کے متعلق بیشک ایک آدھ سخت بات درج تھی۔ لیکن ایسی عبارتوں پر بلا استثناء آگ نے سرخ پنسل سے نشان کر دئے تھے اور حاشیہ پر لکھدیا تھا کہ غیر ضروری لوگوں کو بھی خواہ مخواہ بُرا کہنا مناسب نہیں۔ غیر ضروری لوگوں کی مسلوں کے چند نمونے یہ ہیں:-

غیر ضروری نمبر ۱۴۷۴۱

صحت: اوسط۔ اپنے جان پہچان کے لوگوں سے ملنے جاتا ہے، لیکن اُس کی صحبت سے نہ کسی کو فائدہ ہوتا ہے نہ دلچسپی۔ ہر بات میں ہر ایک کو صلاح و مشورہ ضرور

دیتا ہے۔ عنفوان شباب میں ایک لڑکی کو بھگا لایا تھا، پھر اُسے چھوڑ دیا۔ شادی کے بعد سامان آرائش کی خریداری اُس کے نزدیک زندگی کا سب سے اہم مقصد ہے۔ دماغ کند اور دُھندلا ہے۔ کام کی بالکل صلاحیت نہیں۔ جب پوچھا گیا کہ زندگی میں سب سے دلچسپ تجربہ کیا ہوا تو جواب دیا کہ پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں جانا۔ نہایت معمولی درجہ کی مخلوق۔ سب سے نیچی تہ کا فرد۔ دل کمزور۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نر نمبر ۱۴۶۲۳

ایک چھوٹی سی دوکان میں نوکر ہے۔ درجہ: متوسط۔ کام سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ہر کام میں بس وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس میں سب سے کم دشواری ہو۔ جسمانی طور پر: اچھا۔ دماغی اعتبار سے اسی عام مرض کا شکار ہے: یعنی زندگی کا خوف، آزادی کا ڈر۔ جب چھٹیوں میں آزاد ہوتا ہے تو شراب سے اپنے حواس مختل کر لیتا ہے۔ انقلاب کے زمانہ میں ذرا جلت پھرت دکھائی تھی۔ ایک لال تسمہ بھی لگا لیا تھا اور جتنے آلو اور جتنا غلہ کہیں ملتا سب جمع کر رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کھانے پینے کی چیزیں کم نہ پڑ جائیں۔ اس پر فخر کرتا تھا کہ غریبوں کی اولاد ہے۔ خود انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مارے ڈر کے۔ کھٹی بالائی اسے پسند ہے۔ بچوں کو مارتا ہے۔ زندگی کی رفتار سست ہے۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نر نمبر ۱۵۲۰۱

آٹھ زبانیں جانتا ہے مگر کہتا ہے کہ سب سے جی اُکتاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہانت جتلاتا ہے۔ بہت بر خود غلط ہے۔ زبانیں جاننے پر بڑا گھمنڈ ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ گپ بہت لگاتا ہے۔ زندہ چیزوں کی طرف بس اتنا اعتناء ہے جیسے بیل کو ہو۔ فقیروں سے بہت ڈرتا ہے۔ مکھیاں اور بھنگے مارنے کا بڑا شوق ہے۔ شاذ ہی اسے دلی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری مادہ نمبر ۴۳۵۶

خواہ مخواہ نوکروں کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہے۔ چیکر دودھ پر سے بالائی اور شوربہ پر سے تار اُتار لیتی ہے۔ ہفتوں صوفہ پر پڑے پڑے گزار دیتی ہے۔ اس کی سب سے عزیز آرزو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک چاکدار زرد آستینوں کا لباس ہو۔ بارہ برس تک ایک نہایت قابل موجد اس پر عاشق رہا۔ اور اسے اپنے عاشق کے شغل تک کا علم نہ ہوا۔ یہی سمجھا کی کہ کوئی بجلی کا کام کرنے والا ہے۔ اس غریب کو چھوڑ کر اس نے ایک چمڑے کے تاجر سے شادی کر لی۔ اولاد نہیں ہے۔ اکثر بلاوجہ تلون مزاجی کا اظہار کرتی ہے۔ رات میں سوتے سوتے اُٹھ کر چار اور توس بنواتی ہے۔ بالکل غیر ضروری ہستی۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر۔

ماہرین فن کی ایک فوج آک کے ساتھ عدالت العالیہ کی کمیٹی میں کام پر لگی ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر بھی تھے، ماہران نفسیات بھی، بڑے بڑے مبصر اور مشہور مصنف بھی۔ یہ سب بہت غیر معمولی رفتار سے کام کرتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر یہ ماہر گھنٹہ بھر میں سیکڑوں آدمیوں کو دوسری دنیا کی راہ بتلا دیتے تھے اور غیر ضروری انسانوں کی شلیں تھیں کہ بھوری کوٹھری میں بھری جا رہی تھیں۔ ان کاغذات میں بیان کی روانی کا مقابلہ اگر ممکن ہے تو مصنفین کے راسخ تیقن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

صبح سے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ گھروں پر جانے والے کمیشن آتے تھے اور جاتے تھے۔ احکام عدالت کو نافذ کرنے والوں کی ٹولیاں آتی تھیں جاتی تھیں۔ اور میزوں کے پیچھے درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔

آک ان سب کو اپنی چھوٹی چھوٹی تیز اور ناقابل فہم آنکھوں سے دیکھتا تھا اور کچھ سوچا کرتا تھا۔ اسی فکر میں اس کا بدن روز بروز جھلستا جاتا تھا اور اس کے بڑے، جھلّے، اور ضدی سر میں سفیدی کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کے اور اس کے ملازموں کے درمیان ایک دیوار سی پیدا ہو گئی ۔ جو اسکی اختر شماری، اسکی فکر، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والوں کی کور چشمی اور ان کے ہاتھوں کی بے تعلقی کے درمیان حائل ہو گئی ۔

آک کے شبہات

ایک دن کمیٹی کے اراکین اپنے کمرہ میں اپنی رائیں سنانے کے لئے جمع ہوئے آک اپنی روز والی جگہ پر نہ تھا ۔ بہت ڈھونڈھا کہیں پتہ نہ لگا ۔ انہوں نے ادھر اُدھر آدمی دوڑائے، ٹیلیفون کئے مگر بے سود ۔ کوئی دو گھنٹے بعد اتفاق سے دیکھا تو یہ بھوری کوٹھری میں بیٹھے ہیں ۔ یہ کوٹھری میں غیر ضروری آدمیوں کی مسلوں پر بیٹھا تھا ۔ آنکھوں میں شدید تفکر کے آثار تھے جو خود آک تک کے لئے بھی غیر معمولی سی چیز تھی ۔

سب نے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"دیکھتے ہو نہ کہ سوچ رہا ہوں" آک نے تھکی ہوئی آواز سے جواب دیا ۔

"مگر یہاں اس کوٹھری میں کیوں ؟"

"یہی سب سے مناسب جگہ ہے ۔ میں آدمیوں کی بابت کچھ سوچ رہا ہوں اور اگر انسانوں کے متعلق کارآمد فکر ممکن ہے تو وہ انکی تباہی کے ٹھکانوں کے قرب ہی میں ممکن ہے ۔ انسان کی تباہی کے دستاویزوں کے پاس بیٹھکر اُس کی عجیب و غریب زندگی کے متعلق کچھ سیکھا جا سکتا ہے ۔"

کسی نے ایک سوکھا ٹھٹھا لگایا ۔

"ہنستے ہو ؟" آک نے ہاتھ میں ایک مسل لیکر کہا "سنو مت، میں سمجھتا ہوں کہ عدالت العالیہ کے خیال میں ایک تبدیلی پیدا ہو رہی ہے ۔ مرنے والوں کی مسلوں کو دیکھکر مجھے ترقی کے کچھ نئے راستے سوجھے ہیں ۔ تم سب نے تیزی اور سفاکی سے مختلف ہستیوں کو

غیر ضروری قرار دے دینا سیکھ لیا ہے۔ تم میں سے نا قابل چند جملوں میں یقین کے ساتھ یہ حکم لگا دیتا ہے۔ اور میں ہوں کہ یہاں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ آیا تمہارا یہ طریق درست بھی ہے؟"

آک پھر سوچتے سوچتے کچھ بہک سا گیا، ایک ٹھنڈی سانس لی، اور آہستہ سے کہا:

"کرنا کیا چاہیے؟ اصل بات کیا ہے؟ اگر زندوں کی زندگیوں کو دیکھو تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں سے تین چوتھائی کو ختم کر دینا چاہیے۔ مگر جب ان پر دھیان کرو جو مر گئے ہیں تو کچھ شبہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان سے محبت کیجاتی اور ان پر رحم کیا جاتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی مسئلہ انسانیت کی، اور تاریخ انسانیت کی اندھی گلی ہے۔"

آک پر ایک غم آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے مرے ہوؤں کی مسلوں کو پھر الٹ پلٹ کرنا شروع کیا اور ان کے تکلیف دہ اختصار پر غور کرتا رہا۔ عدالت کے اراکین چلے گئے۔ کسی نے آک کے خیال کی تردید نہ کی۔ اول تو اس لئے کہ آک کی تردید بیکار تھی، دوسرے اس لئے کہ کسی میں اس کی ہمت ہی نہ تھی۔ مگر سب نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی نئی تجویز پک رہی ہے اور سب اس سے غیر مطمئن تھے۔ موجودہ صورت کی انہیں عادت پڑ چلی تھی اور یہ تجویز تھی بھی نہایت واضح اور قطعی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نئی صورت اختیار کیجانے والی ہے۔ مگر کیا؟ یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس عجیب وغریب آدمی کا دماغ کیا نئی چیز نکالے گا، یہ جس کو اس شہر پر ایسا حیرت خیز تسلط حاصل تھا۔

آک غائب ہو گیا۔ یہ اس کی عادت تھی، جب کوئی خاص فکر ہوتی تو غائب ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے ہر جگہ ڈھونڈا پر نہ پایا۔ کسی نے خبر دی کہ آک شہر کے باہر بیٹھا رو رہا ہے۔ کسی اور نے خبر دی کہ آک اپنے باغ میں چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا تھا اور مٹی منہ میں لیکر چباتا تھا۔

عدالت العالیہ کا کام دھیما پڑ گیا۔ آک کے غایب ہونے سے کام میں وہ انہماک کہاں

رہ سکتا تھا۔ شہریوں نے اپنے دروازوں میں لوہے کی سلاخیں چڑھالی تھیں اور عدالت کے آدمیوں کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تھے۔ بعض محلوں میں تو عدالت کے سوال پر کہ تمہیں زندہ رہنے کا حق ہے یا نہیں لوگ ٹھٹھے لگاتے تھے۔ اور ایک جگہ تو یہ تک ہوا کہ لوگوں نے عدالت کے اراکین کو پکڑ کر اُن کے حق زندگی کی تحقیقات کر ڈالی اور ان کی مسلیں تیار کر دیں جو کسی طرح سپوری کوٹھری والی مسلوں سے کم نہ تھیں۔

شہر میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ "غیر ضروری" شہری جن پر ابھی عدالت کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی تھی ایسے مطمئن اور دلیر بنگئے تھے کہ خوب مزے سے سڑکوں پر اکڑتے پھرتے تھے ہر طرح کی دل لگی کرتے اور غضب یہ کہ شادیاں تک کر رہے تھے۔ لوگ راستوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ "شکر ہے، شکر ختم ہوئی مصیبت ختم ہوئی۔" "حق زندگی کا امتحان خدا خدا کر کے ختم ہوا۔" "کیوں، میاں، سچ کہو، کیا واقعی زندگی زیادہ مزہ کی نہیں ہو گئی۔ انسانی کچرا پہلے سے کم ہے۔ اب آدمی ذرا اطمینان سے سانس تو لے سکتا ہے!"

"ارے، ارے، تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا سچ تم سمجھتے ہو کہ جن بیچاروں کو ختم کیا گیا ہے انہیں زندگی کا حق نہ تھا۔ اجی کیا کہتے ہو، میں کتنے ہی ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جنہیں ایک منٹ زندہ رہنے کا حق نہیں اور وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اور ذرا سوچو تو کتنے اچھے بھلے آدمی ختم کر دئے گئے۔ اف وہ۔ کاش تمہیں خبر ہوتی۔"

"یہ کیا بات ہے، غلطیاں تو لازمی ہیں۔ یہ تو کہو، کچھ اُک کی بھی خبر ہے۔"

"کچھ پتہ نہیں۔"

"سنا ہے کہ شہر کے باہر ایک درخت پر بیٹھا رو رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا ہے اور مٹی چبا رہا ہے۔"

"رونے دو جی" "ہاں، ہاں، مٹی چبانے دو۔"

"شہریو۔ تمہاری یہ خوشی قبل از وقت ہے۔ سچ کہتا ہوں قبل از وقت ہے۔ آگ آج شام کو آنے والا ہے اور عدالت کا کام پھر شروع ہو جائے گا۔"

"تمہیں کیا خبر؟"

"مجھے معلوم ہے۔ ابھی بہت سا کچرا باقی ہے۔ پوری پوری صفائی لازمی ہے۔ پوری پوری۔"

"بڑے بے رحم ہو، بھائی۔"

"دیکھو لوگو، دیکھو........ نئے اشتہارات لگ رہے ہیں۔"

"دیکھو تو...... کیسی خوش خبری، کیسی خوش قسمتی ہے۔"

"پڑھو، پڑھو"

"ذرا پڑھو تو"

"پڑھنا ذرا پڑھنا"

نئے اشتہار

آدمی چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ سانس پھولے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں لیئی کی بالٹیاں تھیں، اور گلابی رنگ کے اشتہارات کے کٹے۔ اس کٹے سے اشتہار نکالکر خوشی خوشی مکانوں پر چسپاں کئے جا رہے تھے۔ ان کا مضمون بھی نہایت واضح، سادہ اور قطعی تھا:

سب کے لئے

بلا استثنا

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سب شہریوں کو حق زندگی ملجائیگا۔ زندہ رہو، بڑھو، اور زمین میں پھیلو۔ عدالت العالیہ اپنا سخت فرض انجام دے چکی۔ آئندہ سے اس کا نام عدالت ترحمات عالیہ ہوگا۔ تم سب اچھے لوگ ہو اور تمہارا حق زندگی مسلّم۔ عدالت ترحمات عالیہ

تین تین اراکین کے خاص کمیشن مقرر کریگی جو روزانہ شہریوں کے گھروں پر جا کر انہیں مبارکباد دینگے اور اس پر ان کے خیالات جمع کرکے "خوشی کی مسلوں" میں شامل کریں گے۔

اس کمیشن کے اراکین کو شہریوں سے اُن کے طریق زندگی کی بابتہ مفصل سوالات کا اختیار ہوگا۔ اور شہری اگر چاہیں تو تفصیل سے جواب دے سکتے ہیں بلکہ یہی بہتر ہوگا۔ شہریوں کے مسرت خیز جواب مرتب کرکے ایک گلابی دفتر میں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دئے جائینگے"۔

سارا شہر باغ باغ تھا۔ سارے دروازے، دریچے، کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گھروں سے گانے بجانے، ہنسنے کھلکھلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ موٹی موٹی ٹھس لڑکیاں بیٹھی پیانو بجاتی تھیں۔ صبح سے شام تک گراموفون چلتے ہی رہتے تھے۔ بانسریاں، ستار، سارنگیاں سب بج رہی تھیں۔ شام کو لوگ کوٹ اُتار کر پیر پھیلا کر اپنے چھجوں پر بیٹھتے تھے۔ سڑکوں میں چہل پہل دیکھنے کی تھی۔ مٹھائی کی دوکانوں اور قہوہ خانوں میں مرد عورتوں کی بھیڑ تھی۔ کوئی مٹھائیاں اُڑا رہا تھا، کوئی ٹھنڈا شربت پی رہا تھا۔ بساطیوں کے یہاں جہاں آئینہ بکتے تھے ایک ہجوم تھا۔ مرد عورت سب کے سب آئینہ خرید کر اپنا اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ مصوروں کے یہاں تصویروں کے بے تعداد آرڈر آرہے تھے۔ ہر شخص اپنی تصویر پر چوکھٹہ چڑھوا کر دیوار پر لگا رہا تھا۔ ایک جگہ تو قتل ہی ہوگیا۔ جس کا اخباروں میں بڑا چرچا رہا۔ بات یوں تھی کہ ایک نوجوان نے کسی مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور مالک مکان سے مطالبہ کیا کہ دیوار پر اُس کے ماں باپ کی تصویریں لٹکی ہیں وہ اُتار دے۔ مالک اور اُس کی بیوی اس پر بہت ناراض ہوئے۔ آخر کو بات بڑھی اور ان دونوں نے ملکر نوجوان کو مار ڈالا اور پانچویں منزل سے اُس کی لاش سڑک پر پھینکدی۔

احساس نفس اور خود پرستی کے جذبے بڑی ترقی پر تھے۔ جھگڑے ٹنٹے روز کا قصہ بن گئے تھے۔ ایسی باتیں ہر وقت سننے میں آتی تھیں: "ٹھیک ٹھیک۔ ظاہر ہے کوئی غلطی ہوگئی

کہ تم زندہ ہو۔ عدالت عالیہ نے اپنا کام بے پروائی سے کیا" "جی ہاں، بہت بے پروائی سے کیا، جبھی تو آپ جیسے جیتے پھر رہے ہیں۔" مگر روزانہ زندگی میں ان جھگڑوں کا کوئی زیادہ خیال نہ کرتا تھا۔ آدمیوں نے بہتر کھانا شروع کر دیا تھا۔ طرح طرح کے مربے بنتے تھے۔ گرم کپڑے کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ صحت کی بڑی قدر کرنے لگے تھے۔ عدالت ترحمات عالیہ کے اراکین روزانہ گھروں پر جاتے اور لوگوں سے دریافت حال کرتے تھے۔ اکثر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم بڑے مزہ میں ہیں۔ اور بہت سے اس کا ثبوت دینے پر بھی اصرار کرتے تھے۔ ..... بعض کچھ شکایت بھی کرتے تھے کہ عدالت العالیہ نے اپنا کام قبل از وقت ختم کر دیا۔ "کل شام میں ٹرام میں آ رہا تھا۔ اور غضب ہے خدا کا ایک جگہ بھی تو خالی نہ تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو برابر راستہ بھر کھڑا رہنا پڑا۔ ابھی بہت سے غیر ضروری آدمی زندہ ہیں۔ قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ شیطان اُن کی خبر لے۔ کیسا افسوس ہے کہ جب موقع تھا تو انہیں ختم نہیں کیا گیا۔" بعض کو اور شکایتیں تھیں۔ مثلاً "ذرا دیکھو تو، کسی نے مجھے زندگی کی مبارکباد نہ دی، نہ پیدہ کو، نہ جمعرات کو میں انتظار ہی کرتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں۔ کیوں جی۔ کیا اب میں خود ان کے پاس جاؤں کہ مجھے مبارکباد دو؟"

خاتمہ

آگ کے دفتر میں حسب معمول کام جاری تھا۔ لوگ بیٹھے تھے اور لکھ رہے تھے۔ گلابی دفتر خوشی کی مسلوں سے بھر گیا تھا۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ لوگوں کی سالگرہ، شادیوں، سفر، دعوتوں، اور عشق و محبت کی رودادیں درج تھیں۔ بعض مسلیں تو ناول و افسانہ معلوم ہوتی تھیں۔ باشندوں نے درخواست دی کہ عدالت ترحمات عالیہ ان مسلوں کو کتابوں کی صورت میں شائع کر دے۔ جب شائع ہوئیں تو لوگوں نے خوب پڑھیں۔ ادھر آگ پر خاموشی طاری تھی۔ بس روز بروز کمر جھک رہی تھی، سر سفید ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ گلابی دفتر میں جاتا اور

گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا جس طرح پہلے بھوری کوٹھری میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن ایک چیخ مار کر گلابی دفتر سے نکلا "ان کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کو قتل کرنا۔ ان کو مار ڈالنا چاہئے۔" مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے نوکر اپنی سفید سفید اُنگلیوں سے اب اُسی تیزی کے ساتھ زندوں کا حال کاغذ پر لکھ رہے ہیں جیسے پہلے مُردوں کا لکھتے تھے تو اُس نے عجیب طرح سے اپنا ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر بھاگ کر غائب ہو گیا۔ اور ہمیشہ کے لئے ہی غائب ہو گیا۔

آک کے غائب ہونے کی بابتہ سیکڑوں افسانے بنگئے اور طرح طرح کی افواہیں مشہور ہوئیں مگر آک کا پتہ پھر نہ چلا۔

اور وہ کثیر التعداد انسان جنہیں آک پہلے ختم کرنا چاہتا تھا، جن پر بعد کو اسے رحم آگیا تھا اور تھوڑے دن بعد اس نے جنہیں قتل کرنے کی پھر ٹھانی تھی، وہ انسان جنہیں بہت سے اچھے لوگ بھی تھے اور بہت کچھ غیر ضروری کچرا بھی وہ انسان آجتک زندہ چلے جاتے ہیں۔ جیسے کبھی آک تھا ہی نہیں، جیسے کبھی ان کے حق زندگی کا سوال ہی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔

غزل

(از حضرت جگر)

اک مے بے نام جو اس دل کے پیمانے میں ہے — وہ ترے شیشہ میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

پوچھا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے — سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

ایک ایسا راز ہی دل کے نہاں خانے میں ہے — لطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے — وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

ایک کیفِ ناتمامِ درد کی لذت ہی کیا — درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے

غرق کر دے تجھکو زاہد تیری دنیا کو خراب — کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست — آج پینے کا مزا پیکر بہک جانے میں ہے

تجھکو اے جذبِ طلب حسنِ ازل ہی کی قسم — دیر کتنی دل پہ اک تصویر اترانے میں ہے

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر — لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حسنِ بے پایاں کیا تھ — زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر حق پرست
حشر ہے کعبہ میں برپا شور بتخانے میں ہے

غزل فارسی

(از حضرت اصغر)

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا

بے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا

زموجِ خونِ دل صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا

ز "لا" تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

بلے از جلوۂ حسنت جہاں یکسر تہی ماند
بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا

جہانے را تپش بخشم، جہانے را بوجد آرم
دریں خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

من مسلم چہ مسلم؟ آنکہ او را یار میگوید
پس از عمرے ہمی زنار دارے کردہ ام پیدا

جہانِ مضطرب را پر سکوں دانی نمیدانی
چہ ساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا

گمراہے بیرو طرزِ جنونِ من نمیدانی
پس محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا

من از زنگِ وجودِ خویش اصغر نقشہا بینم
برائے جانِ بیخود مست یارے کردہ ام پیدا

شذرات

۱۹۲۹ء بھی ختم ہوگیا۔ سال کے ختم پر عموماً ادارے اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں، ان مفید کاموں کو گنواتے ہیں جو انکے ہاتھوں گذشتہ بارہ مہینے میں انجام پائے، دبی زبان سے اپنی خامیوں کا ذکر بھی کردیتے ہیں شاید اس لئے کہ اس سے ان کی خدمات ذرا اور چمک جاتی ہیں، اور پھر آئندہ سال کے متعلق وعدے کرتے اور اپنے ارادوں کا اعلان کرتے ہیں۔ جامعہ والے اپنی خدمات کیا گنوائیں؟ اگر ان سے کوئی خدمت بن پڑی تو اللہ کا احسان ہے۔ سچی خدمات کا سچا اجر اسی کے یہاں سے ملتا ہے۔ اگر ہم میں خامیاں ہیں (اور اس دنیا میں ان خامیوں کا خود جامعہ والوں سے زیادہ کسے احساس ہوگا) تو ہم انہیں سب کے سامنے بیان کرکے اپنے دل کے بوجھ کو کیوں ہلکا کریں، خدا کرے اگلے سال ہماری زندگیاں پچھلے سال سے بہتر، ہماری خدمت زیادہ پر خلوص، ہماری فکر زیادہ حق پسند، ہماری نظر زیادہ پاک بیں ہو۔ آئندہ کے لئے وعدے ہم کیا کریں اور کیسے کریں؟ اپنی خامیوں کے بھروسہ پر؟ اپنی قوم کی بے اعتنائی کے زعم پر؟ تنگ نظر خیر خواہوں اور تنگ دل مخالفوں کے اعتماد پر؟ نہیں۔ نہ ہم اپنی خدمات کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں، نہ اپنی غلط اندیشیوں اور خامکاریوں کا اعلان کرکے اپنی ذمہ داری کو کم کرنا چاہتے ہیں، نہ ہم بڑے بڑے وعدے کرکے اپنے ہمدردوں کے لئے اس وقت خوشی لیکن بعد کو مایوسی کا سامان مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہماری خدمات کی قدر کرنا چاہے یا بے قدری وہ خود انہیں معلوم کرے۔ جس کا دل ہماری خامیوں پر دکھتا ہو اور وہ انکی اصلاح میں ہماری مدد کرنا چاہے اسے ہماری کھلی ہوئی برائیاں تو معلوم ہی ہوسکتی ہیں، وہ جو اسے معلوم نہیں وہ بھی اس پر دیانتداری سے ظاہر کردی جائیں گی؟ اور جس کا جی ہماری برائیوں اور ان کی تشہیر سے خوش ہوتا ہو اسے

اسے اپنی خوشی کے وسائل اپنی ہی محنت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ ہم سال کے ختم پر جب اپنا اور اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہماری گردن اس کے دربار میں جھک جاتی ہے جسکی منشاء کی تلاش اور جس کی رضا کی طلب ہمارے وجود کی غایت ہو اسی کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار صراط مستقیم کے ملنے کا وسیلہ ہو اور اسی کے منشاء کی تکمیل اصلی خدمت۔ آئندہ کے وعدے اور ارادے بھی اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے سامنے ہماری روحیں ایک جامع سوال کے جواب میں نہ جانے کب کی "بلا" کہہ چکی ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ جامعہ کو اس کا کام بنائیں۔ وہی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حسبنا اللہ، ونعم الوکیل

اس سال ہندوستان کی سیاسی زندگی کا سب سے اہم واقعہ کانگریس کا وہ رزولیوشن ہے جس میں ملک کی سیاسی جد و جہد کے مقصود، سوراج کی وضاحت کر دی گئی ہو اور اسکے معنی کامل خود مختاری مقرر کئے گئے ہیں۔ ملک کے اخباروں اور ہماری سیاسی انجمنوں اور فرقوں کے مباحثوں میں اس کی وجہ سے مکمل آزادی اور "ڈومینین" جیسی حیثیت کے فرق اور ان کے اعتباری محاسن و معائب کا سوال بہت اہم بن گیا ہے۔ حالانکہ اس کی کچھ زیادہ ضرورت نظر نہیں آتی۔ دنیا کی ہر قوم کا حق ہے کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی روایات اور اپنے مخصوص حالات کے اعتبار سے ترقی دے۔ متمدن دنیا ہر قوم کے اس حق کو نظری حیثیت سے تسلیم بھی کر چکی ہے۔ سب مانتے ہیں کہ تمدن انسانی کا گلدستہ اپنے کمال حسن کو اسی وقت پہنچ سکتا ہو جب اسکا ہر پھول اپنی تاریخ اور روایات کی سرزمین سے کسب فیض کرکے پوری شادابی حاصل کرے اور اپنے اندر اپنے مخصوص رنگ و بو کے اعتبار سے کمال پیدا کرے۔

ہندوستان میں آزادی کی جو تحریک آج تقریبًا پچاس سال سے جاری ہو گیا اس کے

سامنے ابتک یہ ابتدائی حقیقت نہ تھی؟ پھر وہ کیوں ابتک "ڈومینین" جیسے مرتبہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرتا تھا؟ ہوسکتا ہو کہ کمزوری کے باعث، ممکن ہو اپنی بزدلی کیوجہ سے۔ یا ضرورت زمانہ اور مصلحت وقت کا لحاظ کرکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اس ظاہری اعتدال مطالبات میں شامل تھیں لیکن ہندوستانی آزادی کے مجاہدوں میں سب کے سب تو کمزور و بزدل، صرف مصلحت اندیش اور ابن الوقت نہ تھے۔ نہ آج بظاہر ان میں کسی مخصوص عزم و شجاعت کا ظہور ہوگیا ہو۔ بات یہ ہو کہ ہر محکوم قوم جب وہ اپنی محکومیت کے معنیٰ کو جان جاتی ہو تو آزادی ہی کی طالب ہوتی ہے اور آزادی "کامل" ہی ہوتی ہے۔ اسکے ٹکڑے کرنا مشکل ہو اور اس کی قسطیں متعین کرنا ممکن نہیں۔ اسلئے ہندوستان نے بھی جس دن سے اپنی محکومیت کی ذلت کو محسوس کیا اس وقت سے آزادی کا مطالبہ شروع کیا اور ہمیشہ اسکا مطلب کامل آزادی تھا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ و روایات کی حقیقی روح یہ ہو کہ دنیاوی زندگی میں اختلافات کو رفع کرکے ہم آہنگی پیدا کرے۔ کُل کی بھلائی کے آگے جزو کا نیاں نہ کرے۔ ہندوستان کی سیاست میں اسکی اس تمدنی روح اور مسلمانوں کے اس عقیدہ نے کہ قوم، نسل، ملک کا امتیاز حیات انسانی کے ارتقاء صحیح کا دشمن ہے ہمیشہ اس کے مفکرین کو تنگ نظری اور یورپ جیسی انسانیت دشمن قوم پرستی سے بچایا ہے۔ اس لئے اس کے ان مجاہدین راہ حریت نے بھی جو کلمہ حق زبان سے نکالکر قید و بند کی صعوبتوں کے برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھے کبھی آزادی کے یہ معنیٰ نہیں سمجھے کہ ساری دنیا سے الگ، سب ملکوں سے بے تعلق ہندوستان اپنی سیاسی زندگی کا ڈھیر کھڑا کرے۔ انھوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہی کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کے دن ختم ہوگئے اور معیشت و صنعت کے انقلابات عظیم نے اتحاد اقوام کو حیات عالم کے لئے لازمی بنا دیا ہو۔ اور وہ اس حقیقت کو کس طرح بھولتے؟ ان میں خود وہ لوگ شامل تھے جو اتحاد دول اسلامی کے لئے کوشاں تھے۔ وہ شامل تھے جو اتحاد ایشیا کے خواب کی تعبیر اپنی جد و جہد سے کرنا چاہتے تھے اور ہال

وہ بھی تھے جو آزاد قوموں کے اس اتحاد کو جس نے صرف مصر اور ہندوستان کے ساتھ انصاف نہ کر کے اپنے نیک نام کو بٹہ لگایا ہے۔ یعنی سلطنت برطانوی کو سیاست عالم میں ایک مفید جمعیۃ اقوام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان اور مصر کے ساتھ بھی یہ جمعیۃ وہی رویہ اختیار کرے جو اس نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے تو یہ جمعیۃ دنیا کے لئے سیاسی رحمت ثابت ہو سکتی ہے۔ اسلئے کہ حقیقی طور پر آزاد قوموں اور ملکوں کا ایسا اتحاد جو اشتراک مقاصد کی وجہ سے اس درجہ مستحکم ہو دنیا کی تاریخ نے آجتک نہیں دیکھا لیکن اسکے افادہ اور اس کے استحکام کی شرط اصلی یہی ہے کہ اسکا ہر رکن پورا پورا آزاد ہو کہ جب چاہے اس جمعیۃ کو چھوڑ دے اور جبتک رہے اشتراک مقاصد کی وجہ سے ساری ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہو۔ سلطنت برطانوی میں مصر اور ہندوستان کے علاوہ اور کونسا حصہ ہے جسے برطانیہ آج بہ جبر اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے؟ کنیڈا آج چاہے تو بلا اسکے خون کا ایک قطرہ گرے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا جزو بنجائے۔ اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا دونوں کی طرف سے اس قسم کے اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کیا کوئی برطانوی مدبر خواب میں بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ اس اتحاد کو بہ جبر روکا جائے۔ نہیں۔ برطانیہ کنیڈا کو صرف باہمی اشتراک مقاصد اور اس کے مفاد ملی کا یقین دلا کر ساتھ رکھ سکتی ہے۔

غرض ہندوستان کی آزادی خواہ جماعت نے اگر اتنک ڈومنین جیسے مرتبہ کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصد قرار دیا تھا تو کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے قومی روایات اور تاریخ عالم کے رجحان کو پیش نظر رکھ کر ایسا کیا تھا۔ اسلئے کیا تعجب ہے کہ جب لارڈ ارون کے مشہور اعلان سے یہ توقع قائم ہوئی کہ انگلستان اس کے لئے آمادہ ہے کہ ہندوستان کو بھی اس جمعیۃ اقوام میں جس کا نام سلطنت برطانوی ہے برابر کے شریک کی حیثیت سے شامل کرے تو وہ اس کی طرف بھوکوں کی طرح دوڑ پڑے۔ مگر جب بعد کو معلوم

ہوا کہ ہندوستان کے لئے ڈومینین والا مرتبہ کچھ اور ہی ہے ، اور وزیر ہند نے بتلا دیا کہ ہندوستان کو تو بڑی حد تک یہ مرتبہ حاصل ہی ہو چکا ہے تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے ۔ اس لئے کہ جو ہمیں حاصل ہے اسکا حال تو ہم سے بہتر اور کون جانتا ہے ۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس نے لفظ سوراج کے معنی کامل آزادی ، متعین کر دئے ۔

کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کسی حالت میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی منفی پابندی کا تحمل اس کی کامل آزادی کا تصور نہیں کر سکتا ۔ کامل طور پر آزاد ہندوستان ممکن ہے کہ آج بھی سلطنت برطانیہ کا رکن بننے پر آمادہ ہو جائے بشرطیکہ وہ ویسا ہی رکن ہو جیسے کینیڈا ہے جیسے جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا ہیں ۔ اگر انگلستان اسکے لئے تیار ہے تو ہندوستان کی طرف سے غالبًا کبھی صلح کا دروازہ بند نہ ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں تو ڈومینین مرتبہ کا ذکر دھوکا ہے اور جانکر سیاست میں کون دھوکا کھاتا ہے ۔

ہم جانتے ہیں کہ ہم نے کامل آزادی کے متعلق جو لکھا ہے کانگریس کے ذمہ دار لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری سیاست ملکی میں ایک ایسے گروہ کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے ۔ جو تحریک سیاسی کو ایک خاص قسم کے جماعتی انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے ۔ اس جماعتی انقلاب کے مقاصد اگرچہ ابھی متعین نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بتلاتا ہے کہ اس آندھی کے جھونکے روس کی طرف سے آرہے ہیں ، ہمارے نزدیک مفکرین سیاسی کا فرض ہے کہ روس کے معاملات کا غور سے مطالعہ کریں ۔ اسلئے کہ ہمارے خیال میں انقلاب روس تاریخ انسان کی سب سے عبرتناک ٹریجڈی ہے ۔ اسکے بعض مفید نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن اسکی بنیادی غلطی سے انکار بھی اسی قدر مشکل ہے ۔ زندگی کی گوناگونی کو کسی ایک کٹے چھنٹے منطقی اصول کے تحت لے آنیکی سعی ناکام ، ملکیت شخصی کو مٹانے کے لئے اٹھنا اور نہایت وسیع پیمانے پر ملکیت اراضی کے حق قائم کرا دینا ، آزادی کے لئے انقلاب کرنا اور کروڑوں انسانوں کی آزادی ضمیر تک چھین لینا ۔ فرقوں کے امتیاز کو مٹانیکا دعوےٰ کرنا اور آج دس سال گذر جانے تک ان نوجوانوں کو مدرسوں تک

میں نہ داخل ہونے دنیا جن کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ کسی سابقہ سرمایہ داری کی اولاد ہیں، یہ اور اس جیسی بیشمار اور دردناک چیزیں ہیں کسی ایسی کوشش کی نقل کے خلاف متنبہ کرنیکے لئے کافی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے سیاسی رہنما ان حقیقتوں کی طرف سے غفلت برتیں اور جب بھونچال آئے تو لسکے ساتھ وہ بھی اڑ جائیں۔

ہمیں انگلستان اور دنیا سے اپنا معاملہ طے کرنیکے لئے پہلے اس اندرونی مسئلہ کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔ دنیا میں ابتک سیاست میں عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ سیاست خارجہ کے مسائل نے سیاست داخلی کی روش کو متعین کیا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں وزارت خارجہ سے ہدایت نامہ نکلا کہ اس وقت بس فلاں قصہ بند ہوجانا چاہئے ورنہ خارجی سیاست پر اثر پڑیگا اور وہ قصہ بند ہوجاتا تھا۔ آج ساری دنیا میں یہ صورت بدل گئی ہے۔ اسوقت داخلی ملکی سیاست نے خارجی سیاست کو پس پشت ڈالدیا ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ داخلی سیاست کی گتھیاں سلجھانا مدبر کا پہلا فرض بنگیا ہے۔ میکڈانلڈ کو اپنی داخلی دشواریاں ہیں۔ تاردو کواپنی، اسٹریلیا نے دستور اساسی کی ترمیم میں مصروف ہے تو اسٹالین بھی روسی کسانوں کی مخالفت سے کم گھبرایا ہوا نہیں۔ اسپین کی سیاست کا اہم ترین مسئلہ اگر اس وقت جنرل ریویرا کے اختیارات کا تعین ہے تو امریکہ بھی خارجی معاملات سے زیادہ اپنے مالی اور معاشی مسائل کے حل میں مصروف ہے ہندوستان کی خارجی سیاست کی کامیابی بھی اس کے اندرونی مسائل سیاسی و معاشی کے حل پر منحصر ہے۔ اب وہ وقت بظاہر گذرا ہوا معلوم ہوتا ہے جب ایک قومی فتح کی امید پر غریب اپنے حقوق کے مطالبہ کو ملتوی کردیں، یا اقلیتیں تحفظ حقوق کے خیال کو دماغ سے نکالدیں۔ ہندوستان کو آزاد کرانے والوں کے لئے یہ صورت حال گویا انکی دشواریوں میں بہت تکلیف دہ اضافہ ہے۔ لیکن ہر بڑا کام مشکل ہوتا ہے۔ کیا ہندوستانیوں کے تدبر سے یہ توقع کرنا کہ سیاست ملکی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ داخلی مسائل کے تصفیہ کیطرف پہلے توجہ کرینگے اور انکو معقولیت کے ساتھ طے کرلیں گے کوئی ناممکن توقع ہے؟ ہم تو ایسا نہیں سمجھتے۔ لیکن اس سوال کا صحیح جواب بڑی حد تک ہماری اگلے سال کی سیاسی زندگی سے ملیگا۔